

آنگن کا چاند

رضیہ علی

شام سمے اک اُونچی سیڑھیوں والے گھر کے آئینے میں
 چاند کو اترے دیکھا ہم نے چاند بھی کیسا؟ پورا چاند
 دُر کی ٹیس تو اٹھتی تھی پر اتنی بھی، مہجّر پور کبھی
 آج سے پہلے کب اُترا تھا دل میں اتنا گہرا چاند
 ہم نے تو دونوں کو دیکھا، دونوں ہی بے درد نکھوڑ
 دھرتی والا، انبر والا، پہلا چاند اور دُوجا چاند
 چاند کسی کا ہو نہیں سکتا۔ چاند کسی کا ہوتا ہے؟
 چاند کی خاطر ضد نہیں کرتے، اے مرے اچھے اُنتا چاند

ابيض الشّاع

آج پھر میرے گھر کے آگن میں چاند اتر آیا ہے۔

پیلہ، گول، بڑا سا چاند۔

چمپا کی پھیلی ہوئی عریاں شاخوں کے عقب سے جھانکتا ہوا چاند۔

ابر باراں سارا دن برسنے کے بعد سیرِ شام ہی چھٹے ہیں۔

ہوا میں خنکی ہے اور رات کے بھیگے ہوئے سائے لمحہ بہ لمحہ سنالوٹ کے گھرے

سوز میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔

لمحے اپنا زخم چھپاتے چپ چاپ دھند لکوں میں سرک رہے ہیں۔

خاموشی ہے کہ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

سبک رفتار جھونکوں کی کمرہا ہوں سے فضا بار بار لرز اٹھتی ہے۔

خنکی سے بوجھل ہوائیں درتپے کے پرووں سے ٹکرا کر واپس پلٹتی ہیں تو دم بخود

پتے چونک پڑتے ہیں۔

دریچے کے باہر چنبیلی کی شاخیں پھیل کر آگے تک جھک آتی ہیں اور ادھ کھلی
سفید کلیاں چاند کی ٹھنڈی روشنی میں جھلملا رہی ہیں۔

ستاروں کی سوئی رنگدہر پر بڑی گھیسری خاموشی ہے۔
نوشیں کے کمرے میں بڑی دیر سے ٹرانسپیرنٹ سبز رہا ہے اور ہوا کی لہروں
پر ڈولتی ہوئی مدھم سی آواز فضا کو اور بھی سوگوار بنا رہی ہے۔

کچھ دکھتے خواب سجائے ہوئے کچھ جھٹی یادیں بھانپتے ہوئے
میں ریزہ ریزہ بکھر گئے ہوں کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں
میں اپنے سفید اجلے بستر پر ٹیکوں کے سہارے بیٹھی چپ چاپ درتپچے سے
باہر شفاف آسمان پر جھکتے ہوئے چاند کو تنکے جارہی ہوں۔ نگاہیں پلٹتی ہیں۔ تو
کمرے کے در دیوار سے ٹکراتی ہیں اور میری سوچیں جھٹک جھٹک کر رہ جاتی ہیں۔
ہر شام یونہی بسر ہوتی ہے۔

ہرات کا ایک پہر اسی طرح بیت جاتا ہے۔
اور کبھی کبھی تو رات کا پچھلا پہر بھی اسی طرح گزر جاتا ہے۔
چاند آہستہ آہستہ بلند ہو کر جہاں کے اونچے درخت کی شاخوں میں ٹانک
جاتا ہے۔

اور سات ستاروں کی جوڑی بادام کے گھنے خوبصورت درخت کی
ادٹ میں چھپ جاتی ہے۔

میرے کانوں میں اس کے قدموں کی آواز کی بازگشت بار بار گونج
رہی ہے۔

آج شام ہی جب — بادل چھٹ جانے کے بعد سورج کی مدھم
پڑتی ہوئی پیلی پیلی کرنوں نے آنگن کی دیواروں کے آخری سروں کو چپکے
سے چوما تھا۔

وہ میری توقع کے برعکس اچانک چلا آیا تھا
وہ کس قدر نادم تھا۔
اور کتنا نثر مسار۔

وہ بہت زیادہ دیر نہیں رکھا تھا۔
لیکن اتنی سی دیر میں ہی اس نے جلنے لگتی بار معذرت کر ڈالی۔
اور میں اپنے زخموں سے چور چور دل کے داغ چھپاتے حیرت زدہ سی
بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
اور سوچ رہی تھی۔

آخر وہ اپنے آپ کو ناکردہ گناہوں کا سزاوار کیوں سمجھ رہا ہے؟
وہ جب جانے کے لئے اٹھا تو چاند نکل آیا تھا اور ہوا میں خشکی بڑھ
گئی تھی۔

وہ چلا گیا —
اور میں بادلوں کے سائبان تلے بیٹھی رہ گئی۔
یادوں کا سائبان۔

سیر شاخ اٹکا ہوا چاند۔
اور آنگن —

مجھے نہیں معلوم

میں نہیں جانتی کہ —

بچپن ہی سے میرے لئے لفظ آنگن اور چاند اس قدر کشش انگیز کیوں رہے ہیں؟

مجھے آنگن سے اس قدر پیار کیوں رہا ہے؟

میری نگاہیں جب بھی وقت کے دھندلے پہرتوں کے اُس پار دیکھتی ہیں تو میرے سامنے یکے بعد دیگرے بہت سارے آنگن گھوم جاتے ہیں۔ شوقِ خال کے گھر کا بڑا سا آنگن —

جس کے بچوں: بیچ جاسن کا اونچا اور گھنا سا درخت تھا۔

گر میوں کے موسم میں ادوی ادوی جامین پٹ، پٹ کی مدھم آوازوں کے ساتھ گرا کر تکی تھیں اور درخت کی شاخوں پر میٹھے ہوئے کوٹوں اور چرٹیوں کا شور صبح منہ اندھیرے سے لے کر رات کی تاریکی پھیلنے تک سنائی دیتا تھا۔

دوسرا آنگن — اغن میاں کے گھر کا آنگن تھا۔ جو نہ بہت چھوٹا تھا۔ اور نہ بڑا — بس! درمیانے سائز کا آنگن تھا۔ اغن میاں کے آنگن میں کوئی

گھنا اور بڑا سا درخت نہیں تھا، دیوار کے ساتھ ساتھ کیا ریاں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں گلاب، موتیا، بیلہ، سورج لکھی اور گیندے کے نرم و نازک پھول آہستہ خرامی سے جھومتے رہتے تھے۔

اغن میاں کے آنگن کا سا راحن اس کے فرش میں پنہاں تھا — پھولدار

ٹائیلوں والا صاف و شفاف چکنا فرش — جس کو دیکھتے ہی بے اختیار ننگے پاؤں چلنے کو دل چاہتا تھا۔

اس کے بعد وہ میں آنگن — اپنے گھر کے آنگن جہاں میرے بچپن، لڑپکن اور اس کے بعد کے بہت سارے لمحات ایک کے بعد ایک کمرے کے پیچھے دھندلکوں میں سرک گئے، کبھی بھی لوٹ کر نہ آنے کے لئے ان میں آنگنوں میں سے پہلا آنگن تو اس چھوٹے سے کوا بڑ کا آنگن تھا۔ جو بھاتی میاں کے نام الاٹ تو نہیں ہوا تھا، جانے کس طرح بھاتی میاں کے دوست اغن میاں نے کچلے بازی کر کے اس میں سب کو بٹھرایا ہوا تھا۔

دوسرا آنگن — اس کوا بڑ کا تھا جو قدرے بڑا تھا اور بھاتی میاں کے نام الاٹ ہوا تھا، پھلے کوا بڑ کے آنگن میں نہ کوئی درخت تھا نہ پودا بس! وہ ایک آنگن تھا جس میں ایک طرف باورچی خانہ تھا اور دوسری طرف غسل خانہ اور بیت الخلاء۔ آٹھ سالہ کی دیواروں میں کیلیں ٹھونک کر رسی باندھ دی گئی تھی۔ جس پر کپڑے سوکھتے رہتے تھے اور ان کے سائے دیوار اور فرش پر آڑے نرچھے زاویے بناتے تھے۔

دوسرے کوا بڑ کے آنگن میں نیم کا گھنا درخت تھا، جس کی پھاؤں بہت ٹھنڈی تھی۔

اور — تیسرا آنگن اس مکان کا آنگن تھا جو بھاتی میاں نے بنوایا تھا۔ جس کا فرش ایک عرصے تک کچا ہی رہا اور اس کی گرد مٹی کو چھڑکاؤ کر کے دوبایا جاتا رہا۔

مجھے ہنگن پسند ضرور ہے۔ لیکن جانے کیا بات ہے کہ اس پسند کے ساتھ ایک دکھ، ایک افسردگی اور ایک سوگوار سی کے احساس کو میں کبھی اپنے ذہن سے جدا نہ کر سکی۔

جب میں چھوٹی تھی جب بھی نہیں۔

اور جب بڑی ہو گئی تب بھی نہیں

جب سے میں نے اپنے ذہن کو سوچوں کے نگہ سے آباد کرنا شروع کیا اسی وقت سے جانے کیسے۔ جانے کیوں۔ اور جانے کس طرح دل کی خاموش بستی میں یہ خیال ایک دیا بن کر ٹٹٹانے لگا کہ میری زندگی کی کہانی آنگن سے شروع ہو کر آنگن ہی پر ختم ہوگی۔

آنگن میں ہزاروں کی چھاؤں تھے، چار پانی پر اڑے ترچھے انداز میں لیٹے

لیٹے گلگنا ناچے پسند ہے۔

کھلے آسمان کے نیچے۔

تاروں کے چپ چاپ چلتے ہوئے قافلے کے تعاقب میں رنگا ہیں دوڑتے

ہوتے۔

دھیمی دھیمی ہواؤں کے دوش پر اڑتے ہوئے بادلوں کے پیچھے سے جھانکتے اور چھپتے ہوئے چاند کو ٹنکتے ہوئے

اپنے من پسند گانے کے بول گلگنا تے ہوئے

جو کیفیت، جو سرور حاصل ہوتا ہے۔

نشاہت اس کا احساس دوسرے شخص کو کبھی نہیں ہو سکتا۔

اور نہ ہی اس دکھ اور اس افسردگی کا احساس کسی کو ہو سکتا ہے۔

جو اس تنہائی

اس خاموشی

اور اس مدھم سی تاریکی کے لمحات میں دل کو ابھانے عمول سے آشنا

کرنا ہے۔

الفاظ۔

یوں کہنے کو ان کی بڑی حقیقت ہے۔

بڑی وقعت ہے

ان کا بڑا اثر ہے۔

اور بہت اہمیت۔

لیکن۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ

دل کے جذبول کا اظہار کرنے کے لئے الفاظ کے سہارے بالکل بے بنیاد

ہوتے ہیں۔

ہم جو کہنا چاہتے ہیں کہ نہیں کہتے۔

تب احساس ہوتا ہے کہ۔

الفاظ اپنی اپنی وقعت کھو چکے ہیں۔

اپنا تاثر کم کر چکے ہیں۔

اور میں بھی اس سرور، اس کیفیت اور اس دکھ کا اظہار لفظوں میں نہیں کر سکتی۔

وقت گزر چکا ہے — لمحات کھو چکے ہیں۔
لیکن احساسات — وہ آج بھی زندہ ہیں اور یادیں — وہ آج بھی

کسی چمکیلی اور روشن صبح کی طرح رخ سے نقاب اٹھا کر جھلکاتی ہیں۔
اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے یادوں کو اپنے ذہن سے کھرچ پھینکنے
کی کوشش کبھی نہیں کی۔

گزرے لمحوں اور بیتی گزریوں کو یاد کرنے میں دکھ اور خوشی کا کتنا حسین
امتزاج نظر آتا ہے اس بات سے کتنے لوگ واقف ہیں، یہ میں نہیں جانتی۔
میں تو صرف اپنی بات کرتی ہوں۔

یادوں کے سندانِ حزیروں میں بٹکنے ہوئے غم وہ نغمی، چھوٹی سی لڑکی
ہر لمحے سائے کی طرح اپنے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

زندگی میں کتنے نشیب و فراز آتے مگر —
مگر وہ ایک سایہ کبھی بھی توجہ دلا نہ ہو سکا۔

اس کا ماضی

اس کا حال

اور اس کا مستقبل — سب کچھ تو میری نگاہوں کے سامنے ہے۔

اس کے ساتھ میرا ربط اور میرا تعلق کبھی نہیں ٹوٹا۔

وہ چپ چاپ اور گرم سم سی مرتنے والی لڑکی —

اس کی زندگی کی ہر ڈھلنے والی شام اس کی سوجوں کو طویل کرتی گئی۔

کتنی عجیب لڑکی تھی وہ

وہ بچہ کی اولاد تھی، اگر سب سے بڑی ہوتی تو شاید تنہا کی ساری محبت
اور دو مہیاں کی ساری شفقت اس کے حصے میں آتی۔

اگر سب سے چھوٹی ہوتی تو اماں کی بے پناہ چاہت اور بھائی میاں کے
پیار کا بیشتر حصہ اس کے نتختے سے دامن میں اُن گزرتا۔

کبھی کبھی دل ہی دل میں وہ اللہ میاں سے معصوم شکوہ کرتی — اللہ
میاں! تو نے مجھے اس گھر میں سب سے پہلے یا سب سے بعد میں کیوں نہیں
پیدا کیا؟

پھر مجھے بھی سب بڑی آپا کی طرح بے پناہ چاہتے۔

یا پھر فوزی کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیتے۔

بڑی آپا اور فوزی کے متعلق سوچتے ہوئے جانے کیوں؟ اسے یہ خیال

کبھی نہیں آیا کہ چھوٹی آپا، سعدیہ باجی، فرخ بھائی اور عزم بھی تو ہیں جو نہ سب

سے بڑے ہیں اور نہ سب سے چھوٹے۔ انہیں تو یہ احساس کبھی نہیں ہوتا کہ ان

کے حصے میں بڑوں کی کتنی شفقت اور محبت آتی ہے۔ انہیں یہ احساس ہو بھی

کیسے سکتا تھا۔ وہ سبھی اماں اور بھائی میاں کے بہت دلارے اور پیارے تھے۔

حقیقت خواہ کچھ بھی تھی، لیکن عفت کو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ گھر میں وہ سب

سے کم قابل توجہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ دوسروں کی نگاہوں سے چھپ کر آئینے میں

اپنی صورت دیکھتی اور سوچتی —

مجھ میں کیا کمی ہے؟

اور پھر دل ہی دل میں کہتی —

دل کو ایک انجانے دکھ سے آستانہ دیتے ہیں۔

یوں غموس ہوتا ہے جیسے —

سارے جہاں کا درد سمٹ کر دل میں اتر آیا ہو۔

جیسے روح درد کے انبار تلے دب کر سسک اٹھتی ہو۔

وہ کبھی کبھی سوچتی تھی کہ شاید اپنی پیدائش کے وقت کی ساری اداسیاں

اس کے دل کے نہان خانوں میں بس گئی ہیں، جیسی ہر بات کا تاریک پہلو دیکھنے

کی اسے عادت پڑ گئی ہے۔

کبھی کبھی اماں ایک بات کا ذکر اور کیا کرتی تھیں اور وہ یہ کہ جن دنوں

عفت اس دنیا میں آنے کے لئے پر تول رہی تھی۔ انہی دنوں سسرال والوں

کے ساتھ اماں کے تعلقات کافی ناخوشگوار ہو گئے تھے اور بھائی میاں بھی ان

کی باتوں میں اکڑ اماں سے بہت کھینچے کھینچے رہتے تھے۔ اماں کے دل و دماغ پر

ان ساری باتوں کا اثر ہونا لازمی تھا۔ وہ اپنے مستقبل کی طرف سے سخت فکر مند

تھیں۔ وہ چکے چکے رویا کرتی تھیں اور بڑی گہری سوچوں میں ڈوبی رہتی تھیں۔

اس وقت کے سارے احساسات و جذبات یقیناً عفت کے خون میں رچ بس

گئے تھے۔ ورنہ شاید وہ اتنی حساس نہ ہوتی اور نہ اس کی سوچوں کے انداز اتنے

مالیوس ہوتے۔

عفت کی پیدائش کے چند ماہ بعد اماں کے تعلقات سسرال والوں

کے ساتھ پھر پہلے ہی کی طرح خوشگوار ہو گئے اور بھائی میاں کا رویہ تو اس کی

پیدائش کے چند روز بعد ہی بدل گیا تھا۔ مگر اماں قیامت کے ان لمحات کو کیسے

نہیں۔ مجھ میں کوئی کمی بھی تو نہیں ہے، جیسے دوسرے بھائی بہن ہیں ویسی

ہی میں ہوں پھر —؟ اور اس ”پھر“ کے آگے اس کی سوچیں طویل ہوتی

چلی جاتیں۔

اس کی ان اداس اداس سی سوچوں کی حقیقت صرف اتنی سی تھی کہ وہ دوسرے

بچوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی حساس تھی۔

اس کی پیدائش ہوئی بھی تو تھی وقت کے ایسے لمحات ہیں — جب

ماحول کی اداسیاں دبے پاؤں دل کی گہریوں میں اتر آتی ہیں۔

اماں کو اس پیدائش کا دن، تاریخ اور وقت بہت اچھی طرح یاد تھا۔

وہ نومبر کی آخری شام تھی۔

جو لمحہ بہ لمحہ ڈھل رہی تھی۔

سردیوں کی دھند میں ڈوبی ہوئی اداس شام۔

برطیسے ہونے پر عفت کو احساس ہوا کہ اداس سردیوں کی شاموں میں اداسی

اور سوگوار سی کی کیفیت کتنی شدید ہوتی ہے۔

کمر کی چادر میں لپٹے ہوئے لمحات

خاموشی کے زیریں کبھی ہوتی گھڑیاں

درختوں کی پھیلی ہوئی عرباں اور نیم عریاں شاخیں

شاخوں سے جدا ہو کر زمین پر گھرے ہوئے زرد سوکھے پتے پتوں کے درمیان

سرمرائی ہوتی بیگلی ہوا۔

اور دور افق پر چھائے ہوئے ستارے —

معمول باتیں جو پچیسے ڈیڑھ سال کے عرصے میں ان پر سے گزر چکی تھیں۔

اماں اور بھائی میاں بے شک اور دسے محبت کرنے والے ماں باپ تھے۔ لیکن ہر بچے پر انفرادی توجہ دینا نہ ان کے بس میں تھا اور نہ ماں پریشانیوں انہیں اس کی اجازت دیتی تھیں۔ دو یا تین بچے ہونے تو یقیناً کوئی دلازا ہونا کوئی پیارا ہونا اور کوئی آنکھ کا تارا ہونا۔ مگر میاں تو ادھی درجن سے بھی ایک عدد زیادہ ہی تھا۔ پھر وہ کس کو آنکھوں میں جگہ دیتے اور کسے سر پر۔ یہی غنیمت تھا کہ عزت کے ساتھ گزر بسر ہو رہی تھی۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑتا تھا۔

گھر کا سارا بوجھ تنہا آبا کے شانوں پر تھا وہ دو جگہ ملازمت کرتے تھے۔ اور اپنی ذات پر کبھی ایک پیسہ بھی خوشی سے خرچ نہیں کرتے تھے۔ اگر اماں ان کے کپڑوں اتھوں کا خیال نہ کرتی تو شاید انہیں پونڈ لگے کپڑے پہننے میں بھی کوئی عار نہ ہوتا۔ ان کا کوئی شوق نہیں تھا۔ سگریٹ وہ نہیں پیتے تھے، پان سے انہیں رغبت نہیں تھی اور خوراک اتنی تھوڑی تھی کہ لوگ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ بڑے ہونے پر عفت کو بار بار یہ خیال آیا کہ کہیں بھائی میاں آدھا پیٹ کھانا تو نہیں کھاتے۔

اور خود اماں کی قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ دو یا تین جوڑے کپڑے بنا لیتی تھیں۔ انہی کو دھو دھو کر پہنتی تھیں۔ نیا جوڑا اس وقت تک نہیں بناتی تھیں جب تک پرانے جوڑوں میں سے ایک پھٹ نہیں جاتا تھا۔ شادی میاں اور دوسری تقریبات کے لئے اماں کے پاس دو یا تین دھراؤ جوڑے ہوتے تھے۔ انہی کو بدل بدل کر پہن لیا کرتی تھیں۔ یہی حال کھانے پینے کا تھا۔

بھائی میاں اٹھتے بیٹھتے سب بچوں کو سادگی اور قناعت پسندی کی تلقین کیا کرتے تھے۔ مگر ان کے ذہن اس نصیحت کو قبول کرنے کے لئے بہت چھوٹے تھے۔ وہ تو اپنے چچاؤں اور بھوپھیوں اور دوسرے رشتے داروں کے اور پڑوس کے بچوں کے نن پر اچھے کپڑے اور ہاتھوں میں خوبصورت کھلونے دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ خوبصورت کپڑوں اور کھلونوں کو دیکھ کر ان کا دل بے طرح چل اٹھتا تھا۔

بڑی چچی، مچھوٹی چچی اور چند دوسرے رشتہ دار انہیں حقارت اور ناگوار سی سے دیکھتے تھے اور اماں کی بدسلوکی اور کجوسی کا چہرہ چا سارے زمانے میں کرتے تھے۔ حالانکہ انہیں یہ بات ابھی طرح معلوم ہوتی کہ بھائی میاں کی لگی بندھی تنخواہ میں اتنے تھے ہرگز نہیں اڑائے جاسکتے تھے۔ بھائی میاں کے یہاں بالائی کی آمدنی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا جب کہ دوسروں کے یہاں آمدنی کا ایک ذریعہ یہ بھی تھا۔

بڑی آپا کو سب لوگ بہت چاہتے تھے اس چاہت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ پہلو بھٹی کی اولاد تھیں۔ اور دوسری وجہ ان کی ذہانت تھی ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ غلتی بھی بہت تھیں۔ ذہین تو فرخ بھائی بھی بہت تھے۔ لیکن وہ محنت ڈرا بھی نہیں کرتے تھے اور بے انتہا لاپرواہ تھے۔

محنت سے بہت چھوٹی سی تھی تو اسے اپنے بارے میں اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ آیا وہ ذہین ہے یا کند ذہن۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ بھائی میاں اگر کبھی ہونے لگتے اس پر توجہ دیتے ہیں تو ان کا پڑھایا ہوا ایک لفظ بھی اس

کے دماغ میں نہیں گھستا تھا اور گھس بھی کیسے سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں تو جلنے کیسی کیسی گتھیاں تھیں جو کسی طرح سلجھائے نہیں سلجھتی تھیں۔ اس کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے بھاتی میاں نے قطعی رائے قائم کر لی تھی کہ وہ زندگ بھر بیٹھ نہیں سکے گی۔ اماں نے قرآن شریف پڑھانے کے لئے اسے ایک بزرگ خاتون کے پاس بھیجا شروع کیا۔ تو ان کے پاس سے اس کی کوڑھ مغری اور نالائقی کی شکایتیں آنے لگیں۔

ڈانٹ ڈپٹ، جھاڑ پھٹکا کر کسی بات کا اس کے اوپر اثر نہ ہوا۔ اماں سے بے چاری اپنا سر تن کام کر رہ گئیں اور سوچ سوچ کر پریشان ہو گئیں۔
”یامیرے اللہ! یہ لڑکی بھر جاہل رہے گی؟“
”زیادہ ذہنی! محفوظ اسبابی پڑھ لے۔“

بھاتی میاں اسے بڑی آپا اور بڑے چچا کی بیٹی کی مثال دیتے اور کہتے۔
”انہیں دیکھو، کتنی شوقین ہیں پڑھنے کی اور کس قدر ذہین۔“

”انہی سے کچھ سبق لو۔“
”تم جیسا کوڑھ مغز اور کند ذہن تو ہمارے خاندان کا کوئی بچہ نہیں۔“
بڑے بھو بھاجب بھی آتے اپنی بیٹی کی ذہانت کی قصیدہ خوانی کرتے۔
”میری بیٹی تو حساب کا بڑے سے بڑا اور مشکل سے مشکل سوال زبانی حل کر لیتی ہے۔“

بھاتی میاں اسے شرم دلاتے۔
اماں یہ سب باتیں سن کر افسردہ ہو جاتیں۔

اور وہ اپنا سپاٹ چہرہ لئے ایسی تمام باتیں چپ چاپ سن لیتی۔
اماں اسے اکیلے میں سمجھایا کرتیں، وہ چپکنا کھڑا بنی رہتی۔

پھر اماں نے اسے پڑھانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس کے لئے نیا سید پارہ اور نیا قاعدہ خرید لیا۔ لیکن اس ذمہ داری سے عمدہ برآ ہونے کے لئے اماں کو بڑے پاڑے بیلے پڑے۔ ایک دفعہ کسی غلطی پر ٹوکے پر وہ ایسا منہ سی کر بیٹھتی کہ اماں کے اکلے سر مارنے کے باوجود وہ زبان ہلا کر نہ دیتی۔

شروع شروع میں اماں نے اس کی اس تکلیف دہ عادت کو بڑے تحمل سے برداشت کیا۔ پیار کر کے، دلا کر کر کے، چکار کر کے، پچکار کر کے اسے پڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن آخر کب تک؟ ایک دن اماں کا صبر بھی جواب دے گیا پھر اماں نے اس پر سختی شروع کر دی۔ اس کی ہتھیلیوں پر نپکھے کی ڈنڈی کو آڑا بجانے لگا، اس سے بھی کام نہ چلا تو دو چار دفعہ اس کا کھانا پانی بھی بند کر دیا گیا۔ بھاتی میاں خاموش مٹاٹاٹی بنے دیکھ رہے تھے اور اماں اپنی ہر کوشش پر پانی پھرتے ہوئے دیکھ کر سخت جھنجھلائی ہوئی تھیں۔

ایک دن بھاتی میاں کے بغیر نہ رہ سکے۔

”میں تمہیں لکھ کے دے دیتا ہوں یہ لڑکی زندگی بھر بیٹھ نہیں سکے گی۔“
اماں سم کر رہ گئیں۔

بھاتی میاں نے مزید لقمہ دیا۔

”تم اپنی سی ہر کوشش کر ڈالو لیکن اس کے پاس وہ ذہن ہی نہیں جو کچھ یاد رکھ سکے۔“

لیکن اماں نے ہمت نہیں ہاری۔ ان کی مسلسل کوششوں سے اس نے بڑی جلدی قرآن شریف ختم کر لیا۔

اماں نے کسی فاسخ کی طرح بھائی میاں کی طرف دیکھا۔ لیکن ان کے نزدیک یہ بات قطعی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

اماں نے کہا۔

”کچھ سنا آپ نے؟ عقو نے قرآن شریف ختم کر لیا۔“

بھائی میاں نے نہ کسی حیرت کا اظہار کیا نہ مسرت کا۔

”ہوں! اچھا، کہہ کر وہ بڑی آپا کے اسکول کی مالانہ رپورٹ دیکھ کر انہیں سراہنے لگے۔

پھر دن پر دن گزرنے لگے۔ اماں عفت پر اور بھی زیادہ توجہ دینے لگیں۔ گھر کا کام کاج کرتے ہوئے اور فرصت کے اوقات میں بھی اماں اسے کچھ نہ کچھ پڑھاتی رہتیں۔ لیکن ظاہر ہے اماں بے چاری نہ انگریزی جانتی تھیں اور نہ ہی انہیں حساب کے بڑے بڑے سوال حل کرنے آتے تھے۔ ان کی اپنی تیلو قرآن اردو، جمع تفریق کے چھوٹے چھوٹے سوال حل کرنے اور انگریزی کی ابتدائی کتاب تک غور و تہی۔ یہی تعلیم وہ عفت کو بھی دے سکتی تھیں۔ جو انہوں نے اسے دی تھی۔ اس کے آگے وہ بھائی میاں کی ہی محتاج تھیں۔ لیکن عفت اب بھائی میاں کے نزدیک ذرا بھی قابل توجہ نہیں رہی تھی۔

بھائی میاں اٹھتے بیٹھتے بڑی آپا کی ذہانت کی قصیدہ خوانی کرتے جو اب اماں عفت کے سگڑاپے کو سراہتے لگتیں۔

”عفت کو باورچی خانے کے کام کا بڑا سلیفہ ہے، اسے گھر کی صفائی ستھرائی کا کس قدر خیال رہتا ہے، وہ اگر میرا ہاتھ نہ بٹائے تو میں تو کام کر کر کے ادھ موٹی ہو جاؤں۔“

عفت کو اچھی طرح احساس تھا کہ یہاں پر اماں کافی حد تک بڑی آپا کے ساتھ زیادتی کر جاتی تھیں۔ بڑی آپا باورچی خانے کے کاموں میں اماں کا بہت ہاتھ بٹاتی تھیں۔ سارے مشکل مشکل کام وہی بے چاری کر تی تھیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ ڈھنگ سے کر تی تھیں یا بے ڈھنگ بن سے۔ بہر حال! اپنی طرف سے تو انہوں نے کبھی اماں کا ہاتھ بٹانے میں کوتاہی نہیں کی۔

عفت کو جوں جوں اس بات کا احساس ہوتا گیا کہ وہ اماں کے نزدیک دن بدن قابل توجہ ہوتی جا رہی ہے، اس کے دل میں خوشی کی کرنیں آپ ہی آپ جگمگانے لگیں۔

اردو کی وہ تمام کتابیں جو گھر میں ختم کرائی جاسکتی تھیں۔ ختم کرنے کے بعد اماں کو فکر ہوئی کہ عفت کو اسکول میں داخل کروادیا جائے۔ لیکن اس کے لئے وہ بھائی میاں کی محتاج تھیں۔ اور اب کا عالم یہ تھا کہ بے شمار دفعہ کہنے کے باوجود ان کے کان پر جوں تک نہیں رہتی تھی۔ اماں نے موقع بے موقع کتنا شروع کر دیا۔

”اب اسے اسکول میں داخل کروا دیجئے، بلاوجہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔“

بھائی میاں بار بار سنتے اور ٹال جاتے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ اب اس ذکر سے کچھ چڑنے لگے تھے۔ اماں کی اس موقع بے موقع راگنی سے عاجز آکر آخر ایک دن بھائی میاں بولے بغیر نہ رہ سکے۔

”بھئی! اس بوڑھی بیل کو تو اسکول میں داخل کروا تے ہو تے بھی مجھے شرم آتے گی۔“

اماں نے برا مان کر کہا۔

”اس میں شرم کی کیا بات ہے، اور ایسی کون سی عمر گزر گئی ہے۔“

اس کی؟

”تو پھر تم خود ہی اسے ساتھ لے جا کر اسکول میں داخل کروادو۔“

اماں خاموش ہو کر رہ گئیں۔

لیکن اس کے بعد حساب کے سوال حل کرنے کے لئے وہ بھائی میاں کے پاس بیٹھنے لگی۔

کچھ ماہ اور گزرے تو اماں نے پھر وہی رٹ لگائی۔

”اب اسے اسکول میں داخل کروادیتے۔“

بھائی میاں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑاتے رہے۔ آخر کب تک ہینگ آکر بولے بھی تو وہی پرانا جملہ دہرایا۔

”تم خود ہی لے جاؤ۔“

اماں کو بھی اب اس حقیقت کا علم ہو چکا تھا کہ بھائی میاں کو اب عفت کی پڑھائی لکھائی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجبوراً وہ ایک روز عفت کو ساتھ لیکر قریبی اسکول جا پہنچیں۔ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے اسے دوسری جماعت میں داخل کرنے سے خیال سے ٹیسٹ میں اسی کلاس کی نسبت سے سوال حل کرنے کے لئے دیتے گئے۔

جب تک ٹیسٹ ہوتا رہا۔ اماں اس سے خاصے خاصے پر بیٹھی پہلو بدلتی رہیں۔ اور جب ٹیسٹ کا نتیجہ سامنے آیا تو اماں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور خدا کا سکھ ادا کیا۔ ان کی عفت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ ٹیسٹ میں عفت کی کامیابی اماں کو خود اپنی کامیابی معلوم ہوتی۔ مگر جا کر انہوں نے بھائی میاں کو یہ مزید سنایا۔ انہوں نے کسی مسرت یا خوشی کا اظہار نہیں کیا۔

اور پھر — وقت گزرتا گیا۔ وہ زینہ بہ زینہ اوپر چڑھتی چلی گئی۔ لیکن اپنی ہر کامیابی کے بعد وہ تنہائیوں میں بیٹھی افسردگی سے سوچتی۔

بھائی میاں میری کامیابی پر ذرا بھی خوشی کا اظہار نہیں کرتے۔

وہ میری ذرا سی بھی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔

کیا ان کے دل کے کسی کونے میں میرے لئے ذرا سی بھی محبت نہیں۔

بڑی آپا، فرخ بھائی اور رشتے کی دوسری بہنوں اور بھائیوں کی نشان میں

بھائی میاں اٹھتے بیٹھتے قصیدے پڑھتے ہیں۔ میں نے کیا قصور کیا ہے؟

اس کا دل غم سے چور چور ہو جاتا ہے۔

اس کی سوچیں اسے بالوکیوں کے گہرے غاروں میں دھکیل دیتیں۔

اسکول میں وہ ہر پٹیچر کی منظور نظر بنتی۔ اس کی ذہانت کو سراہا جاتا، اس کی

متانت کی مثالیں دی جاتیں، کلاس کی دوسری لڑکیوں کو اس جیسا بننے

کی تلقین کی جاتی۔

مگر بھائی میاں —!

وہ سوچتی۔

وہ تنہا کرتی —

کہ بھائی میاں کبھی تو ایک جملہ محض ایک جملہ اس کی تعریف میں کہہ دیں۔
ان کا ایک تعریفی جملہ اس کی زندگی کا کتنا قیمتی سرمایہ بن سکتا تھا۔
کاش! بھائی میاں سمجھ سکتے۔

وہ دوسروں کی نظروں سے چھپ کر چپکے چپکے رو لیتی۔
اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اس تمام تر عدم توجہ کے باوجود اسے
بھائی میاں سے اچھا دنیا میں کوئی بھی نہیں لگتا تھا۔

اپنی اس محبت کا اظہار اس نے کبھی بھی اور کسی پر بھی نہیں کیا تھا۔
بھائی میاں کی محبت سے محرومی نے اسے بڑا حساس اور کم سم سا بنا دیا تھا۔
پھر ایسا ہوا کہ ایک دفعہ سالانہ امتحان کا زلٹ آیا تو وہ سیکنڈ یا تھرڈ آئے
کے بجائے کلاس میں فرسٹ آئی۔ اس کے بعد سے بھائی میاں کا انداز تبدیل ہو جاتا
تھا۔ بھائی میاں کی زبان سے اپنے لئے پہلی مرتبہ تعریفی جملے سن کر اس پر
خوشی کی ناقابل بیان کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے، جنہیں
بھائی میاں کی نظروں سے چھپانے کے لئے اس نے بڑی تیزی اور بڑھے
بے دردی سے پونچھ ڈالا۔ بھائی میاں رپورٹ کارڈ پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ دیکھ ہی
نہ سکے۔

محبت کے اس بیش بہا خزانے کو آپ نے اب تک سینٹ کر کیوں رکھ
چھوڑا تھا بھائی میاں؟
اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اس کا جی چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

لیکن دیکھو اس کے اس کواریڑ میں اور اتنے سارے افراد کی موجودگی میں وہ
ایسا کونہ کہاں تلاش کرتی جہاں پھپھ کر وہ رو لیتی۔ اسے باورچی خانے
سے زیادہ مناسب جگہ اور کوئی نظر نہ آئی۔ جہاں اماں نسلہ بھرا ٹاسمانے رکھے،
پھونکیں مار مار کر گیلی لکڑیوں کو سلگانے کی کوشش کر رہی تھیں اس کوشش
میں ان کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں اور آنکھوں میں پانی بھرا آ رہا تھا۔
اس نے اماں کے ہاتھ سے پھنکنی لے لی اور پھونکیں مار مار کر چولے کی آچ ٹھیک
کرنے لگی۔ دھوپیں کی آڑ لے وہ بیٹھی اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہی۔

اماں بار بار اس کے ہاتھ سے پھنکنی لینے کی کوشش کرتیں اور اس سے
باورچی خانے سے چلا جانے کو کہتیں۔

لیکن اس وقت وہ کیسی ڈھیٹ بن گئی تھی۔
اماں نے کہا۔

”سنی کیوں نہیں عفت؟“

”کیا اماں؟“

”اے ہے، کیا دیوانی ہو گئی ہے؟“

”دیوانی نہیں اماں! آج میں بہت خوش ہوں۔“

اماں سمجھیں کہ کلاس میں اول آنے پر خوش ہے۔ خود بھی خوش ہو
کر بولیں۔

”ہاں، ہاں، خوش کیوں نہ ہوگی، جماعت میں اول جو آتی ہے۔“

عفت نے سوچا —

اماں بے چاری کو کیا معلوم کہ یہ خوشی اول آنے کی خوشی نہیں ہے اور پھر اول آنکس قدر بے معنی ہو کر رہ جاتا اگر بھائی میاں نہ سراہتے۔ بھائی میاں کے چند تعریفی جملے اس کے لئے قیمتی سراہ تھے۔ اماں بے چاری اس بات سے قطعی بے خبر و ڈیاں تھوپے جا رہی تھیں۔

پھر بھائی میاں کی حوصلہ افزائیوں اور تعریفی جملوں میں کمی نہیں آئی، ان میں بندریج اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اوسے سچ تو یہ تھا کہ ان حوصلہ افزائیوں اور تعریفی جملوں کی بدولت کامیابی کی منزلیں طے کرنا عفت کے لئے کس قدر آسان ہو گیا تھا۔ اب بھائی میاں کسی کو مثال بنا کر اس کے سامنے پیش نہیں کرتے تھے۔ اب کسی بچیا اور کسی بھوپچا کی بیٹی اس سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی کی اتنی جرأت رہ گئی تھی کہ کم سے کم تعلیم کے معاملے میں وہ اپنی بیٹیوں کی قصیدہ خوانی بھائی میاں یا اماں کے سامنے کرہ سکتے۔ لڑکیاں تو ایک طرف رہیں، خاندان کا کوئی لڑکا بھی پڑھنے کے معاملے میں اس سے برتر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔

اسکول میں بھی وہ کلاس پنچر سے لے کر میڈسٹریس تک سب کی توجہ، محبت اور شفقت کا مرکز تھی۔ نہ صرف کلاس کی بلکہ اسکول کی بھی پیشتر لڑکیاں اس سے

متاثر و مرعوب تھیں۔ اسٹاف روم میں اس کی کم سنجی اور ذہانت کے تذکرے ہوتے، دوسری لڑکیوں کو تنبیہ کرتے وقت اس کی مثال دی جاتی اور اس جلیسی بننے کی نصیحت کی جاتی۔

اتنی عزت اور اتنی محبت پاکر عفت خدا کے سامنے سر بسجود ہو جاتی۔ اماں کی طرف اس کی نگاہیں جب بھی اٹھتیں اس کا دل بے اختیار اماں کے قدموں میں جھک جانے کو چاہتا۔ یہ سب کچھ اماں کی بدولت ہی تو تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن اس کی سوچوں میں گم رہنے کی عادت اب بھی نہیں بدلی تھی۔ بھائی میاں نے اس کی سوچوں کا دھارا ایک دوسری ہی سمت موڑ دیا اس کام میں صرف بھائی میاں تنہا نہیں تھے۔ اس کی ٹیچرز بھی برابر کی شریک تھیں۔

کلاس میں بیت بازی کا مقابلہ ہوا، اختتام پر عفت کے سناتے ہوئے اشعار بہترین اشعار قرار دیئے گئے۔ اردو کی مس نے ہوم ورک میں مضمون لکھنے کو دیا۔ عفت کا لکھا ہوا مضمون بہترین قرار دیا گیا۔ اس کا مضمون تینوں سیکشنوں میں پڑھ کر سنایا گیا۔ ہر موقع پر ٹیچرز اس کے ادیبہ بننے کی پیش گوئیاں کر دیا کرتی تھیں اور عفت سر جھکاتے چپ چاپ سوچا کرتی۔

کیا ایسا ہو سکے گا؟

کیا میں سچ بچ اس قابل ہوں کہ سب مجھے اس طرح سراہیں۔
کہیں دور۔۔۔ بہت دور سے اس کے کانوں میں بھائی میاں کی

آواز آتی۔۔۔

”میں لکھ کے دیتے دیتا ہوں، یہ لڑکی زندگی بھر پڑھ نہیں سکے گی۔“
مگر اب۔۔۔ خود بھائی میاں اس کے روشن مستقبل کے بارے میں جتنے پر امید تھے۔ اتنا تو کوئی گھر کا کوئی فرد بھی نہیں تھا۔ بھائی میاں کو اس کی منزل جیسے آسمانوں میں نظر آتی تھی۔

اٹھتے بیٹھتے اب اس بات پر زور دیتے تھے کہ اسے کچھ لکھنا چاہیے، کوئی چھوٹی سی کہانی۔۔۔ کوئی مختصر مضمون۔ مگر عفت کبھی کوئی ایسی کہانی یا مضمون نہ لکھ سکی جو بچوں کے پرچے میں چھپ سکتا۔ وہ لکھتی ضرور تھی مگر کیا لکھتی تھی؟ یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ اسکول سے نکل کر کالج کی دنیا میں قدم رکھا۔ بڑی خاموشی سے دو سال گزر گئے۔ لکچرار کی توجہ کا مرکز وہ یہاں بھی تھی۔ لیکن پھر بھی کالج کی زندگی اسے کوئی خاص پسند نہیں آئی۔ اسی دوران گھر والوں سے چوری چھپے اس نے اپنا ایک افسانہ مقامی ماہنامے میں اشاعت کے لئے بھیج دیا، ایڈیٹر کا خط اس کے نام آیا تو اس نے کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ لفظ چاک کیا۔ اور پھر جیسے اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس کا افسانہ قابل اشاعت تھا اور اس کی تحریر کو بے حد سراہا گیا تھا۔

اس روز اس نے بھائی میاں کی آفس سے واپسی کا انتظار کچھ زیادہ ہی بیچینی سے کیا۔ شام کو بھائی میاں آفس سے آئے تو اس نے ایڈیٹر کا خط ان کے سامنے رکھ دیا۔ بھائی میاں کچھ بھی تو نہ سمجھ سکے، انہوں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی ان کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ رہی تھی۔ آخر کار بھائی میاں نے پوچھا۔

بھائی میاں نے حوصلہ افزائی کی۔
عفت سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔
بھائی میاں نے کہا۔

”اس خط میں تو تہناری تحریر کی خاصی تعریف کی گئی ہے۔“
عفت پھر بھی چپ رہی۔

”اب افسانہ چھپ کر آئے تو پڑھیں گے، دیکھیں گے ہماری بیٹی نے کیا لکھا؟“
بھائی میاں نے اس کے سر پر دست شفقت پھیرا اور بولے۔

”لکھنے والے کو اپنی تحریر کا تنقیدی نگاہ سے ضرور جائزہ لینا چاہیے، جیہی
اس کی تحریر بہتر سے بہتر ہوگی۔“

پھر گھر میں جس نے بھی سنا، وہ حیرت اور خوشی کے عالم میں اسے دیکھتا
رہ گیا۔ ان کے دیکھنے کا انداز بالکل ایسا ہی تھا۔ جیسے اس نے کوئی زبردست
کارنامہ انجام دیا ہو۔ آٹاں کے دیکھنے کا انداز بے حد فخر تھا۔

پھر یہ لکھنے لکھانے کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، ایک کے بعد دوسرا، دوسرے
کے بعد تیسرا، چوتھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انداز تحریر خود بخود
بدلتا گیا۔ جو خامیاں پہلے افسانے میں تھیں وہ دوسرے میں نہیں تھیں جو دوسرے
میں تھیں وہ تیسرے میں نہیں تھیں۔ اس کی تحریروں کے سب سے بڑے نقاد
بھائی میاں تھے۔ کیونکہ بھائی میاں کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اس نے عفت کو لکھتے
تھا کہ ان کی نگاہوں میں اس کی کوئی تحریر ذرا مشکل سے ہی بچے گی۔

آٹاں، بڑی آپا، چھوٹی آپا اور سعدیہ باجی بے حد ذوق و شوق سے اس

”کس کا خط ہے؟“
”بھائی میاں! یہ ماہنامہ ”قندیل“ کے ایڈیٹر کا خط ہے۔“

”اچھا!!“
بھائی میاں کی حیرانی کچھ اور بڑھ گئی۔

”میں نے ایک افسانہ بھیجا تھا۔“
”اچھا! تم نے افسانہ لکھا تھا؟“

”جی! بھائی میاں۔“
”ہمیں تو دکھایا بھی نہیں تم نے۔“
”وہ — اصل میں بھائی میاں —“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
بھائی میاں نے کہا۔

”ہاں! ہاں! کمو، مارک کیوں گئیں؟“
”منہ مسم کے مارے نہیں دکھایا،“
”منہ مسم کس بات کی؟“

میں نے سوچا، جانے کیا اوٹ پٹانگ لکھا ہے۔“
”اوٹ پٹانگ لکھتے لکھتے ہی ایک دن آدمی اچھا بھی لکھنے لگتا ہے۔“
”پھر مجھے یہ بھی خیال تھا کہ معلوم نہیں چھپ بھی سکے گا یا نہیں۔“
”ایک دفعہ کوئی تحریر نہ چھپے تو ہمت نہیں ہارنی چاہیے، دوبارہ، سربارہ
کو سنسن کمرنی چاہیے۔“

ہی چلا گیا۔

انٹر کے بعد اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا یہاں اسکول، کالج کی دنیا سے بالکل ہی مختلف ایک دنیا آباد تھی۔ یہاں بڑی رنگارنگی تھی اور بہت گہما گہمی۔ کالج کے زمانے کی ساکنی لڑکیاں چھوٹ چکی تھیں جو یہاں تھیں بھی، ان سے رسمی سی بول چال تھی۔ نئی لڑکیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا اسے بہت دستور لگ رہا تھا اور لڑکوں سے بات کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل مرحلہ تھا۔ بڑی آپا تو خیر تعلیم ختم کر کے یونیورسٹی سے نکل چکی تھیں اور ان دنوں ایک کالج میں پکڑا رہی تھیں، چھوٹی آپا میڈیکل کالج میں تھیں۔ لیکن سعدیہ باجی یونیورسٹی میں ہی سال اول میں تھیں۔ وہ بے چارہ ان بڑی بہنوں میں سے قطعی نہیں تھیں جو اپنے بڑے ہونے کا رعب جتانے کے لئے چھوٹی بہنوں پر جاوے یا حکم چایا کرتی ہیں۔ بلکہ وہ تو بڑی ہمدرد، بڑی غصہ اور بے حد پیار کرنے والی دوست تھیں۔

سعدیہ باجی بڑی سوشل قسم کی تھیں بغیر مضامی سرگرمیوں میں بھی بڑی دلچسپی سے حصہ لیتی تھیں۔ ان کے دیپارٹمنٹ کی ہر تقریب ان کے بغیر ناممکن اور ادھوری سی محسوس کی جاتی تھی۔ کلاس فیلوز سے لے کر پروفیسر اور ڈیپارٹمنٹ کے چیئر مین تک کی زبان پر مس سعدیہ شجاع کا نام ہوتا تھا۔ وہ بے حد مہنس لکھ، ملنسار اور زندہ دل تھیں۔ ان ساری خصوصیات کے ساتھ ساتھ خوبصورتی میں بھی وہ کسی سے کم نہیں تھیں۔

عفت کو بڑی جلدی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ سعدیہ باجی کو کئی لڑکے

کے افسانے پڑھتی تھیں اور اپنی اپنی بساط کے مطابق ان پر تبصرہ کرتی تھیں۔ اماں بڑے فخر اور خوشی سے رشتہ دار خواتین اور پڑوس کی ملنے جلنے والی خواتین کو بتایا کرتی تھیں۔

”میری عفت افسانے لکھتی ہے، رسالوں میں چھپتے ہیں۔ اس کے افسانے“ کچھ لوگ حیرت زدہ ہو کر سوچتے۔

”ہیں! افسانے لکھتی ہے!!“

”یہ کیسی انوکھی بات ہو رہی ہے اس خاندان میں؟“

”باب، دادا میں سے نہ کبھی کوئی شاعر رہا نہ افسانہ نگار، پھوپھیوں چچیلوں میں سے نہ کبھی کوئی شاعر رہی نہ ناول نگار“

”عفت میں یہ صلاحیت کیونکر پیدا ہو گئی؟ اور کیسے پیدا ہو گئی؟“

کچھ ایسے بھی غصے جو جل کر کہتے۔

”ہنسہ! افسانہ لکھنا کون سا مشکل کام ہے، جو چاہے لکھ سکتا ہے، ہم نے

تو کبھی کوشش ہی نہیں کی، ورنہ ہم بھی لکھ لیتے۔“

بڑی آپا، چھوٹی آپا اور سعدیہ باجی اپنی سہیلیوں کو بہت خوش ہو کر بتاتے

”ہماری چھوٹی بہن افسانے لکھتی ہے۔“

”اچھا! کس نام سے لکھتی ہے۔“

وہ بڑے فخر سے اس کا نام بتاتیں اور ان رسالوں کے نام بھی بتاتیں جن

میں عفت کے افسانے چھپتے تھے۔

یوں دن بدن اس کے نام سے واقف ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ

بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور خود سعدیہ باجی کا یہ عالم تھا کہ خود ان کے دل میں کسی بھی لڑکے کے لئے اب تک ذرا سی جگہ بھی نہیں بن سکی تھی۔ ان کی پسند کا معاملہ یہ تھا کہ نوڈے پاڑے انہیں قطعی نہیں پسند تھے۔ سبزیدہ، بردبار قسم کے مرد انہیں پسند تھے جن کی عمر کی حد بھی انہوں نے مقرر کر رکھی تھی بیلیتیر اور چالیس سال کی درمیانی عمر والے مرد انہیں پسند تھے۔ مردوں کا گورا رنگ ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ لیکن مرد کا قد آور ہونا ضروری تھا۔

سعدیہ باجی بڑے پیار سے عفت کو سمجھایا کرتی تھیں کہ وہ اپنی اس بے پناہ کم سمجھنی کی عادت ترک کر دے ان کا خیال تھا کہ عفت کو قدم قدم پر غلط ضرور رہنا چاہیے لیکن لڑکوں کو بالکل ہوا سمجھ کر ان کے ساتے سے بھی بدکنے کی عادت ان کے نزدیک بالکل فضول تھی۔

اور عفت — وہ اپنی برسوں پرانی کم سمجھنی کی عادت کو ایک دم کیسے ترک کر دیتی، اور یہ کتنا بھی سراسر غلط تھا کہ وہ اب بھی وہی پہلے والی عفت تھی۔ بھائی میاں کی توجہ، محنت اور شفقت جب سے اس کے حصے میں آتی تھی اس نے اپنی شخصیت کو بڑی حد تک بدل لیا تھا۔ وہ خود اعتمادی — جس کی کمی کا سبب بھائی میاں کی عدم توجہی تھی۔ خود بخود اس کی شخصیت میں رچ بس گئی۔ اب رہ گئی خاموش رہنے کی عادت — تو سچی بات یہ تھی کہ اپنی اس عادت سے اسے پیار تھا۔ چپ چاپ رہنا، سوچتے رہنا اسے پسند تھا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ کسی سے بات نہیں کرتی تھی یا باز

کرنا پسند نہیں کرتی تھی، اپنی سہیلیوں اور رشتے کی بہنوں سے وہ موقع مل کر مناسب سے بات کرتی تھی۔ مہشتی مسکراتی بھی تھی لیکن پھر بھی — جانے کیوں اس کی شخصیت کے ساتھ، اس کے نام کے ساتھ ”خاموش طبیعت“ کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا تھا۔

لڑکوں کو اس نے کبھی ہوا نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی وہ ان کے ساتے سے بدکنی تھی۔ یہ محض سعدیہ باجی کا خیال تھا لیکن لڑکوں سے بلا ضرورت بات کرنا اس کے نزدیک قطعی فضول سی بات تھی۔ اب اس میں تو اس کا قصور نہیں تھا کہ اسے کسی بھی معاملے میں لڑکوں سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

اسکینڈلز سے عفت بہت گھبراتی تھی۔ اپنی ذات سے زیادہ اسے بھائی میاں اور اماں کی عزت کا خیال تھا۔ اس بات کا احساس اسے بڑی اچھی طرح تھا۔ کہ خاندان کے بیشتر افراد نے ان دنوں اسے اور سعدیہ باجی کو گفتگو کا مرکز بنا رکھا ہے۔ لڑکیوں کو ایجوکیشن میں پڑھنا ان کے نزدیک ان لڑکیوں کے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ تھا دینا تھا۔ انہیں اس بات کا پکا یقین تھا کہ یہ دونوں بہنیں لڑکوں کے ساتھ پڑھ کر ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلائیں گی۔

جہاں خاندان کی چار عورتیں جمع ہو جاتیں، عفت اور سعدیہ کو ہدف ملامت بنایا جاتا، اماں اور بھائی میاں بھی زیر بحث آتے لیکن بھائی میاں کے معاملے میں قطعی جانبداری برتی جاتی انہیں ”بے چارہ شجاع“ یا ”بے چارے شجاع“ بھائی، کہہ کر ہر الزام سے قطعی بری الذمہ قرار دیا جاتا اور کسی بھی قصور

کا تمام تر ذمہ دار آماں کو بھڑایا جاتا، گفتگو کرتے وقت یہ ضرور کہا جاتا کہ بے چارے شجاع بھائی کی تو اپنی کوئی مرضی، کوئی راستے ہے ہی نہیں، وہ تو ”ان“ کے تابع ہیں۔“ انہوں نے جیسا کہہ دیا۔ ویسا ہی کہتے ہیں۔“

”ان“ اور ”انہوں“ کے الفاظ سوائے آماں کے اور کس کے لئے استعمال کیے جاسکتے تھے۔

عفت کو بھائی میاں سے بے پناہ محبت تھی، لیکن بھائی میاں کے معاملے میں جانبداری والی حرکت سے اسے سرسرا خٹا لگتا تھا۔ اس کے خیال میں بھائی میاں کوئی موم کی ناک تو تھے نہیں، جنہیں آماں، جب جی چاہتا اور جہاں جی چاہتا موڑ دیتیں۔

ان رشتہ دار خواتین کے نزدیک آماں بے چارے دنیا زمانے کی جاہل بچھوڑ، بد سلیقہ اور بد مزاج عورت تھیں۔ اسی جاہل ماں کی اولاد میں سب ایک سے بڑھ کر ایک قابل اور سنگھڑ نکل رہی تھیں، یہ سب دیکھنا اور برداشت کرنا بڑے دل گروے کا کام تھا۔ آماں انہیں قدم قدم پر شکست دے رہی تھیں، یہ کیسی کایا پلٹی تھی اور اب — سوائے اس کے ان کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ ابھی حرکتوں پر اتر آئیں۔ جہاں کوئی تقریب ہوتی، آماں کو سنانے کے لئے طعن و تشنیع کی باتیں کی جاتیں۔ پھر اب تو آماں کے اوپر بڑی آپا کی کمائی کھانے کا الزام بھی تھا۔ ڈونکے کی چوٹ پہ یہ بات کہی جاتی تھی کہ آماں بڑی آپا کی شادی اس لئے نہیں کرنا چاہتیں کہ پھر ان کی کمائی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

گویا قصور ہر معاملے میں صرف آماں کا تھا۔ بھائی میاں قطعی بری الذمہ تھے۔ بڑی آپا کے لئے بڑھوٹا آماں کا کام تو نہیں تھا۔

عفت سوچتی —

اب یہ تو ہونے سے رہا کہ آماں برفہ اوڑھ کر گھر سے نکل کھڑی ہوں اور گلی گلی بڑی آپا کے لئے بڑھوٹا دیتی پھیریں۔

کننے والوں کی زبان کس نے پکڑی ہے، ایسی باتیں سن کر سوائے خون کے ٹھونٹ پینے اور خاموش رہنے کے اور کیا کیا جاسکتا تھا۔

عفت کو افسوس تو اس بات پر ہوتا تھا کہ بقول لوگوں کے ”بڑی آپا کی کمائی کھاتے“، آماں کو کون سے چارے، پھر برس ہو گئے تھے۔ بڑی آپا کو لکچر شپ، ملے بمشکل تمام ابھی سال بھر ہوا تھا۔ خاندان کی دوسری لڑکیوں نے اگر زیادہ نہیں پڑھا تھا یا ملازمت نہیں کی تھی تو اس میں کس کا قصور تھا۔ آماں تو انہیں یہ مشورہ دینے نہیں گئی تھیں۔ یہ ان کے اپنے ”اعلیٰ“ اور ”ارفع“ اصول تھے، جن کا پرچار وہ بڑے فخر سے کیا کرتی تھیں۔

”ہمیں اپنی بیٹیوں کو ایسی ڈگریاں نہیں دلوانی ہیں کہ ان کی آنکھ میں نہ شرم بسے نہ لحاظ“

کبھی کہا جاتا

”ہمیں اپنی بیٹیوں سے ملازمت تو کروانی نہیں ہے جو اندھا دھند پڑھائے چلے جائیں۔“

اتنی تکلیف وہ باتیں سن کر عفت کا دل بے اختیار رونے کو چاہتا تھا۔ وہ

اکثر چپ چاپ بیٹھ اپنے رشتہ داروں کے اس رویے پر غور کیا کرتی تھی۔ ان بدلتے ہوئے حالات نے اس کی سوچوں کو بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ جب کہ سعدیہ باجی ایسی باتوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتی تھیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ لوگ ہماری خوبیوں اور صلاحیتوں سے جل کر ایسی بے سرو پا کی باتیں بناتے ہیں۔ وہ دوسروں کی پرواہ کئے بغیر جو دل چاہتا تھا پہنتی تھیں اور جس سے دل چاہتا تھا بات کرتی تھیں۔ اپنے دل اور ضمیر کو مطمئن کرنے کے بعد انہیں دنیا میں کسی کوئی پرواہ نہیں تھی اور عفت کو کیونکہ وہ اپنے آپ سے بہت قریب سمجھتی تھیں اس لئے اسے بھی یہی مشورے دیتی تھیں عفت ان کی باتیں سنتی تو بہت غور سے تھی جب ان پر عمل کرنے کا وقت آتا تو وہ اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کرتی۔

کالج میں اس کا یونیفارم سفید تھا۔ یونیورسٹی میں آنے کے بعد بھی اس نے اپنا سفید لباس برقرار رکھا۔ سفید کپڑے اسے شروع ہی سے بے حد پسند تھے لیکن یونیورسٹی میں اس لباس کو مستقل پہننے کا سبب محض اس لباس کی پسندیدگی ہی نہیں تھی۔ بلکہ اماں اور بھائی میاں پر کم سے کم بوجھ ڈالنا بھی مقصود تھا۔ یونیورسٹی میں تو بیشتر لڑکیاں ہر روز دوسرا لباس پہن کر آتی تھیں۔ تعلیم کے اخراجات تو خیر ایک عبوری تھی۔ لیکن اپنے لباس کے لئے ماں باپ کے اوپر اتنا بوجھ ڈالنا اسے سراسر ظلم معلوم ہوتا تھا۔

سعدیہ باجی نے بارہا اسے سمجھا دیا کہ اب صورت پہلے جیسی نہیں ہے مالی حالات نسبتاً بہتر ہیں تم مستقل طور پر سفید لباس پہننا چھوڑ دو۔

عفت ان کی بات سن کر کہتی۔

”ابھی چند سالوں تک ہمارے گھر کے مالی حالات بہتر ہونے مشکل ہیں“
 ”کیوں بھی؟ اب تو بڑی آپا بھی مروس کرتی ہیں۔“
 ”لیکن آپ اخراجات بھی تو دیکھئے، پھوٹی آپا اور فرخ بھائی کی کتنی فیسیں جاتی ہیں۔ ڈاکٹری اور انجینئرنگ پڑھانا آسان ٹھوڑی ہے۔“
 ”ہاں انم کتنی تو ٹھیک ہو۔“

سعدیہ باجی گری سوچوں میں ڈوب جاتیں۔
 ”اس سال خرم بھی کالج میں آجائے گا، اس کی فیس بھی بڑھ جائے گی“
 ”ہاں عقو! واقعی، تم تو ہر وقت انہی فکروں میں گھلتی رہتی ہو۔“
 ”کیا کروں سعدیہ باجی! گھر کے حالات سے چپٹم پوشی بھی تو نہیں کی جا سکتی۔“

سعدیہ باجی ہنس کر بولیں۔
 ”تم بڑی گریٹ ہو عفت! سب کے لئے کتنا دروہ ہے۔ تمہارے دل میں“

عفت اپنی تعریف سن کر جھینپ گئی۔

”یہ بات نہیں ہے سعدیہ باجی! اصل میں.....“

سعدیہ باجی اس کی بات کاٹ کر بولیں۔

”نہ اصل میں نہ نقل میں، حقیقت بیان کر رہی ہوں، ایک میں ہوں کہ اپنی ہنسی ٹھٹھول میں کسی بات پر کوئی دھیان ہی نہیں دیتی۔“

عفت مسکرا کر بولی۔

”اب آپ مجھے بنائیں تو نہیں“

سعدیہ باجی ایک م مذاق کے موڈ میں آکر بولیں۔

”لو جی! تمہیں کوئی کیا بتانے کا تم تو سر اپنا کتل ہو“

عفت نے ایک دم موضوع بدل دیا اور اپنی سہیلیوں کا قصہ لے کر بیٹھ

گئی۔

آمنہ کی کلاس بڑی چھوٹی سی تھی۔ کل پندرہ لڑکے، لڑکیاں تھیں، لڑکیوں کی تعداد چھ تھی۔ دو لڑکیاں بڑی امیر و کبیر تھیں، ایسی ایسی گاڑیوں میں آتی تھیں۔ قیمتی لباس زیب تن کرتی تھیں۔ جن کی تراشش فراکشش بڑی عمدہ ہوتی تھی۔ وقتاً فوقتاً ان کے ہمپراسٹائل بھی بدلے رہتے تھے، عفت کو کبھی اندازہ نہ ہو سکا۔ کہ ان کو کتنا جیب خرچ ملتا تھا، اس نے ہمیشہ انہیں بڑی فراخ دلی سے روپے خرچ کرتے دیکھا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر پوری کلاس کو مڑیٹ دینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں تھی۔

لڑکوں میں سے پانچ لڑکے غیر ملکی تھے۔ جو انگریزی کو بھی عربی میں بولنے کی کوشش کرتے تھے۔ شہر سے عموماً ٹیکسی میں یونیورسٹی آتے تھے اور دس، دس کے نوٹ بڑی فیاضی سے ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ شہر سے یونیورسٹی تک کرایہ چاہے جتنا بھی بنا ہو، باقی روپے واپس لینا شاید ان کی عزت، ان

کی نشان اور ان کے اصول کے خلاف تھا۔ جس ٹیکسی میں بھی ایسے لوگ بیٹھ جاتے تھے، اس کے ڈرائیور کی قسمت کھل جاتی تھی۔

عفت کا خیال تھا کہ کلاس کی سبھی لڑکیوں کی مالی حالت اس سے بہتر ہے امیر لڑکیوں سے دوستی کرنا اسے بالکل پسند نہیں تھا، اس نے ان سے بات کرنے میں پہل کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ اسے ہر حال میں اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنا تھا۔ ان سے دوستی کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک دفعہ اگر وہ اس کے اوپر گینٹین میں کچھ رقم خرچ کریں تو دوبارہ اسے خرچہ برداشت کرنا پڑتا اسے ابھی طرح معلوم تھا کہ آئے دن وہ ایسے خرچوں کی متغیر نہیں ہو سکے گی۔ اور خرچ نہ کرنے کی صورت میں اسے کنجوس ہونے کا طعنہ سننا پڑتا جو اسے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں تھا۔

ان سے دوستی کرنے میں اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ اگر دو چار دفعہ وہ اسے اپنے گھر بلائیں گی تو لازماً ایک دفعہ تو اسے ممی انہیں اپنے گھر بلانا پڑے گا۔ اور اس کا گھر جیسا بھی تھا، اس کے لئے تو وہ کسی عمل سے کم نہیں تھا کیونکہ وہ بھاتی میاں کی گائیکہ پسینے کی کمائی سے قسطوں میں بناتا اور برسوں کی عزت، ریزی کے نتیجے میں بناتا اس کا ساز و سامان — ٹوٹا پھوٹا، شبہ کی بجائے تھا عفت کے لئے بہت آرام دہ تھا اسے اس بات پر بھی غرور تھا کہ اس گھر کے درو دیوار رشوت کی ایک پانی کے بھی احسان نہیں لیکن یہ ساری باتیں یہ ساری سوچیں اس کی تھیں۔ دوسرے لوگ تو اس انداز میں نہیں سوچتے تھے۔ لوگ تو گھر اور اس کے ساز و سامان کے حسن میں خاندان کا وقار تلاش کرتے تھے اور عفت کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ کہ لوگ حاندان

اور خاندانی وقار کو پرکھنے کے لئے گھر اور ساز و سامان کو معیار بنائیں۔

ان دونوں رئیس زادیوں نے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کئے بغیر اپنے طور پر یہ فرض کر لیا تھا کہ عفت کو اپنی ذہانت اور قابلیت پر بڑا عزور ہے۔ اس کا اظہار وہ نہ صرف کلاس کی باقی تین لڑکیوں بلکہ لڑکوں کے سامنے بھی کر چکی تھیں۔ لیکن نمینہ، رخشندہ اور شیخیں کو ان دونوں — شمع اور روجی کی رائے سے سرسرا خلتا تھا۔ کیونکہ ان مینوں کے ساتھ عفت کا وہ انداز ہرگز نہیں تھا جو شمع اور روجی کے ساتھ تھا۔

رخشندہ کو عفت کے ساتھ کچھ زیادہ ہی انس ہو گیا تھا۔ وہ نہ صرف اس کی صورت بلکہ سیرت کی بھی بے حد مداح تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی یہ کوشش بھی ہوتی تھی کہ عفت اپنے آپ کو زیادہ نہ سمجھتی تو غصہ سا ہی بدل دے۔ لیکن عفت کا خیال تھا کہ وہ جیسی بھی ہے، جو کچھ بھی ہے بالکل ٹھیک ہے۔ جس کسی کو اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا ہے وہ اسے اس کی تمام عادتوں سمیت قبول کر لے۔ رخشندہ نے کئی دفعہ وہی زبان سے اس سے کہا کہ وقت اور حالات کے مطابق اسے اپنے انداز میں تبدیلی لانی چاہیئے۔

یہ بار بار کا ٹوٹنا آخر کار عفت کو کھل گیا۔ ایک دن — جب وہ دونوں کا من روم کے سامنے برآمدے کے فرش پر بیٹھی تھیں اور رخشندہ نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پھر وہی پرانی بات دہرائی تو عفت بڑا امان کر بولی۔

”آخر تم کس قسم کی تبدیلی چاہتی ہو مجھ میں؟“

”ایک تو تم اپنا یہ سفید لبادہ اتار دو۔“

”نہیں کیا فائدہ پہنچے گا اس سے؟“

”اپنے نہیں، تمہارے فائدے کے لئے کہہ رہی ہوں۔“

”اچھا! تو مجھے کون سا فائدہ پہنچے گا اس سے؟“

”تم دیکھنا تو سہی، کس قدر نکھری ہوئی نظر آؤ گی تم رنگ برنگے کپڑوں

میں۔“

”میں چاہتی ہی نہیں کہ میں نکھری ہوئی نظر آؤں۔“

رخشندہ جل کر بولی۔

”تم سے کچھ کہنا تو بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔“

”تو مت بجا یا کرو میں کون کننا ہے۔“

رخشندہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

عفت نے ترجیحی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

”اور دوسری کون سی تبدیلی لانا چاہتی ہو تم مجھ میں؟“

”ناراضی بعد میں ہو لینا، پہلے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو ہو جائے

رخشندہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

عفت نے اس کا سراپنی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

”بولو نا! گوئیے گا گڑا کھا کر بیٹھ گئی ہو؟“

رخشندہ نے پھر منہ پھیرنے کی کوشش کی تو اسی لمحے دونوں کی نگاہیں

ملکر آگئیں۔ رخشندہ اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکی، عفت کو بھی ہنسی آگئی۔

”ہاں! پھر دوسری تبدیلی کے بارے میں بھی بات ہو جائے“

”کیا فائدہ ہے؟“ رخشندہ نے کہا

”لیکن میرا خیال ہے کہ تبادلہ خیال کر لینے سے نقصان بھی کوئی نہیں ہوگا۔“

”تمہارا نقصان تو بے شک نہیں ہوگا“

”اور جیسے تمہارا تو بہت بڑا نقصان ہوگا۔“

”اور کیا۔۔۔ میری زبان گھسی جاتی ہے سمجھا سمجھا کر، تم اپنی مہٹ دھرمی سے باز

ہی نہیں آئیں کسی طرح۔“

”اچھا چلو، کہو تو سہی، ہو سکتا ہے اس دفعہ تمہارا سمجھنا رائیگاں نہ جائے“

رخشندہ نے جبرت سے عفت کی طرف دیکھا اور بولی۔

”کیا واقعی اس دفعہ تم میری باتوں پر غور کرنے کے موڈ میں ہو!“

”تم کہہ کے تو دیکھو۔“

”اچھا تو پھر دوسری بات یہ ہے کہ تم اس قدر سنجیدہ اور چپ چپ رہنا چھوڑ دو۔“

”اچھا اور تیسری تبدیلی؟“

”تیسری تبدیلی تم میں یہ آئی چاہیے کہ تمہیں زیادہ نہ سہی تو کبھی کبھی بیچاے

لوگوں سے بھی بات کر لینی چاہیے۔“

عفت نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا! بے چارے لڑکے۔“

”ہاں! اور کیا،“

اس میں بے شک میں نے کوئی کام نہیں کیا۔
 رخشندہ اس کی تقریب سے گھر آکر بولی۔

”تو پھر شاید تمہارے نقش و نگار ہی ایسے ہوں گے جن سے سنجیدگی اور
 خاموشی ٹپکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔“
 ”جو تمہارا دل چاہے سمجھ لو۔“

”اچھا! اب تیسری بات کے بارے میں بھی کچھ ارشاد فرمائیے“
 ”تیسری بات تو اس قدر احمقانہ ہے کہ اس کا جواب دینے کو قطعی میرا دل
 نہیں چاہتا۔“

”بہت خوب! رخشندہ نے طنزیہ کہا۔
 ”سوال یہ ہے کہ میں بقول آپ کے“ بے چارے لڑکوں“ سے بلا ضرورت
 کیوں بات کر دو؟“
 ”حد ہو گئی خود غرضی کی“

”اب چاہے تم اسے خود غرضی کہو یا مطلب پرستی، لیکن میں ان سے کبھی
 بات کروں گی جب مجھے ان سے کوئی کام ہوگا۔“
 رخشندہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر چوڑا کر بولی۔

”کون کسے گا کہ تم سعیدہ باجی کی بہن ہو۔“
 ”کسی کے نہ کہنے سے حقیقت تھوڑی بدل جاتے گی۔“
 ”فلسفیانہ باتیں کرنے میں پیش پیش ہو۔“
 ”اس میں کون سا فلسفہ نظر آگیا تمہیں؟“

”بس! یا اور کچھ بھی کہنا ہے؟“
 ”نہیں، بس اتنا ہی کافی ہے۔“

”اچھا تو میں رخشندہ سعیدہ! آپ کی پہلی بات کا جواب تو میں دے رہی
 چکی ہوں۔“

”ہاں! بڑا کرم کیا آپ نے“
 ”دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ میں نہ بہت سنجیدہ رہتی ہوں نہ بہت

چپ چاپ۔“
 ”تمہارا خیال ہے سارے لوگ بکواس کرتے ہیں“
 ”میں یہ تو نہیں کہتی کہ لوگ بکواس کرتے ہیں“

”بھیسے؟“
 ”لیکن یہ ضرور ہے کہ لوگ میری سنجیدگی اور خاموشی کو محسوس زیادہ کرتے
 ہیں یا پھر شہرت زیادہ دیتے ہیں“

”رخشندہ ایک دم چوڑا گئی اور بولی۔
 ”سراسر بکواس کر رہی ہوں تم“

عفتت بھی برہم ہو گئی۔

”بھئی! میں نہیں مانتی یہ بات ہنسنے کی بات ہوتی ہے۔ تو میں دل کھول کر
 ہنسنے ہوا، باتیں ہوتی ہیں تو میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتی ڈیپارٹمنٹ کے
 اب تک جتنے بھی فنکشن ہوئے ہیں۔ میں نے سبھی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، یونی
 کے انتخابات کے دنوں میں، میں کتنی سخت بیمار ہو گئی تھی، تمہیں تو پتہ ہی ہے

”سبح اسعدیہ باجی کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔“

”اچھا! کیا واقعی؟“

”اور کیا! کس قدر ہر دلعزیز ہیں کیا پروفیسر کبارٹ کے، سبھی ان کے کن گاتے

ہیں۔“

”میں خود ان کے کن گاتی ہوں۔“

”کن گاتی ہو لیکن ان کی عادتیں نہیں اپنا سکتیں۔“

”پھر غصہ میں اور ان میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔“

رخشندہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور بولی۔

”تمہیں معلوم ہے شمع اور روحی تمہارے بارے میں کیا کہتی ہیں۔“

عفت نے بڑی لاپرواہی سے پوچھا۔

”کیا کہتی ہیں؟“

”وہ تمہیں بے حد مغرور سمجھتی ہیں۔“

”مجھے پہلے ہی اس بات کا اندازہ تھا۔“

”اور یہ بات تو میں نے تمہیں کبھی بتائی ہی نہیں کہ روحی نے مجھے کیا مشورہ

دیا تھا۔“

”کیا مشورہ دیا تھا؟“

”اس نے کئی دفعہ مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ تم عفت سے دوستی ختم کرو،

وہ بہت لور لڑکے ہے اس کا اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔“

عفت کو ایک دم دھچکے سا لگا۔ لیکن اس نے چہرے سے اپنی دلی کیفیت کو

ظاہر نہیں ہونے دیا۔

مسکرا کر بولی۔

”بہت سو درندہ مشورہ دیا تھا اس نے تمہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں واقعی بہت لور لڑکے ہوں، تمہیں فوراً مجھ سے دوستی ختم

کر لینی چاہیے۔“

”تمہیں تکلیف پہنچی اس کی بات سے؟“

”قطعاً نہیں۔“

”پھر ایسی بات کیوں کر رہی ہو؟“

”میں سوچ رہی ہوں کہ بڑی ہمت سے تمہاری جو تم نے اتنے غلصہ مشورے

کے باوجود میرے ساتھ دوستی کو نبھائے رکھا۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو۔“

”اور شاید اسی لئے تم مجھے بدل دینا چاہتی ہو کہ روحی کو کچھ کہنے کا موقع

دے دے۔“

”تم ہوشیار بن تو ہو؟ جانے کیا کیا سکے چل جا رہی ہو؟“

”آپ چاہتے اسے بکواس سمجھیں یا کچھ اور، لیکن یہ بات میں کے دینی ہوں

کہ اندر آپ کو مجھ سے دوستی رکھنی ہے تو میں جیسی بھی ہوں، جو کچھ بھی ہوں اسی حالت

میں گوارا کیجیے۔“

”تم سے آپ پر کیوں اترا آئیں؟“

”اس لئے کہ وہ ہمیں زاریاں ہیں، میں ان سے دوستی بڑھا کر اپنی انا اور خود
 داری کو بھٹیس نہیں پہنچانا چاہتی۔“
 ”تمہارا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔“
 ”ہاں! اس بات کا بھی امکان ہے لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں نے ان کے
 بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہی درست ہو۔“
 ”لیکن کسی کو آزما لینے یا پرکھ لینے میں کیا حرج ہے۔“
 ”تمہیں رشتہ دار ہیں نہیں چاہتی کہ غیر محسوس طریقے پر ہماری دوستی اس
 اسٹیج تک پہنچ جائے کہ میں انہیں اپنے گھر بلانے پر مجبور ہو جاؤں۔“
 ”تو اس سے کیا نقصان ہوگا تمہارا۔“
 ”میں انہیں اپنا مذاق اڑانے کا موقع نہیں دینا چاہتی۔“
 ”پتہ نہیں تم اس قسم کے احساسات کا شکا کیوں ہو؟ ہمیشہ تاریک پہلو
 ہی دیکھتی ہو۔“
 عفت سر جھکاتے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کا دل ایک دم ہی اس
 ہو گیا تھا۔

دوسرے روز رشتہ یونیورسٹی آئی تو عفت پہلے ہی سے موجود تھی۔ کامن روم
 میں دروازے کے بالکل سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح
 مسکرا کر خشنہ کا استقبال نہیں کیا۔ بلکہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کامن روم سے
 باہر چلی گئی۔ رشتہ دار بھی اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔ اس نے عفت کو غلط
 کیا لیکن عفت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کو ریڈرو میں چپ چاپ چلتی رہی۔ رشتہ

عفت نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔
 ”ورنہ آپ کو روحی کی دوستی مبارک ہو۔“
 ”کیا بالکل ہی پاگل ہو گئی ہو؟“
 ”بہر حال! آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ میں آپ کے یا کسی اور کے کئے
 سے سعدیہ باجی یا روحی بننے کی کوشش قطعی نہیں کروں گی۔“
 ”ارے بابا! تو کون کم نعت تم سے کہہ رہا ہے کہ تم سعدیہ باجی یا روحی بن
 جاؤ۔“
 ”یہ الگ بات ہے کہ میں خود کسی وقت یہ محسوس کروں کہ مجھے اپنی شخصیت
 کو محفوظ اس ابدل دینا چاہیے۔ لیکن وہ میری اپنی رائے اور مرضی ہوگی، میں کسی کی تابع
 نہیں ہوں گی۔“
 ”اُن میرے خدا بابا! رشتہ دار نے اپنا سر تھام لیا۔
 ”میری شامت ہی آئی تھی جو میں نے تم سے یہ بات کہہ دی۔“
 عفت سر جھکاتے چپ چاپ بیٹھی رہی۔
 ”اتنی لمبی چوڑی تقریر سنا کر رکھ دی۔“
 عفت پھر بھی کچھ نہیں بولی۔
 ”اچھا! ایک بات بناؤ عفت، رشتہ دار نے کہا
 ”پوچھو۔“
 ”شع اور روحی کے ساتھ تم نے یہ انداز کیوں اختیار کر رکھا ہے؟“
 عفت ایک دم بھڑک اٹھی۔

نے دو تین دفعہ اسے لپکا رہا لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر رخشندہ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ مگر لکچر روم سے باہر میٹر ہیوں پر جب عفت بیٹھنے لگی تو رخشندہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

عفت نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

رخشندہ کو ایک دم ہنسی آگئی۔

اس نے عفت کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”مزاج کیوں بگڑا ہوا ہے؟“

”عفت خاموش رہی۔“

”ذرا سوچو تو سہی عفو را فی اس قدر بچوں جیسی حرکت ہے یہ۔“

عفت پھر بھی چپ رہی۔

”مجھے توقع نہیں تھی کہ تم روح کی بات کا اس قدر اثر لوگی، میں واقعی حیران

ہوں۔“

عفت نے ایک نگاہ غلط انداز رخشندہ پر ڈالی اور کباریوں میں لگے

ہوئے گیند سے کے زرد زرد پھولوں کو دیکھنے لگی۔

رخشندہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا واقعی بات نہیں کہ نہ؟“

”نہیں۔“

”کیوں۔“

”بہرا خیال ہے میں اس قابل نہیں کہ کسی سے بھی دوستی رکھ سکوں۔“

”بھئی اب بخش بھی دور وحی کو،“

”میں کسی کو بخشنے والی کون ہوتی ہوں۔“

”تو پھر اس ساری حرکت کا مقصد کیا ہے؟“

”کوئی مقصد نہیں۔“

”پھر یہ بچپنا چھوڑو، آؤ کینٹین میں چائے پیٹے ہیں۔“

”میں گھر سے پی کر آئی ہوں۔“

”ایک کپ اور سہی۔“

”میرے پاس فالتو پیسے نہیں ہیں۔“

”میرے پاس ہیں۔“

”چائے بھی تہی ہو۔“

”اب زیادہ نخرے مت دکھا، ورنہ ایک دھپ جامادوں کی۔“

”جمادو۔“

”اب اٹھ بھی جاؤ، دیکھو سامنے سے سرفیاض آرہے ہیں۔“

”آرہے ہیں تو آنے دور۔“

”میرا خیال ہے اسی روم میں ان کی کلاس ہے۔“

عفت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سرفیاض قریب آگئے تھے۔

”تم تو جیتی ہو سرفیاض کی۔“ رخشندہ نے سرگوشی کی۔

”میں کسی کی چہیتی دہشتی نہیں ہوں۔“

اس نے گھبرا کر جلدی سے انہیں سلام بھاڑ دیا۔

انہوں نے مسکرا کر سر کے خفیف سے اشارے سے جواب دیا اور لکچر روم میں داخل ہو گئے۔ اندر لڑکے لڑکیاں بڑی بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔
عفت بیڑھیاں اُتر کر لان میں چلی آئی۔ رشتہ دار بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

”کیوں شرم؟ اس حقیقت سے انکار کیوں ہے آپ کو؟“

”کس حقیقت سے؟“

”آپ سرفیاض کی چیتھی نہیں ہیں؟“

”کس نے کہہ دیا؟“

”آپ کی ذہانت کے قصیدے تو پڑھتے رہتے ہیں“

”آپ ہی کے سامنے پڑھے ہوں گے“

”اب زیادہ اتراؤ مت، گھٹنے بھر سے منار ہی ہوں دماغ ہی نہیں ملتے
رشتہ دار اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتی ہوئی کینٹین کی طرف چل دی۔

”ارے بھئی ہاتھ تو بھوڑ دو“

”نہیں بھوڑوں گی“

”سب دیکھ رہے ہیں۔“

”دیکھنے دو۔“

”بہت برا معلوم ہو رہا ہے“

”معلوم ہونے دو۔“

”اچھا جیسی! میں چل رہی ہوں، چائے بھی پی لوں گی، لیکن خدا را! تم ہاتھ“

”اب آئیں ذرا راست پر“

عفت نے غشگیں لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اب کھا جانے والی لگا ہوں سے مت دیکھو“

عفت نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

”شرافت کی زبان ہی نہیں سمجھتیں“

پھر جانے کیا ہوا کہ عفت کو ایک دم ہنسی آگئی۔

”شرم تو نہیں آتی اتنے نخرے دکھانے ہوتے۔“

”شرم کی کیا بات ہے؟“

”کتنا جاہلی ہوں میں نہیں، کچھ احساس ہے نہیں؟“

”اب ڈائلاگ مت بولو۔“

”افسانے تو تم لکھتی ہو، ڈائلاگ میں کیسے بولوں گی“

”میشٹر لوگ دوسروں کے افسانے سے چرائے ہوئے ڈائلاگ بولتے ہیں“

”اچھا بس ختم کر دو، یہ تباہ کچھ کھاؤ گی بھی یا صرف چائے پیو گی“

”صرف چائے پیوں گی“

اور پھر چائے آنے تک دونوں کاموڈ ٹیبل ہو چکا تھا دونوں اگلے دن

کے ٹیسٹ کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔

کو نہیں غوا نہیں ملنے والا ہوا۔ اماں کا ردال بوال خدا کا مسکرا گزرا تھا جس نے انہیں اتنی ہونہار اولاد دی تھی۔

کچھ دنوں بعد تقسیم انعامات کی تقریب آرٹھووریم میں منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی کے طور پر ایک مستور ادیب کو بلا یا گیا تھا۔ سفید سیدھے سادے کپڑوں میں بلوس عفت جب اپنا انعام لینے اسٹیج پر پہنچی تو بے شمار لگا ہیں اس پر جرم کر رہ گئیں۔ اسے احساس تھا کہ اس وقت وہ مرکز نگاہ بنی ہوئی ہے ایک لمحے کے لئے وہ ندوس سی ہوئی لیکن پھر نارمل ہو گئی۔

خلیل جبران کی کتابوں کا میڈٹ اسے تحفے میں ملا تھا۔ انعام کے احساس سے زیادہ اسے کتابیں ملنے کی خوشی تھی، اچھی کتابیں اس کی بہت بڑی کمزوری تھیں۔ اسے جب بھی کوئی رقم ملتی تھی، چاہے عیدی کے طور پر یا کسی اور ذرائع سے وہ اس رقم کو کتابیں خریدنے پر ہی خرچ کرتی تھی۔

تقسیم انعامات کی تقریب کے بعد لڑاکوں کو بہانہ مل گیا، پہلے مبارکباد دی، اس کے بعد وقتاً فوقتاً اس کا راستہ روک کر بات کرنے لگے کبھی خیریت پوچھنے کے بہانے، کبھی کسی ٹیسٹ کے متعلق گفتگو کرنے کے بہانے اور کبھی ٹیٹوریل کی کاپی مانگنے کے بہانے اس کی راہ روک لیتے۔ ایسے لمحوں میں منہ توڑ کر جراب دینا عفت کے لئے بڑا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ مختصر سی بات کر کے وہ لڑکے اپنی راہ لیں۔ مگر صرف اس کے چاہتے سے کیا ہو سکتا تھا سعدیہ باجی خوش تھیں کہ عفت کے اندازا سہنتہ آہنتہ بدل رہے ہیں۔

انعام حاصل کرنے کی خوشی میں اس کی کلاس کی لڑکیوں نے پارٹی کا تقاضا

یونیورسٹی میں عفت کا پہلا سال بڑے سکون سے گزر گیا سعدیہ باجی نے پریولس میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے۔ ان کے ملاحول اور ان سے مرعوب ہونے والوں کی تعداد میں کچھ اندازہ ہو گیا یونیورسٹی میگزین میں عفت کا بڑا مہر کے کا اندازہ چھپا تھا۔ ہر طرف واہ واہ ہو رہی تھی۔ بیشتر لوگ ”روشن اندھیرے“ جیسے خوبصورت افسانے کی خالق کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے منتہی تھے۔ افسانہ نگاری کے مقابلے میں بھی اس کا افسانہ شامل تھا اس مقابلے کا نتیجہ اب تک منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ عفت سے زیادہ سعدیہ باجی اور نشا کو اس نتیجے کا انتظار تھا۔ بھائی میاں بھی اس نتیجے کے بڑی بے چینی سے منتظر تھے۔ اور حجب نتیجہ سامنے آیا تو یہاں بھی عفت شجاع مہر فرست تھی رشتہ دار سعدیہ باجی نے کچھ اس انداز سے اس کی پیٹھ کھٹوئی کہ اسے اپنی ٹہریاں ٹوڑ جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ بھائی میاں اس قدر مسرور تھے جیسے انعام عفت کو

کیا شمع اور روحی اس موقع پر پیش پیش تھیں۔ عفت نے ان سب کو ٹالنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اسے آثار اچھے نظر نہیں آتے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے سب نے الیکا کر رکھا ہو۔ عفت نے چند دنوں کی مہلت مانگ کر فوری طور پر تو اپنی جان بچالی۔ لیکن وہ اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

اس روز وہ سعیدہ باجی سے پہلے ہی گھر آگئی تھی۔ سعیدہ باجی کا پریکٹیکل تھا وہ شام کو گھر واپس آئیں تو عفت ستر تک چادر اوڑھے بے خبر سو رہی تھی۔ اس روز اس نے نہ عصر کی نماز پڑھی نہ مغرب کی۔ مغرب کی اذان کے وقت اماں نے اسے جھجھوڑ کر اٹھایا۔ وہ چادر ہٹا کر اٹھ بیٹھی۔ لیکن جیسے ہی اماں کمرے سے باہر نکلیں وہ پھر چادر تان کر لیٹ گئی۔ اماں مغرب کی نماز پڑھ کر باورچی خانے میں مصروف ہو گئیں اور عفت بے خبر سو رہی۔ جب رات کے کھانے کے لئے برآمدے میں دسترخوان بچھایا گیا تو اماں کو پھر اس کا خیال آیا۔ فوزی نے نعرہ لگایا۔

”سب لوگ کھانا کھالیں“

باری بادی سبھی آکر بیٹھ گئے۔ لیکن عفت اگر اٹھتے کے موڈ میں ہوتی تو آتی۔ وہ جاگ مزدور رہی تھی لیکن کالوں کی طرح بستر میں پڑی تھی۔ اس کے کانوں میں اماں کی آواز آتی۔

”اے ہے! یہ عفت کہاں رہ گئی؟“

بڑی آپا نے کہا۔

”وہ سو رہی ہے۔“

”کیا پھر سو گئی؟“

”فرخ بھائی بولے۔“

”عفت نے آج سارے گھوڑے گدھے بیچ دیتے ہیں اماں“

چھوٹی آپا کی رگ ڈاکٹری پھٹر کی تو وہ بولیں۔

”میرا خیال ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں“

بھائی میاں کو شاید تشویش ہوئی، فوراً فوزی کو دوڑایا۔

”جاؤ فوزی! دیکھ کر نو آؤ“

فوزی سڑ سڑ کرتی اس کے پاس آ پہنچی۔

”اٹھئے عفت باجی! سب کھانا کھا رہے ہیں“

عفت نے منہ پر سے چادر ہٹائی۔

فوزی نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی“

”ہاں“

”پھر کیوں سوئے چل جا رہی ہیں“

عفت نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے کمرے ہوئے

بالوں کو سمیٹتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بس! جلدی سے آ جاتیے“ فوزی نے کہا۔

”اچھا“ وہ فوزی کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔

آنگن کے ایک کونے میں لگے تل کے پاس بیٹھ کر اس نے لٹی کی اور منہ پر پانی کے دو چار چھینٹے مارے۔ تار پر لٹکا ہوا تولیہ اتار کر بڑی سستی سے اپنا منہ پونچھا اور فرخ بھاتی کے سامنے خالی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

اماں اسے دیکھتے ہی بولیں۔

”میں نے تو تمہیں مغرب کے وقت اٹھایا تھا۔“

”میں پھر سو گئی تھی۔“

”آخر کیوں؟“

”بہند آ رہی تھی مجھے۔“

”تمہاری بہند آجکل انٹی باؤلی کیوں ہو گئی ہے؟“

عفت مسکراتے ہوئے۔

”باؤلی تو نہیں ہوتی۔“

”اور کیا پرسوں بھی تم اسی طرح سوتی تھیں۔“

”کوئی کام نہیں تھا اس لئے سو گئی۔“

”ہر کام کا وقت ہوتا ہے، یہ بھٹوڑی کہ آدمی سوتے تو سوتا ہی چلا جائے۔“

بڑی آپا نے لغتہ دیا۔

”عصر، مغرب دونوں وقت کی نمازیں گول کی ہیں آج محترمہ نے۔“

بھاتی میاں نے تکیہ کی۔

”نماز مت چھوڑ کر و۔“

عفت نے دیکھا۔

فرخ بھاتی بڑی بیزاری سے اور بہت منہ بنا بنا کر کھانا کھا رہے تھے۔ عفت نے کہا۔

”اماں! فرخ بھاتی کو کھانا اچھا نہیں لگ رہا۔“

اماں نے فرخ بھاتی کی طرف دیکھا اور بولیں۔

”کیا بھاتی ہے کھانے میں؟“

”آپ مریضوں والا کھانا مت پکایا کر یہ اماں، فرخ بھاتی بوئے۔“

”یہ مریضوں والا کھانا ہے؟“

”اور کیا، مونگ کی دال، لوکی کی بھجیا۔“

”تو پھر کیا پکاؤں؟ مسور اور ماش کی دالیں نہیں ناپسند ہیں، گو بھی تمہیں اچھی نہیں لگتی، شلم، ٹنڈے دیکھ کے تمہارا منہ بنتا ہے، بیکن کو نرم ہا تھہ ر لگاؤ۔“

خرم بے خیالی میں بولا۔

”اماں! گوشت کیوں نہیں پکایا؟“

اماں جھلا کر بولیں۔

”گوشت آج ملتا بھی ہے، کیا اپنی بوٹیاں نوچ کر پکا دیتی؟“

خرم پھینپ کر بولا۔

”ارے! مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔“

پھر بھاتی میاں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”ویسے بھاتی میاں! انسان کا گوشت کیسا ہوتا ہے؟“

”کون سی کہانی کی کتاب؟“

”وہی جو میں اپنی دوست فرحانہ سے لائی تھی“

”اب تم یہاں بیٹھ کر کہانی کی کتاب پڑھو گی۔“

”تو کیا ہوا؟“

”ہوا کیسے نہیں، تم اتنی اونچی آواز سے پڑھتی ہو دوسرے لوگ ڈسٹرب ہوتے ہیں۔“

”تو پھر میں کہاں جاؤں؟“

”مجھے کیا معلوم؟“

”میں تو یہیں پڑھوں گی، آخر یہ ہم تینوں کا کمرہ ہے۔“

عفت نے سوچا۔

”کتنی تو ٹھیک ہے، مجھے کیا حقیقت ہے فوزی کو اس کمرے سے نکالنے کا۔“

کچھ ترنم پڑ کر بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے، مگر اونچی آواز سے مت پڑھنا“

فوزی نے بڑی سعادت مندی سے سر ہلایا۔

یہ جھگڑا آتے دن کا تھا۔ اسی طرح فوزی کو جھاڑ پڑتی تھی، تنبیہ کی جاتی تھی۔

جونہی یہ خیال آتا تھا کہ یہ کمرہ سعیدہ باجی، عفت اور فوزی کا مشترکہ کمرہ ہے، خاموشی اختیار کر لی جاتی تھی۔

کمرہ بہت زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مگر بہر حال تین افراد کو کسی طرح اس میں گزارا تو کرنا ہی تھا۔ دو چار پائیاں تو کمرے میں دن رات بچھی رہتی تھیں لیکن تیسری چارپائی

بھائی میاں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”پتہ نہیں بیٹے! ہم نے کبھی کھا یا نہیں انسان کا گوشت“

سب ایک دم ہنس پڑے۔ خرم کھسیانا سا ہو گیا۔ بڑی آپا بولیں۔

”پتہ نہیں فرخ! تمہیں کھانا اچھا کیوں نہیں لگ رہا؟“

فرخ بھائی کچھ نہیں بولے۔

”بھائی میں تو بہت مزے دار لگ رہا ہے، اس قدر چٹپٹا کھانا پکا یا ہے اماں نے۔“

سعیدہ باجی بھی بولیں۔

”ہاں بالکل، وال سبزی کوئی سی بھی ہو چٹٹی ہونی چاہیے اور پھر ہماری اماں

کے ہاتھ میں تو بڑی لذت ہے، کیوں بھائی میاں؟“

سعیدہ باجی نے بھائی میاں سے اپنی بات کی تصدیق کروانا ضروری سمجھا۔

بھائی میاں نے بڑی صاف گوئی سے انکار کیا۔

”ہاں بھئی! تمہاری ماں کے ہاتھ میں بڑی لذت ہے“

اماں سر جھکاتے بھائی میاں اور چھوٹی آپا کے سامنے سے خالی پلیٹیں سیٹے

میں مصروف تھیں۔

عفت کھانا کھا کر کمرے میں آتی تو فوزی دلیوار میں بنی ہوئی الماری میں جانے

کیا کھکھوڑ رہی تھی عفت کو غصہ آگیا۔ فوزی کے قریب جا کر بولی۔

”بھئی فوزی! میں نے کل ہی کتابیں ٹھیک کی ہیں تم پھر تتر بتر کر رہی ہو۔“

”میں اپنی کہانی کی کتاب ڈھونڈ رہی ہوں۔“

صبح کے وقت نکال کر آگن میں ڈال دی جاتی تھی۔ رائٹنگ ٹیبل ایک ہی تھی اور کمرہ سی بھی ایک ہی تھی۔ اب چاہے وہاں بیٹھ کر سعیدہ باجی لکھیں پڑھیں یا عفت یا پھر فوزی اس پر قبضہ جا کر بیٹھ جائیں۔ آٹے سامنے کی دیواروں میں دو الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ جس میں تینوں کی کتابیں اور ضرورت کی دوسری چھوٹی موٹی بے شمار چیزیں رکھی رہتی تھیں۔ دو سال قبل بھائی میاں نے الماریوں میں لکڑی کے پٹ لگوا دیئے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے تو الماری میں رکھی ہوئی ساری چیزیں فوزی کے ہاتھوں بکھر کر ہر وقت منہ چڑایا کرتی تھیں۔ غنیمت تھا کہ گھر میں ایک اسٹور روم بھی تھا، گھر کے سارے افراد کے صندوق اور سردیوں میں استعمال کے تھانے والے گدے اور لحاف اسی اسٹور میں رکھے رہتے تھے۔ ورنہ ہر کمرے میں ان چیزوں کا اضافہ بھی ہو جاتا لکھڑکیوں اور دروازوں پر بے حد معمولی قسم کے پردے پڑے رہتے تھے۔ جن کے رنگ دھل دھل کر اور دھوپ کی تمازت سے عام طور پر پاڑے رہتے تھے۔ رائٹنگ ٹیبل پر کسی نہ کسی کے ہاتھ لگا رہا ہوا میز پر نش چھلکتا تھا۔ جسے اکثر فوزی دوست شنائی گرا کر خراب کر کے کرتی تھی۔

یہی حال بڑی آپا اور چھوٹی آپا کے کمرے کا تھا۔ فرخ بھائی اور خرم کے کمرے کا حال بھی اس سے کچھ جدا نہیں تھا۔

بڑی آپا کو مرسوس ملی تو تنخواہ ملنے سے پہلے ہی انہوں نے گھر کا حلیہ بدل کر پروگرام دل ہی دل میں بنالیا، لیکن اماں کے سر پر گھر کا حلیہ بدلنے کی فکر نہ بھی کہیں ریا دہ بڑی فکر سوار تھی اور وہ فکر تھی۔ بیٹیوں کا جینہ جوڑنا، ایک

پرے پانچ پہاڑان کے شانوں کے اوپر کھڑے تھے۔ بھائی میاں کی کمائی تن دھانپنے پیٹ کا دوزخ بھرے، آٹے گئے کے چائے پانی پر خرچ کر لے اور تیرے میرے گھروں میں آٹے دن ہونے والی تقریبات میں یوں اٹھ جاتی تھی کہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ پھر بیٹیوں کا جینہ جوڑنے کے لئے اماں کیوں کر اور کس طرح بچت کرتی تھیں۔

بڑی آپا نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، اماں کی بہت منت سماجت کی کہ کچھ رقم تو آپ ہر ماہ گھر کی چیزیں لاتے کے لئے دے دیا کریں۔ مگر اماں کے اوپر اس منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

ہاں بڑی آپا کو اس بات کی اجازت ضرور تھی کہ وہ اپنے کالج جانے کے لئے بے شک اپنی پسند اور مرضی کے لئے کپڑے بناتی رہیں۔ سال بھر اسی طرح گزر گیا، دوسرے سال کے بھی پچھ سات ماہ گزر گئے۔ اماں کا انداز وہی گا رہی رہا۔ پھر بڑی آپا نے فرخ بھائی سے کہا کہ وہی اماں کو سمجھائیں۔

فرخ بھائی نے ایسا شوشہ چھوڑا کہ اماں ان کی بات پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ فرخ بھائی کی بابت واقعی اماں کے دل کو لگی تھی۔ انہوں نے بہت بد و بار بن کر اماں سے کہا۔

”اماں! اجنبی تو اب تک آپ نے کافی جوڑ لیا ہو گا اب بڑی آپا کے برکی بھی فکر کیجئے۔“

اماں فوراً منگائی کا روزا رونے بیٹھ گئیں۔

”کہاں کافی جوڑ لیا، اس منگائی نے تو کہیں کا نہ چھوڑا“

” لوگ اس طرح انکار کرتے رہیں گے اماں۔“

اماں سہم کر بولیں۔

” اے ہے! خدا نہ کرے، کیسی بد خیال منہ سے نکالتے ہو۔“

” میں سچ کہہ رہا ہوں اماں،“

اماں کو ایک دم غصہ آگیا۔ ڈانٹ کر بولیں۔

” اچھا بس چپ ہو جاؤ۔“

” آپ پہلے میری پوری بات تو سن لیں اماں،“

” پھر کچھ اول فول بک دو گے،“

” نہیں اماں! بڑے پتے کی بات بتانے والا ہوں میں۔“

اماں بیزار سی ہو کر اٹھنے لگیں تو فرخ بھاتی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالید

” ارے چھوڑ لو گے! مجھے بہت کام کرنے ہیں،“

” پہلے آپ میری بات سنیں۔“

” سناؤ“

” دیکھتے اماں! بات اصل میں یہ ہے کہ جب تک آپ اپنے گھر کا نقشہ

نہیں بدلیں گی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔“

” صاف صاف بات کہو“

” لوگ آئیں گے، کھائیں گے، پئیں گے، منہ پونچھ کر چل دیں گے اور پلٹ کر

کوئی جواب بھی نہیں دیں گے“

اماں کچھ سوچنے لگیں۔

” پھر بھی کیا کچھ بنالیا آپ نے؟“

” کیا بتاؤں بیٹے؟ بازار جاؤ تو غفلت گ رہ جاتی ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ

کیا خریدو اور کیا نہ خریدو“

” کوئی رشتہ بھی آیا بڑی آپا کا یا آپ جہیز ہی جمع کئے جلد ہی ہیں۔“

” رشتہ بھی آجائے گا، ہر کام کا وقت مقرر ہے“

” کسی سے کہہ رکھا ہے آپ نے؟“

” ساتھ والے گھر میں جو بڑا کام کرنے آتی ہیں۔ ان سے کہا ہے اور بھی دو

ایک پڑوسنوں سے کہہ رکھا ہے۔“

پھر ایک دم اماں کو کچھ خیال آیا۔ وہ چونک کر بولیں۔

” اے ہے! تم کیسے انجان بن رہے ہو۔ بڑا دور رشتے لے کر آئی تو تھیں

کے لئے، عزتیں دیکھنے نہیں آئی تھیں شائستہ کو؟“

فرخ بھائی اکیلنگ کرتے ہوئے بولے۔

” اچھا! ہاں! میں تو بھول ہی گیا تھا مگر۔۔۔۔۔“

اماں نے پوچھا۔

” مگر کیا؟“

” ہو! کیا ان رشتہ توں کا؟“

اماں بڑی سادگی سے بولیں۔

” ان لوگوں نے تو انکار کر دیا“

فرخ بھاتی فوراً اصل موضوع کی طرف آکر بولے۔

”بات یہ ہے اماں! کہ آج کل لوگ گھر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، گھر سے ہی اندازہ لگا لیتے ہیں کہ ان لوگوں کے رہن سہن کا معیار کیا ہے، یہاں سے کچھ ملنے کی امید بھی ہے یا نہیں۔“

شاید اماں کے دماغ میں فرخ بھائی کی بات کچھ کچھ جگہ بنا رہی تھی جیسی وہ بڑی گہری سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں اور عفت کو فرخ بھائی کی شکل دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔ کیسے بدتر بنے بیٹھے تھے۔ فرخ بھائی نے عفت کو مسکراتے دیکھا تو مصنوعی ناراضگی سے بولے۔

”تم کیا سن رہی ہو بیٹی ہوئی، چلو جاؤ، اپنا کام کرو۔“

عفت ڈھیسٹ بنی بیٹھی رہی۔

فرخ بھائی اماں سے غائب ہو کر بولے۔

”پھر کیا سوچا آپ نے اماں؟“

”تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔“

”بس تو پھر میرا خیال ہے۔ پہلے ڈرائنگ روم کی طرف توجہ دیجئے“

”ہاں! پھر آہستہ آہستہ باقی گھر بھی ٹھیک ہو جائے گا،“

فرخ بھائی خوش ہو کر بولے۔

”ہاں! اب کی نا آپ نے کام کی بات“

اس دن کے بعد سے اماں پر گھر ٹھیک کرنے کی دھن سوار ہو گئی۔ فرخ بھائی اور بھائی میاں کے ساتھ جاکر اماں نے خود فرنیچر پسند کیا ایک ہی میزینیں فرنیچر آگیا اور دوسرے پیچھے درگاہ سے بڑے خوبصورت نفیس پردے اور چند

دوسری گھر بلو چیزیں آگئیں۔

ہونے والی بات اپنے وقت پر ہو کر رہتی ہے۔ لیکن ہوا یوں کہ اس دفعہ ساتھ والی ہمسائی نے بڑی آپا کے لئے جوڑے تیار کیا، اس نے بیچ بیچ کام کر دیکھا یا فرسٹ کلاس گزٹڈ افسر کی ماں ہمنوں کو بڑی آپا کچھ اتنی زیادہ پسند آئیں کہ وہ دوسرے ہی روز انگوٹھی پہنانے پر مصر ہو گئیں۔ مگر اماں کو ایسی جلد بازی قطعی پسند نہیں آئی۔ آخر انہیں بھی تو لڑکے کو دیکھنا اور اس کے بارے میں سے معلومات حاصل کرنے کی تھیں۔ اماں نے جب بڑے شائستہ لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تو اپنی جلد بازی پر وہ لوگ واقعی جھینپ گئیں۔

اگلے دن وہ صاحب بہادر بڑے گھر کے لئے آئے۔ چھوٹی آپا اور سعدیہ باجی نے فوراً بڑی آپا کو بلا نفیس مشورہ دیا کہ وہ برآمدے میں کھٹنے والی ڈرائنگ روم کی کھڑکی کی بھری سے جھانک کر دیکھ لیں۔ چھوٹی آپا، سعدیہ باجی اور خود عفت پہلے ہی ناک جھانک کر چکی تھیں اور انہیں پاس بھی کر چکی تھیں، وہ ایک دفعہ کہنے لگا تو بڑی آپا کے اوپر کچھ اثر ہی نہیں ہوا۔ اسی طرح بیٹھی رہیں۔ شس سے مس نہ ہوئیں، لیکن جب زبردستی انہیں کھینچ کھا کچ لایا گیا تو انہوں نے کچھ جھینپتے، کچھ ہچکچاتے ہوئے ناک جھانک کر نہی لی۔ لیکن اس کے بعد منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ گئیں۔ تینوں ہمنوں نے چاہا کہ وہ شرافت سے بتا دیں کہ آیا انہوں نے صاحب بہادر کو پسند کیا ہے یا نہیں۔ لیکن شاید اس وقت وہ شرافت کی زبان سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔ جب چھوٹی آپا اور سعدیہ باجی نے انہیں لگدگانے کی دھمکی دی تو انہوں نے اقرار رضا مندی کیا۔

پھر بھائی میاں نے صاحب بہادر کے متعلق معلومات کرنی شروع کر دیں
خدا کا شکر تھا کہ ان کے بارے میں کوئی ایسی بات سننے میں نہیں آئی جو اس رشتے کی
راہ میں رکاوٹ بنتی۔ اگلے ہی جمعہ کو وہ خوانین آکر بڑی آپا کی انگلی میں توصیفہ
کے نام کی انگوٹھی پہنا کر منہ بیچھا کر گئیں بنگنی کار و اج نہ ان لوگوں میں تھا نہ ہی
اماں اور بھائی میاں اس رسم کو ضروری خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ رسم
بڑی فضول خرچی تھی۔ بس بات پکی ہو گئی۔ طے یہ پایا کہ سعید باجی کے ایم۔ اے
فائنل کے امتحانات سے پہلے ہی پہلے بڑی آپا کی شادی ہو جائے گی۔ توصیفہ
کے گھر والے تو اور بھی جلدی کر رہے تھے۔ مگر عفت اور خرم کے امتحانات
وجہ سے اماں اور بھائی میاں راضی نہیں ہوئے۔

بڑی آپا کی بات یوں اچانک بدلتی ہوئی تو اماں ایک بار پھر یہ سوچنے
مجبور ہو گئیں کہ قریح بھائی نے انہیں بڑا مفید مشورہ دیا تھا۔

سعید باجی اس سال اپنے ڈیپارٹمنٹ کی نائب صدر تھیں۔ یونین کے انتخابات
میں انہوں نے بھاری ووٹوں سے اکثریت حاصل کی تھی۔ ان کی ہر دلعزیزی کو دیکھتے
ہوئے زیادہ تر لوگوں کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ نمایاں کامیابی حاصل
کریں گی۔ آٹے دن کی تقریبات کی وجہ سے ان کی پڑھائی کا خاصا حرج ہو رہا تھا۔
عفت اور بھائی میاں کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ ان فنکشنز کے چکرتے میں سعید
باجی کو کہیں اپنی پوزیشن سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔ پریلوئس میں ان کے نمبر سب
سے زیادہ تھے۔ لیکن اس سال عفت کو یہ بات مشکل ہی نظر آ رہی تھی کہ وہ
بہتر نمبر حاصل کر سکیں گی۔

خود عفت اپنے ڈیپارٹمنٹ کی یونین کی جوائنٹ سیکرٹری تھی۔ لیکن اس کا
کام اتنا زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنی پڑھائی کی طرف زیادہ توجہ نہ
دے سکے۔

عفت سوچنے لگی۔

”کس قدر دشوار ہے یہاں پڑھنا،
جانے کیوں سعدیہ باجی کے متعلق یہ خبر سن کر اسے چپ سی لگ گئی تھی۔
اس نے سوچا۔

”معلوم نہیں، سعدیہ باجی کو اس بات کی خبر ہے کہ نہیں،“

اس روز سعدیہ باجی اس سے پہلے ہی گھر چلی گئی تھیں۔ امتحانوں سے فارغ
ہونے کے بعد آج وہ کئی دنوں کے بعد یونیورسٹی آئی تھی۔ سیمینار کی اپنا راج کے
ساتھ مل کر اسے کتابیں ترتیب دینی تھیں۔ وہ گھر پہنچی تو سعدیہ باجی کانا کھا
رہی تھیں۔ وہ بھی ساتھ دھو کر ان کے ساتھ کانا کھانے بیٹھ گئی۔ سعدیہ باجی
نے محسوس کیا کہ وہ روز کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی چپ ہے۔
انہوں نے پوچھا۔

”سب خیریت تو ہے نا عفت!“

”جی! سب خیریت ہے۔“

”پھر اس قدر خاموشی کا سبب؟“

عفت بغیر کس غمید کے ابک دم پوچھ بیٹھی۔

”سعدیہ باجی؟ سر سلیمان کیسے ہیں؟“

سعدیہ باجی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”میں نے پوچھا ہے سر سلیمان کیسے ہیں؟“

وہ اپنے سیکنڈ ایئر کنزرو کے امتحانوں سے فارغ ہوتی تو اسے سعدیہ باجی
کے متعلق ایک نئی بات معلوم ہوئی۔

اس روز وہ اور سعدیہ باجی دبیر سے یونیورسٹی پہنچی تھیں۔ سعدیہ باجی فوراً
اپنی کلاس امیڈ کر کے چل دیں اور عفت، رخصتہ کے ساتھ سیمینار کی طرف چل دی
راتنے میں رخصتہ نے بڑے رازدارانہ انداز میں اسے بتایا کہ سعدیہ باجی کے
ایک پروفیسر صاحب ان کے نئے بے حد سنجیدہ ہو گئے ہیں، عنقریب ہی ان کا
پروپوزل آماں اور بھائی میان تک پہنچایا جائے والا ہے۔

عفت نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تمہیں کس نے بتائی یہ بات؟“

”بس یہ نہ پوچھو، بڑا لمبا راستہ طے کر کے مجھ تک پہنچی ہے یہ بات“

”پھر بھی کچھ تو پتہ چلے“

”جی سر سلیمان کی ایک کنزن میری ایک کنزن کی دوست ہیں، سر سلیمان کی

بہن نے یہ بات اپنی کنزن کو بتائی۔ ان کنزن صاحبہ نے میری کنزن کو بتائی، میری

کنزن نے مجھے بتائی اور میں نے نہیں بتادی۔“

عفت نے کہا۔

”واقعی! راستہ بڑا لمبا ہے“

”ہاں! مگر تم یہ دیکھو، کیریونیورسٹی میں بات کس طرح پھیل جاتی ہے“

”کیا اور بھی کئی لوگوں کو معلوم ہے یہ بات؟“

”میرا خیال ہے کئی لوگوں کو اندازہ ہے۔“

”کیوں؟ سرسیلمان کو کیا ہوا ہے؟“

”آپ کو نہیں پتا انہیں کیا ہوا ہے؟“

”میرے آنے تک تو وہ بالکل ٹھیک تھے، کیا میرے بعد خدا نخواستہ

کوئی حادثہ ہو گیا؟“

سعیدہ باجی سچ بچ بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ عفت نے بے حد

سنجیدگی سے کہا۔

”حادثہ تو بے شک ہوا ہے ان کے ساتھ، لیکن آج نہیں بہت پہلے۔“

”کیسی الٹی باتیں کر رہی ہو تم۔“

”باتیں تو میں بالکل سیدھی کر رہی ہوں۔“

”ٹھیک ٹھیک بتاؤ، کیا بات ہے؟“

”سرسیلمان آپ کو پروپونز کرنے والے ہیں۔“

”کیا!!!؟ سعیدہ باجی حیران ہو کر بولیں۔“

”اتنی حیرت زدہ کیوں ہو رہی ہیں؟“

”بات ہی حیرت زدہ ہونے کی ہے۔“

”تو پھر پہلے اچھی طرح حیرت زدہ ہو لیجئے۔“

”تم سے کس نے یہ بات؟“

”رخشنده نے۔“

”رخشنده کو کس نے بتائی؟“

پھر عفت نے وہ سب کچھ سعیدہ باجی کے گوش گزار کر دیا جو رخشنده

نے اسے بتایا تھا۔

سعیدہ باجی اپنی پلیٹ ایک طرف سرکا کر ہولقی بنی عفت کو تنکے جسا رہی تھیں۔

سعیدہ باجی پوری بات سن کر بولیں۔

”یار! یہ تو گڑبڑ ہو گئی، ان کو کس ترکیب سے روکا جاتے“

”آخر کیوں روکا جاتے؟ اتنے اچھے سے تو ہیں۔“

”اچھے تو بے شک ہیں مگر۔۔۔۔۔“

وہ کچھ کہتے کہنے رک گئیں۔

”مگر؟“

”میں تو کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔“

”کیا!!!؟“

اب عفت کے حیران ہونے کی باری تھی۔

”کون ہے وہ“

”یار! وہ دردانہ ہے تا! میری کلاس فیلو۔“

”کیا مطلب ہے؟ آپ دردانہ سے شادی کریں گی؟“

عفت نے انہیں چھیڑا۔

”الحق ہو تم، پوری بات تو سن لو،

”سنائیے۔“

”دردانہ کے بھائی ہیں۔“

”سوال یہ ہے کہ صرف آپ کے پسند کرنے سے کیا ہوتا ہے؟“

سعیدہ باجی بڑے موڈ میں آکر بولیں۔

”جاؤ جی! ہم ایسے نہیں ہیں کہ خود کسی کو پسند کر کے بیٹھ جائیں، پہلے انہوں نے ہمیں پسند کیا تھا“

عفت نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

”اچھا! وہ کس طرح؟“

”ہم دردانہ کے گھر گئے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا۔“

”اچھا پھر؟“

”پھر دوبارہ دیکھا، سہ بارہ دیکھا۔“

”اچھا بھئی! مان لیا کہ کئی بار دیکھا، آگے کیا ہوا؟“

”پھر انہوں نے اپنی امی سے کہا کہ امی! آپ کو میرے لئے لڑکی کی تلاش

کرتی تا! دردانہ کی سہیلی مجھے پسند ہے۔“

عفت نے کہا۔

”اچھا! بڑے بے شرم ہیں۔ اپنی امی سے اس طرح کہہ دیا۔“

”بے شرمی کی کیا بات ہے، امی سے نہ کہتے تو پھر کس سے کہتے؟“

”اپنی بہن سے کہہ دیتے۔“

”بہن سے بھی کہا تھا۔“

”یقیناً بات بحیثیت بھی ہوتی ہوگی۔ آپ دونوں میں۔“

”زیادہ تو نہیں۔“

”پھر بھی کچھ تو ہوئی ہوگی۔“

سعیدہ باجی جھینپ کر بولیں۔

”ہاں۔“

”آپ ہیں بڑی استاد سعیدہ باجی۔“

”استاد کی کیا بات ہے؟“

”معاذ اتنی دوز تک پہنچ گیا، آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔“

”یار! کیا کہتی؟ شرم آتی تھی۔“

”شرم کس بات کی؟“

”اب دیکھو نا! چھوٹی بہن سے یہ کہنا اچھا تو نہیں لگتا کہ ہم فلاں شخص کو

پسند کرتے ہیں۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ بات غلط کہتی ہیں کہ آپ مجھے اپنا دوست

سمجھتی ہیں۔“

سعیدہ باجی گھبرا کر بولیں۔

”ارے نہیں بھئی! اب تم غلط مطلب رکالنے مت بیٹھ جاؤ۔“

”اچھا خیر! یہ تو بتا دیجئے کہ وہ ہیں کیسے؟“

”نہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں کس قسم کے مرد پسند کرتی ہوں، بس اتفاق سے

ویسے ہی ہیں۔“

”بڑی لٹی ہیں آپ، کہہ تے کیا کہتے ہیں؟“

”انجینئر ہیں۔“

”اور نام کیا ہے؟“

”اشفاق“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی تین چار ماہ بعد چل دیں گی۔“

”کہاں چل دوں گی؟“

”اشفاق صاحب کے گھر“

سعیدہ باجی گھر اکہ بولیں۔

”نہیں بھئی! اتنی جلدی جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”عذرا باجی مجھ سے بڑی ہیں پہلے ان کی شادی ہونی چاہیے۔“

”وہ تو جب تک ڈاکٹر نہیں بن جائیں گی۔ شادی کریں گی ہی نہیں“

”ہاں تو ٹھیک ہے، ڈاکٹر بن جائیں، ان کی شادی ہو جائے، اس کے بعد

اپنا سلسلہ ہونا چاہیے۔“

”ڈاکٹر بنتے ہی مختوڑی شادی ہو جائے گی ان کی، ان کے لئے کون سا

آیا ہوا ہے جو آپ اس قند پر امید ہیں“

”اللہ مالک ہے، ہو سکتا ہے جب تک ان کے لئے کوئی رشتہ

ہی جائے۔“

”لیکن اماں کے کان میں اگر بھنبک بھی پڑ گئی دردانہ کے گھر والوں کے ادا

کی، تو وہ یہ نہیں دیکھیں گی کہ آپ چھوٹی آپا (عذرا باجی) سے چھوٹی ہیں“

سعیدہ باجی سوچ رہی ہیں۔

”وہ تو جھٹ پٹ آپ کا بیاہ کر دیں گی۔“

”ہاں ایہ تو تم نے صحیح کہا گئیں دردانہ کو پٹی پڑھا دوں گی“

”کیا پٹی پڑھا دیں گی؟“

”اشفاق باہر جانے والے ہیں، شاید آٹھ ماہ کا کوئی کورس ہے، بس میں دردانہ

سے کہہ دوں گی کہ اپنی امی کو سمجھا کر ان کی واپسی تک اس بات کو ٹال دیں۔“

عفت گھر اکہ لولی۔

”نہیں سعیدہ باجی! ایسی غلطی مت کرئیے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”ان مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہونا، کیا خبر واپسی میں کوئی میم ہی بنگل میں

دبالاتیں۔“

”نہیں یار! ایسی بھی کیا بے اعتباری“

”سمجھانا میرا کام ہے، آگے آپ کی مرضی“

”چلو، اللہ مالک ہے، اگر قیمت میں یہی لکھا ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔“

سعیدہ باجی سنجیدہ ہو گئیں۔

عفت نے کہا۔

”اچھا! اب یہ بھی تو سوچئے کہ سر سید مان کے گھر والوں کو کس طرح روکا جائے؟“

”ارے ہاں! یہ تو میں بھول ہی گئی تھی“

”میرا خیال ہے کہ ان سے یہی کہا جائے کہ آپ کی بات سچی ہو گئی ہے۔“

”مگر کیسے کہیں گے؟“

”بھئی! جن جن لوگوں کی زبانی یہ بات ہم تک پہنچی ہے، انہی لوگوں کی زبانی ہماری بات سرسلیمان تک بھی پہنچائی جاسکتی ہے۔“

”بس! پھر تم کل ہی رختندہ کو بتا دو،“

”ویسے باجی! سرسلیمان کو افسوس بہت ہوگا،“

”گھر میں بھی تو غبور ہوں۔“

عفت ٹھنڈی سانس بھر کر مسکرائی۔

”ہاں! واقعی، دل بڑی ظالم چیز ہے، کس قدر غبور بنا دیتا ہے انسان کو۔“

سعدیہ باجی کو ہنسی آگئی۔

”مجھے تو سرسلیمان بہت اچھے لگتے ہیں،“ عفت نے کہا۔

”پھر کیا خیال ہے تمہاری شادی کروادی جاتے ان سے؟“

”کوئی اچھا لگے تو اس کا یہ مطلب کھوڑی سہے کہ اس سے شادی بھی ضرور

رچا لی جاتے۔“

”میرا تو یہی خیال ہے کہ اگر کوئی اچھا لگے تو اس سے شادی کر

لینی چاہیے۔“

”چاہے وہ خود آپ کو پسند کرے یا نہ کرے۔“

سعدیہ باجی خاموش ہو گئیں۔

سعدیہ باجی کی بات سنی جانے کی خبر جب سرسلیمان تک پہنچی تو ان کے دل پر کیا گزری یہ تو وہی ہنر جانتے ہوں گے جس لڑکی کو وہ چپکے چپکے

شرافت کے ساتھ چاہے چلے جا رہے تھے اور جس کے متعلق انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے اپنا شریک سفر بنائیں گے، وہ کسی اور کی تھی اس بات کا انہیں بتنا بھی غم ہوتا کم تھا۔ لیکن سعدیہ باجی بے چاری واقعی چوری بن گئیں۔ سرسلیمان کا سامنا کرنے سے گھرانے لگیں۔ سرسلیمان سے انہیں محبت ہوئی یا نہیں ہوئی۔ یہ تو ایک الگ بات تھی۔ لیکن ان کی عزت سعدیہ باجی کے دل میں کچھ اور بڑھ گئی۔ ان کی شرافت کی وہ کچھ اور زیادہ مداح ہو گئیں۔

عفت نے ایک روز یونہی سعدیہ باجی کو چھیڑا۔

”وہ آپ کے سرسلیمان کے کیا حال ہیں؟“

”ارے یار! عفت! کیا بتاؤں، میں تو مجرم سی بن گئی ہوں۔“

”کیوں؟ خیریت؟“

”وہ تو مجھے بڑی جذباتی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔“

”آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”ایک تو آپ نے ان بے چاروں کو بالکل بالوس کر دیا اور پھر آپ

چاہتی ہیں کہ وہ آپ کو جڑ باتی نظروں سے بھی نہ دیکھیں۔“

سعدیہ باجی ہنس کر بولیں۔

”اڑا الو مذاق۔“

”اصل میں بات یہ ہے کہ شرافت کا زمانہ ہی نہیں ہے۔“

”ان کی شرافت کی تو میں بھی قائل ہوں۔“

” چلتے! اتنا بھی غنیمت ہے“

” نہیں یاد! میں ان کی عزت بھی بے حد کرتی ہوں۔“

” خالی خولی عزت کا وہ بے چارے کیا کریں گے؟“

” تو پھر تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟“

” آپ کہہ ہی کیا سکتی ہیں؟ اشفاق صاحب کی محبت نے آپ کو کسی قابل پھوڑا ہوا تو آپ کچھ کریں بھی“

” بس! میں سچے دل سے ان کے لئے دعا کروں گی کہ ان کو اتنی پیاری سی بیوی ملے کہ میں کبھی بھول کر بھی ان کو یاد نہ آؤں“

” آہن، تم آہن۔“

عفت نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور دونوں ہی اپنی باتوں پر مسکرا پڑیں۔ سعدیہ باجی کے امتحان ختم ہوئے تو بڑی آپا کی شادی ہو گئی۔ بڑی آپا ویسے بھی خاصی خوش شکل تھیں۔ دلس بن کر تو ان پر بے حد روپ چڑھا تھا۔ اماں نے اپنے سلیقے سگھڑاپے سے بڑا اچھا جینہ بنایا تھا۔ بارات والے دن بھی ہر انتظام اپنی جگہ بالکل مکمل تھا۔ لیکن ہانسی بنانے والے لوگ پھر بھی اپنی حرکت سے باز نہ رہ سکے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر کوئی نہ کوئی اعتراض کی بات نکال ہی لی۔ اماں اور بھائی میاں نے ایسی باتوں کی پرواہ نہ کرنی چھوڑ دی تھی ان کا کہنا تھا کہ ایسی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دینا چاہیئے۔ جہاں چار آدمی جبا ہوتے ہیں وہاں اس قسم کی باتیں ہونا لازمی ہے زمانے کی ریت یہی ہے۔

بڑی آپا اپنے گھر خیر خیریت سے سدھاریں تو سعدیہ باجی کی شامت اگے

حالا کہ انہوں نے اپنی دوست دروازہ کو بڑی پیٹی پڑھائی تھی۔ کہ اپنی امی کو سمجھا بچا لے رکھا۔ مگر ان کی اتنا اپنی تھیں کہ اگر شادی نہیں تو ان کے بیٹے کے باہر جانے سے پہلے منگنی ضرور کریں گی۔ دو، تین دفعہ وہ محض رسمی طور پر اماں سے ملنے آئیں اور سعدیہ باجی کی شان میں قصیدے پڑھ گئیں۔ چونکہ باجی بار آور باقاعدہ پیغام دے دیا۔ اماں بے چارہ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ان کی بیٹی کو یوں بیٹھے بھنائے اتنا اچھا بھلا جائے گا۔ اپنی بے پناہ خوشی کو چھپانا انہیں اس وقت کتنا دشوار لگ رہا تھا۔

بھائی میاں تک بھی یہ بات پہنچی۔ انہوں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ دو، تین دن بعد اشفاق صاحب مردکھاوے کے لئے بلائے گئے۔ عفت نے

بھی انہیں دیکھا۔ وہ سچ سچ سعدیہ باجی کے خیالوں کے جیتے جاگتے شہزادے تھے۔ سالوے، لمبے اور شاندار صحت کے مالک۔ ناک نقشہ اگر چہ سا نکھے میں

ڈھلا ہوا اور بہت خوبصورت نہیں تھا لیکن ہر چیز اپنی جگہ مناسب تھی۔

بردکھاوے میں تو اشفاق بھائی کو کامیابی کا سرٹیفکیٹ ملنا ہی تھا لیکن ابھی

بھائی میاں کو ان کے بارے میں چچان بین بھی کرنی تھی۔ اس مرحلے سے گزرنے

کے بعد سعدیہ باجی کی منگنی کا دن اور تاریخ مقرر ہو گئی۔ دروازہ کی امی نے خاصی

دھوم دھام کی تھی۔ مجبوراً اماں اور بھائی میاں کو بھی اہتمام کرنا پڑا۔

منگنی کے تقریباً ایک ماہ بعد اشفاق بھائی انگلینڈ چلے گئے اور سعدیہ باجی منگنی

کی خوبصورت انگوٹھی انگلی میں سبائے آنے والے دنوں کے سینے دیکھنے لگیں۔

سر فرست تھیں۔ ہر طرف سے ان کے اوپر داد و تحسین کے ٹونگمے برس رہے تھے جب سے سعید باجی نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا۔ فرخ بھائی کے ساتھ بھائی میاں بھی جبرست زدہ تھے کیونکہ اسکول اور کالج کے زمانے میں سعید باجی پڑھائی میں اتنی زیادہ ہوشیار نہیں تھیں۔ دوسری سرگزیموں میں بے شک پیش پیش رہتی تھیں لیکن یونیورسٹی میں اکملان کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ مضمون کا انتخاب بھی تھا۔ نفعیات کا مضمون انہیں شروع ہی سے پسند تھا۔

دزلٹ کے بعد سعید باجی اس فکر میں تھیں کہ بڑی آپا کی طرح انہیں کسی لالچ میں لکچر رشپ مل جائے انہیں کیا خبر تھی کہ اس معاملے میں ان کی قسمت بڑی آپا سے بھی اچھی تھی۔ ان کا دزلٹ آئے بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ڈیپارٹمنٹ میں ہی ان کا تقرر ہو گیا۔ سعید باجی کو تو جو خوشی ہوئی وہ اپنی جگہ تھی ہی۔

آماں اور بھائی میاں بھی مارے خوشی کے نہال ہو گئے۔

خدا کس قدر مہربان ہو رہا تھا ان کے اوپر۔

جس روز سعید باجی کا تقرر ڈیپارٹمنٹ میں ہوا۔ عفت کو خوشی کے ساتھ ساتھ

سر سلیمان پر رحم بھی آیا۔

اس نے سوچا۔

اگر سعید باجی یہاں سے پڑھ کر چلی گئی ہوتیں تو سر سلیمان کسی نہ کسی طرح انہیں معاف ہی دیتے۔ مگر اب تو پھر سعید باجی کے سر سلیمان کی نظروں کے سامنے رہنے کا امکان ہو گیا تھا۔

کیا گزرے گی بے چاروں کے دل پر؟

سعید باجی اور عفت کا دزلٹ آنے میں ابھی جانے کتنے مہینے باقی تھے۔ یہ بیٹھنا سخت مشکل لگتا تھا سعید باجی نے انڈسٹریل ہوم جانا شروع کر دیا اور نسائی کٹائی کی ماہر ہونے کی ٹھان لی۔ عفت پر لاپٹنگ سیکھے کا جنون سوار ہو گیا۔ پہلے عفت کا دزلٹ آیا۔ وہ تمام پیرچوں میں پاس ہو گئی تھی۔ لیکن اپنے غمروں کے بارے میں وہ سخت فکر مند تھی۔

گزشتہ سال اس کے نمبر بہت زیادہ اچھے نہیں آئے تھے۔

اس نے سوچا۔

اگر اس سال بھی نمبر اچھے نہیں آئے تو آنرز (فائنل) میں ڈویژن بنانے کے لئے اسے بڑی محنت کرنی پڑے گی۔

سعید باجی کو اپنے دزلٹ کی کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ وہ اس طرح مطمئن تھیں جیسے میدان اس بار بھی انہی کے ہاتھ ہے گا اور ہوا بھی۔ یہی۔ دزلٹ آیا تو وہ

عفت کا دل ہمدی سے بھر گیا۔

لیکن ہوا یوں کہ — سعدیہ باجی کے تقرر کے چار ماہ بعد ہی سرسلیمان بی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کو ملکیا چلے گئے۔

سعدیہ باجی کے جہیز کی تھوڑی تھوڑی تیاری تو اماں پہلے بھی کر رہی تھیں لیکن ان کی پہلی تنخواہ ملنے کے بعد اماں نے کچھ اور زور و شور سے جہیز بنانا شروع کر دیا۔ سعدیہ باجی یونیورسٹی سے واپس آئیں تو اکثر مشین لے کر بیٹھ جائیں۔ اماں نے سلائی کا زیادہ تر کام ان کے سپرد کر دیا تھا۔ آخر انہوں نے کٹنگ اور سیونگ کا کورس کس دن کے لئے کیا تھا۔

اماں اور بھائی میاں کے لئے اب خوشحالی کا دور آگیا تھا ان کے صبر و قناعت کا پھل انہیں ملنا شروع ہو گیا تھا۔ خود ٹیلیفون اٹھا کر انہوں نے اولاد کو تعلیم دلائی تھی۔ اب وہی تعلیم ان کی ٹیلیفون کو آہستہ آہستہ ختم کر کے ان کے سکھ کا باند بن رہی تھی جب سے سعدیہ باجی نے سروس کی تھی۔ گھر کی حالت اور بھی زیادہ اچھی ہو گئی تھی۔ بھائی میاں چند سال بعد ریٹائر ہونے والے تھے۔ مگر انہیں اپنے بچوں کے مستقبل کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا وہ مطمئن تھے کہ ان کی اولاد رفتہ رفتہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو رہی تھیں، آئندہ ایک ٹیڑھ سال میں ہی چھوٹی آٹا ڈاکٹر اور فرخ بھائی انجینئر بننے والے تھے۔ حرم بھی اب لالچ اسٹوڈنٹ تھا۔ فوزی نے اسی سال نويس کا امتحان دیا تھا۔

عفت تھرڈ ایئر (آنر) میں آئی تو انتخابات میں اسے یونیورسٹی یونین کی جوائنٹ میکر ٹی منتخب کیا گیا اور انتخابات کے دوران ہی اس کی خاموش پرکھ

زندگی میں ایک ایسا حادثہ ہوا کہ اس کی سوچیں منتشر ہو کر رہ گئیں۔ انتخابی سرگرمیوں کے دوران ہی رخصتہ نے ایک دن دھماکہ خیز انکشاف کر کے اسے پریشان کر دیا۔

اس دفعہ دونوں پوسٹ آفس سے ٹیلیفون کر کے لائبریری کی طرف جا رہی تھیں۔ بڑی آپا نے جانے کیوں دو گھنٹے سے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی اماں ان کے لئے بہت فکر مند تھیں۔ صبح جب عفت یونیورسٹی آنے کے لئے تیار ہو رہی تھی تو اماں نے بڑی آپا کو ٹیلیفون کر کے ان کی خیریت معلوم کرنے کا کام عفت کے سپرد کیا تھا۔ عفت نے پہلے ان کے کالج ٹیلیفون کیا، پتہ چلا وہ دو دن سے کالج نہیں آ رہی ہیں پھر اس نے گھر پر ٹیلیفون کیا تو بڑی آپا کی ساس نے بتایا کہ بڑی آپا تین دن سے غلوں میں مبتلا ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا کہ آج شام کو اماں کے ساتھ بڑی آپا کو دیکھنے چلی جاؤں گی ویسے بھی اسے بڑی آپا کو دیکھنے کافی دن ہو گئے تھے۔ کچھلی دو دفعہ سے ایسا سو رہا تھا کہ بڑی آپا جب بھی گھر آتی تھیں وہ خود اتفاق سے گھر میں نہیں ہوتی تھی۔

اس نے رشتہ بندہ سے کہا۔

”آج میں گھر جلدی چلی جاؤں گی۔“

”آخر کتنی جلدی؟“

”دو پیر ڈائمنڈ کر دیں گی۔“

”اور آج کنسولینک کالیا ہوگا؟“

”نہلا، سزا خانہ اور دوسری بہت سی لڑکیاں ہیں، انہیں سانچے لے لینا۔“

”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔“

”بیکار بکواس نہ کرو۔“

”اب چاہے تم سے بیکار بکواس کہو یا کچھ دیکھو بہر حال! ہم تو نظریں پہناتے ہیں۔“

”اس قدر نظر شناس کب سے ہو گئیں؟“

”پیدائشی نظر شناس ہیں ہم تو۔“

رخشنده نے بڑے غر سے کہا۔

عفت کو ہنسی آگئی لیکن وہ فوراً ہی سنجیدہ ہو کر بولی۔

”دیکھو رخشنده! مجھے اس قسم کا مذاق قطعی پسند نہیں ہے۔“

”کس قسم کا مذاق؟“

”میں نہیں چاہتی کہ میرے نام کے ساتھ کسی کا نام جوڑا جاتے۔“

”تمہارے یا میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟“

”کیوں نہیں ہوتا؟“

”وہ بے چارہ تو چاہتا ہے۔“

”میرا خیال ہے وہ اس قسم کا لڑکا نہیں ہے۔“

”تمہارا خیال غلط ہے، تھوڑے دنوں میں تمہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔“

عفت نے خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ وہ جانے

کے لئے بس اشاپ کی طرف جا رہی تھی۔ کراستے میں اسے ذیشان مل گیا۔ وہ

یا لوجی ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے آرہا تھا اس کے ساتھ گزشتہ سال کا میڈیکل

لیٹریچر امجد عثمان بھی تھا۔ عفت نے کتر اکڑ کر کل جانا چاہا۔ مگر ذیشان امجد عثمان گھبرا

”کیوں؟“

”تمہارا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔“

”ایک دن میری موجودگی نہ سہی۔“

”بس تو پھر آج تمہارے لئے کنویں تک بھی نہیں ہوگی۔“

عفت نے شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایک طرح گھور کیوں رہی ہو؟“

”صرف آج کے لئے معاف نہیں کر سکتیں تم مجھے؟“

”ہم تو خیر معاف کر دیں گے۔ لیکن ذیشان نہیں معاف کرے گا۔“

رخشنده کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔

عفت جل کر بولی۔

”ذیشان کا کیا ذکر ہے یہاں؟“

”اب تم خود ہی سمجھ جاؤ۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تمہیں نظر نہیں آتا۔ کس قدر دل و جان سے کام کر رہا ہے۔“

”تمہارے لئے؟“

”تو کیا ہوا؟ میں اس کے امیدوار ریسمت کے لئے کار نہیں کر رہی؟“

”ہاں ٹھیک ہے، مگر ذیشان کا چکر دوسرا ہے۔“

”کیوں؟ اس کا کیا چکر ہے؟“

”جھٹی اوبوں دل کا معاملہ بھی ہے۔“

اور چھبجیلا ہٹ سوار ہو گئی۔

اس نے سوچا۔

”معلوم نہیں ان سب لوگوں نے مجھے الیکشن کے حینال میں کیوں چھنسا دیا،“
اور اب جب وہ اس میدان میں آگئی تھی محنتی تو اپنی سستی کی وجہ سے ہار
جانا بڑی حماقت تھی۔

اس نے گھر جلدی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سارا دن دھوپ میں اپنے
گروپ کے لڑکوں، لڑکیوں کے ساتھ ماری ماری پھرتی رہی۔

شام کو گھر پہنچی تو اماں اس کے آنے سے پہلے ہی سعدیہ باجی اور خرم کے
ساتھ بڑی آپا کے گھر جا چکی تھیں۔ چھوٹی آپا بھی گھر میں نہیں تھی۔ بھائی میاں، قریخ
بھائی اور فوزی تھے۔ وہ اپنی فائل میز پر ڈال کر نہانے لگی۔ نہانے کی تو شام
کی چائے کا وقت ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں سے شام کی چائے بنانے کی ڈیوٹی فوزی کو
سونپ دی گئی تھی۔ لیکن وہ گھوڑے گدھے پہنچ کر اطمینان سے بڑی گہری نیند
سورہی تھی۔ وہ تولیہ کو کیلے بالوں میں بیسٹ کر باونچی خانے میں آگئی۔

چائے پی کر بھائی میاں اور قریخ بھائی بھی جانے کہاں چلے گئے۔ فوزی کئی
دفعہ اٹھانے کے بعد جاگی اور بڑی دیر تک بستر میں ہی پڑی اینڈ تی رہی۔ پھر
منہ ہاتھ دھو کر چائے پی کر اندر اپنا ہوم ورک کرنے بیٹھ گئی۔ عفت آنگن میں
بنی کیاریوں میں لوٹے بھر بھر کر پانی ڈالنے لگی۔ پھر ایک کونے میں بھیجی چارپائی
کو بیچ آنگن میں گھسیٹ کر ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔ آسمان پر اوڑھے
سرئی اور اعوانی بادلوں کے ٹکڑے ایک کے پیچھے ایک بھاگتے پھر رہے

تیز تیز قدموں سے اس کی طرف آگیا۔
وہ عفت کے قریب آکر بولا۔

”میں شجاع!“

عفت نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”جی۔“

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”گھر جا رہی ہوں۔“

”کیوں؟“

”کچھ کام ہے۔“

”سارے مزدوری کام آئندہ کے لئے اٹھا رکھتے مس شجاع۔“

عفت خاموش رہی۔

ذیشان نے پھر کہا۔

”الیکشن میں اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔“

عفت سوچ میں پڑ گئی۔

گھر میں اسے ایسا خاص کام نہیں تھا۔ پھر بھی جانے کیوں اس نے جلدی
جانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ لیکن اب خض ذیشان کے کہنے پر رک جانا اسے
نہیں لگا۔ حالانکہ یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی کہ مخالف گروپ اب
امیدواروں کی کنوینسنگ جس زور و شور سے کر رہا تھا اسے دیکھتے ہوئے
سی سستی اور لا پرواہی بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ ایک دم ہی ا

سامنے گھوم گیا۔

ذیشان، اہم اسے لکنا کسی (فائل) میں پڑھتا تھا۔ یونیورسٹی کے ذہن اور
علمی طالب علموں میں ذیشان محمود کا نام سرفہرست تھا، بہترین ڈیپارٹمنٹ اور گزشتہ
سال کی یونین کے الیکشن میں اس کا انتخاب جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے ہوا تھا۔ عفت
نے جب فرسٹ ایئر آنرز میں ایڈمیشن لیا تھا تو وہ آنرز کے دوسرے سال میں تھا۔
ان دونوں کا شعبہ ایک نہیں تھا لیکن گزشتہ دو سالوں میں عفت نے اسے بار بار دیکھا
تھا۔ لیون دیکھنے کو وہ صبح سے شام تک بے شمار لڑکوں کو دیکھتی تھی۔ مگر اس کی
شخصیت کچھ منفرد سی تھی، پھر تقریبات کے موقع پر وہ پیش پیش رہتا تھا اس لئے
وہ بے شمار لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔

عفت سے اس کا تعارف شملہ لے کر وایا تھا۔ شملہ، ذیشان کی کلاس فیلو تھی۔
گزشتہ تین سال سے وہ دونوں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ شملہ حالانکہ عفت سے
ایک سال سنیئر تھی لیکن دونوں میں اچھی خاصی دوستی تھی۔ عفت کو اچھی طرح یاد تھا۔
کہ پہلی دفعہ جب شملہ نے اُسے ذیشان سے ملوایا تھا تو ذیشان کے جانے کے بعد
وہ شملہ سے لڑ پڑی تھی۔

”تمہیں کیا حق تھا کہ تم میرا تعارف کسی سے کرواؤ۔“

شملہ کو اس کی بات میں سلسلہ بچھنا نظر آیا۔

وہ مسکرا کر بولی۔

”بھلا اس میں حرج ہی کیا ہے؟“

”بس! میں نے کہہ دیا۔ آئندہ کسی لڑکے سے میرا تعارف کروانے کو“

تھے۔ ہوا میں تھم تھم کے چل رہی تھیں، نیم کی زرد سوکھی پتیاں بغیر آواز کے فرش پر
گہرے تھیں، پیلی پیلی دھوپ آگن کی دیواروں کے آخری سروں تک پہنچ چکی
تھی، ساتھ والے گھر کے آگن میں لگے جان کے درخت پر کوسے کا ایک جوڑا بیٹھا
نظروں ہی نظروں میں جلنے لگا، گفتگو کر رہا تھا، دور کہیں شاید کسی گھر میں شادی کا
ہنگامہ تھا، ریکارڈنگ ہو رہی تھی، شام کی ہواؤں کے دوش پر لہراتی ہوئی دھوپ
دھیمی آوازیں اس کے پردہ سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔

سُن رہی تھی موبے سے جانا بلائے
موبے جانا ہے پی کی نگہ یارے
موبے جانا ہے.....

ڈھلتی نشام

ڈوبتا سورج

اڑتے بادل

تھم تھم کے چلتی ہوئی ہوا میں
بنا آہٹ کے گرتی ہوئی زرد سوکھی پتیاں
ہوا کی لہروں کے ساتھ آتی ہوئی دھیمی دھیمی آوازیں

خاموشی

اور نہنائی

انجانے دکھ کے ہاتھ اسے اپنی جانب بڑھتے ہوئے غموں سے۔

اسے رشتہ کی آج دھوپ کی بانیں یاد آگئیں اور ذیشان کا چہرہ لگا ہوں

ضرورت نہیں ہے۔
”اب تمہیں اس کے لئے کام کرنا پڑے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اس دفعہ بھائی لوگ اسے جی۔ ایس کی پوسٹ کے لئے کھڑا کر رہے ہیں۔“

”میں کسی کے لئے کام نہیں کروں گی، میں ابھی سے تباہ دیتی ہوں۔“

نشلہ کچھ برا مان کر بولی۔

”اچھا! برٹمی نشان ہے تمہاری۔“

”میرے نشان چھوٹی ہو یا برٹمی، لیکن میں ان سب چکروں میں نہیں پڑوں گا۔“

”مجھے تم نہیں جانتیں، وہ بڑا اچھا لڑکا ہے۔“

”وہ اچھا لڑکا ہو یا برا، مجھے اس معاملے میں بالکل مت گھسیٹنا۔“

اور عفت نے سچ مچ ڈیشان کے لئے بالکل کام نہیں کیا۔ جب کہ دوسرے

بہت سی لڑکیاں اس کی کنوینٹنگ کرنے میں پیش پیش تھیں۔ ڈیشان نے خود اس

سے کام کرنے کے لئے کہا بھی نہیں۔ تعارف کے بعد یہ تو ضرور ہوا تھا کہ سر رہا ہے اگر

تو اسے نظر آجاتی تو وہ اسے سلام کر لیتا اور خیریت پوچھ لیتا۔ الیکشن والے

نت نے اپنا ووٹ ڈالا اور جلدی گھر واپس چلی گئی۔

الیکشن میں اس کی نمایاں کامیابی کی خوشی میں اس کے دوستوں نے پارٹی

ایا۔ پارٹی میں ڈیشان نے عفت کو بھی انوائٹ کیا۔ وہ خشنہ کے ساتھ

اسے ڈیپارٹمنٹ کے نوٹس بورڈ کے پاس کھڑی کسی کتاب کی گمشدہ

متعلق نوٹس پڑھ رہی تھی کہ ڈیشان محمود قریب کھڑا ہو گیا۔ خشنہ نے پٹ کر اس کی طرف دیکھا اور برٹمی زود دار آواز میں بولی۔

”ہیلو ڈیشان۔“

ڈیشان اپنے مخصوص انداز سے مسکرا کر بولا۔

”ہیلو۔“

عفت نے بھی مڑ کر دیکھا۔ ڈیشان اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دھیمی آواز سے

بولی۔

”ہیلو۔“

عفت کی آواز بھی اس کی آواز سے کم دھیمی نہیں تھی۔

خشنہ منہ پوچھا۔

”کیسے ہیں ڈیشان صاحب؟“

”ٹھیک ہوں، آپ سنا تے۔“

خشنہ حسبِ عادت مسکرا کر بولی۔

”آپ کی دعائیں ہیں۔“

عفت خاموش کھڑی تھی۔

ڈیشان نے ایک لمحے کے لئے عفت کی طرف دیکھا اور دونوں سے مخاطب

ہو کر بولا۔

”کل ایک بھجوتی سی پارٹی ہے، آپ لوگ بھی آئے گا۔“

خشنہ نے کہا۔

”اپنی کامیابی کی خوشی میں دے رہے ہیں؟“

”جی! بس یہی سمجھ لیجئے“

”کس جگہ ہے پارٹی؟“

”میں تو اپنے گھر پر ہی دینا چاہتا تھا لیکن بعض لڑکیوں نے کہا، ہم گھر نہیں آسکتے۔“

”اچھا، پھر ہمیں یونیورسٹی میں ہے؟“

”جی! کمپس میں میرا ایک دوست رہتا ہے، اس کے سب گھر والے تو پنجاب گئے ہوتے ہیں۔ اسی کے گھر میں کہہ لیں گے“

”یہ تو واقعی بڑی اچھی بات ہوئی، سبھی شریک ہو سکیں گے۔“

رخشندہ نے عفت کی طرف خاص طور سے دیکھا۔

ذیشان نے کہا۔

”مجھے بھی یہی خیال تھا کہ اگر گھر پر پارٹی دی تو اکثر لوگ نہیں آسکیں گے،“

رخشندہ معنی خیز انداز سے مسکراتی۔

ذیشان عفت کی طرف دیکھ کر بولا۔

”آپ آئیں گی نا! میں شجاع۔“

عفت نے پوچھا۔

”کس وقت ہے پارٹی؟“

”ایک بجے۔“

”اچھا! کوشش کروں گی۔“

رخشندہ جل کر بولی۔

”اب تمہارے جانے میں کونسا امر مانع ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وقت بھی مناسب ہے اور جگہ بھی موزوں، پھر تمہیں کیا ہچکچاہٹ ہے۔“

”میں نے انکار تو نہیں کیا۔“

”لیکن وعدہ بھی تو نہیں کر رہی ہو۔“

”وعدہ کر کے میں اپنے ذہن پر کوئی بوجھ مسلط نہیں کرنا چاہتی۔“

”تمہاری ایسی ہی باتوں پر جان جل جاتی ہے میری۔“

عفت خاموش کھڑی رہی۔

رخشندہ نے ذیشان سے کہا۔

”انویٹیشن کا شکریہ ذیشان صاحب! ہم دونوں ضرور آئیں گے،“

ذیشان شکریہ کہہ کر ہلٹ گیا۔ ذیشان کے جانے کے بعد رخشندہ نے عفت کی خبر لے ڈالی۔

”تم تو اس قدر بے حس لڑکی ہو کہ بس! میں تمہیں کیا کہوں؟“

”اس میں بے حس کی کیا بات ہے؟“

”نہیں نہ کسی کے جذبات کا پاس ہے نہ احساسات کا خیال،“

”آخر میں نے کون سا قسم توڑ دیا؟“

”وہ اتنے خلوص سے دعوت دے رہا ہے اور تم ہو کہ اکر ڈی جا رہی ہو،“

”میں نے جانے سے انکار تو نہیں کیا“

رخشندہ مارے غصے کے خاموش رہی۔

”میں نے یہی تو کہا تھا نا کہ کوشش کروں گی“

”ہاں! بڑا احسان کیا تھا یہ کہہ کر اس کے ادب“

عفت بھی تاؤ کھا کر بولی۔

”ابھی بات ہے، اب تو میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔“

”دیکھوں گی کیسے نہیں جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے کل دیکھنا۔“

رخشندہ ایک دم نہیں پڑی۔

عفت بھی اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکی۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ دوسرے روز جب ڈاکٹر عرفان کی کلاس اٹھ کر

دونوں نکلیں تو رخشندہ نے عفت سے پوچھا۔

”کیا ارادہ ہے تمہارا؟“

”کیسا ارادہ؟“

”یاد ہے آج ذیشان کی پارٹی میں جانا ہے“

”یاد ہے“

”وقت بھی یاد ہے؟“

”ہاں! ایک بجے سے لے کر کہا تھا اس نے“

”جھوٹی؟“

”دیکھا جائے گا، ابھی تو پورا ایک گھنٹہ باقی ہے“

”ابھی سے بتائے دیتی ہوں، اگر عین وقت پر انکار کیا تو مجھ سے بڑا کوئی نہیں

ہوگا۔“

”کیوں؟ کیا کہو گی؟“

”گھسیٹتی ہوتی بے جاؤں گی“

عفت ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ بکھیرے اس کے ساتھ کوریڈور

میں چلتی رہی۔ اس روز بارہ بجے کے بعد ان لوگوں کا کوئی پیرٹ نہیں تھا۔ عفت

کو اپنا نیا افسانہ پوسٹ کرنا تھا۔ دونوں پوسٹ آفس کی طرف جا رہی تھیں راستے

میں شہلا مل گئی۔

مسکرا کر پوچھنے لگی۔

”ذیشان کی پارٹی میں آرہی ہو نا تم لوگ؟“

رخشندہ نے کہا۔

”ہاں! کیوں نہیں آئیں گے؟“

شہلا آگے بڑھ گئی تو رخشندہ نے عفت سے کہا۔

”یہ بہت چمک رہی ہے آج“

”آخر کیوں نہ چمکے؟ اس کا دوست کامیاب ہوا ہے۔“

”دوست ہی رہے تو غنیمت ہے“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ کچھ اور بننے کی کوشش نہ کرے“

عفت برامان کر بولی۔

”تو بہ ہے کس قدر فضول قسم کی باتیں سوچتی ہو تم۔“

رخشندہ چپ رہی۔

”دونوں بڑے اچھے دوست ہیں۔ عفت نے کہا۔

رخشندہ بولی کچھ نہیں، مسکراتی رہی۔

پوسٹ آفس سے واپس آتے وقت رخشندہ جان پہچان کے چند لڑکوں سے

باتیں کرنے لگی۔ عفت نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آہستہ آہستہ چلا

رہی۔ اس کا خیال تھا کہ رخشندہ بھی دو تین منٹ بعد آجائے گی۔ اس نے ایک

دفعہ پلٹ کر دیکھا۔ رخشندہ بڑے اطمینان سے کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ یقیناً اس کی

گفتگو طویل ہو گئی تھی۔ عفت آگے بڑھنے کے بجائے بس اسٹاپ کے سامنے

بنے ہوئے سٹیڈ میں ایک بیچ پر بیٹھ گئی۔ اور درختوں کے سائے میں کھڑی رنگ

برنگی کاروں کو بلا مقصد دیکھنے لگی۔ تبھی اسے ایڈمنسٹریشن کی عمارت کے سامنے

سے ڈنٹاؤر، محمود آتا ہوا نظر آیا۔ رخشندہ کے آنے سے پہلے ہی ڈنٹاؤر اس کے

قرب آگیا۔ عفت نے دیکھا۔ دھوپ کی تماریت سے اس کی گندمی رنگت سرخ

مائل ہو رہی تھی۔ کانوں کی لوہوں تک سرخ ہو رہی تھیں۔ ہوا کے ہلکے جھونکوں

اس کے بھورے بال بار بار ماتھے پر کھیرے جا رہے تھے۔

وہ قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ عفت اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس نے سلام کرنے

یا سبکو کہنے میں بھی پہلی نہیں کی۔

ڈنٹاؤر نے پوچھا۔

”آپ گھر جا رہی ہیں میں شجاع؟“

عفت نے سرسری نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”میں رخشندہ کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”یہ میری بات کا جواب تو نہیں ہوا۔“

”آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ میں گھر جا رہی ہوں؟“

”آپ خود ہی سوچے، آپ جس جگہ بیٹھی ہیں اسے دیکھ کر تو یہی اندازہ لگایا جا

سکتا ہے کہ آپ بس کا انتظار کر رہی ہیں۔“

”فی الحال تو میں رخشندہ کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”بارٹی میں آئیں گی نا آپ؟“

”میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی۔“

ڈنٹاؤر کا چہرہ اب اس کے لئے کچھ سا گیا۔ مگر فوراً ہی وہ سنبھل گیا اور

بولی۔

”یہ میری درخواست ہے میں شجاع۔“

”آپ درخواست کر کے مجھے شرمندہ تو نہ کیجئے۔“

”تو پھر آپ آجائیں۔“

”میں نے انکار تو نہیں کیا نا۔“

”مگر آپ اقرار بھی تو نہیں کر رہی ہیں۔“

”ایک میرے نہانے سے کوئی فرق تو نہیں پڑے گا۔“

”میں سوائے اس کے اور کیا کہوں کہ یہ اپنے اپنے سوچنے کا انداز ہے۔“

عفت کو اس کی باتوں سے ایک دم گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے مجبوراً
آنے کے لئے اقرار کر لیا اور بات بدل کر بولی۔

”ایک بجنے میں زیادہ دیر تو نہیں باقی ہے۔“

”جی! جی ہاں“

”پھر آپ اس طرف کیا کرنے آئے تھے؟“

ذیشان سینے پر دونوں ہاتھ باندھے چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔
”آپ کو تو اس وقت وہاں موجود ہونا چاہیے، آپ کے مہمانوں کا استقبال

کون کرے گا؟“

ذیشان اپنی گھرے چیک وار پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے

دھیمی آواز سے بولا۔

”میرے مہمان!“

اس کا انداز معنی خیز تھا۔ پھر وہ عفت کے اڑتے ہوئے سفید آنچل پہ نظر

جھلتے ہوئے بولا۔

”میرے مہمان کسی طرح آنے پر رضامند تو ہوں“

عفت سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

”کیا کوئی بھی آنے پر رضامند نہیں؟“

”مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے“

عفت نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ رخشندہ آکر ہی تھی۔

اس نے ذیشان سے کہا۔

”آپ جلتے، ہم دونوں ابھی آتے ہیں“

ذیشان کی آنکھوں میں بے یقینی سی تھی۔ رخشندہ قریب آئی تو ذیشان
نے کہا۔

”میں آپ لوگوں کو لینے آیا تھا“

رخشندہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔

”ارے! آپ نے ناخق زحمت کی، ہم لوگ خود ہی آجاتے۔“

”میں نے سوچا، میرے دوست کا گھر خاصی دیر ہے اور پھر یہ بھی اندیشہ تھا
کہ معلوم نہیں آپ لوگ پہنچ بھی پائیں گی یا نہیں؟“

”نمبر تو آپ نے بتا ہی دیا تھا، پوچھتے پوچھتے پہنچ ہی جاتے ہم“

”میں نے ایک دوست کی گاڑی کا انتظام کیا ہے“

اس نے جیب سے چابی نکالتے ہوئے کہا۔

”یہ دیکھتے چابی لے کر آیا ہوں“

رخشندہ نے کہا۔

”میرا خیال ہے آپ نے کچھ زیادہ ہی تکلف کر ڈالا۔“

اور عفت سوچ رہی تھی کہ ذیشان کے ساتھ گاڑی میں جانا مناسب نہیں

ہے، دوسرے لوگوں کو خواہ مخواہ یہ سوچے گا موقع ملے گا کہ ان دونوں میں

ایسی کون سی خاص بات تھی جو انہیں گاڑی میں لے کر آیا ہے ذیشان؟

وہ دل کی بات دل میں نہ کر سکے۔ اس نے بڑی متانت سے ذیشان کی طرف

دیکھا اور بولی۔

سارے راستے رختندہ یہی کہتی رہی کہ گاڑی میں جاتے تو دونٹ میں پہنچ جاتے اور اس چلیچلاتی دھوپ سے بھی بچتے۔

لیکن عفت اپنے فیصلے پر مطمئن تھی۔ اس چلیچلاتی دھوپ میں اشاف ٹاؤن تک کا طویل راستہ طے کرنا لوگوں کی باتیں سننے سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔ پارٹی والے دن کے بعد سے ذیشان بہت غماض ہو گیا تھا۔

رختندہ کا خیال تھا کہ ذیشان نے عفت کی باتوں کا برا مانا ہے۔ عفت نے سوچا۔

سچی باتیں اگر کسی کو سب سے لگتی ہیں تو لگا کریں۔ میں کسی کی ناراضگی کا خیال کر کے اپنے آپ کو کسی کی نظروں میں گرا نہیں سکتی۔

ایک دن عفت صبح یونیورسٹی پہنچی تو ڈیپارٹمنٹ کی طرف جلتے ہوئے کوریڈور میں ذیشان سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ وہ آڈیٹوریم کے باہر پڑے پرانے فرنیچر کے پاس کھڑا اپنی فائل کے ادراق جلدی جلدی پلٹ رہا تھا۔ عفت قریب سے گزری تو وہ فائل بند کرتے ہوئے بولا۔

”ہیلو میس شجاع ایکسی ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں، آپ سنائیے۔“

”دعائیں ہیں آپ کی۔“ ذیشان مسکرایا۔

عفت نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں اپنی دعاؤں میں آپ کو کبھی یاد نہیں کرتی۔“

ذیشان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”لیکن ہم آپ کے ساتھ گاڑی میں نہیں جاتیں گے۔“
”مجھے پہلے ہی اس بات کا اندیشہ تھا کہ آپ نہیں مانیں گی۔“
”آپ برا نہ مانیے گا ذیشان صاحب! میں اصل میں دوسروں کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتی۔“

ذیشان بڑی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔
”دیکھتے نا! دوسری لڑکیاں سوچیں گی نہیں کہ ہم دونوں میں ایسی کونسی نام بات ہے جو آپ ہمیں گاڑی میں لے کر آئے؟“
رختندہ نے کہا۔

”چسو ڈو عفت! دوسروں کی اگر تم اتنی پرواہ کرنے لگیں تو پڑھ چکیں یہاں۔“

”تم بے شک پرواہ نہ کرو لیکن میں.....“
ذیشان نے کہا۔

”اچھا! میں واپس جا رہا ہوں لیکن آپ دونوں پہنچ جائیے گا۔“
عفت نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”شکریہ! ہم آ جاتیں گے۔“
ذیشان چلا گیا تو رختندہ عفت سے لڑ پڑی۔

”تم ہمیشہ گھالے کا سودا کرتی ہو۔“

”میں نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔“

”اچھا۔ اب چلو، ورنہ پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو جائے گی۔“

”میں اکثر اذنانہ بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔“
عفت خاموش رہی۔

”آپ کی دوست رخشندہ نہیں آئیں ابھی“
”نہیں“

رخشندہ کا ذکر ہوا تو عفت کو رخشندہ کی بات یاد آئی۔
اس نے ذیشان سے کہا۔

”رخشندہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے میری اس دن کی باتوں کا برا مانا ہے“
ذیشان نے چونک کر پوچھا۔

”کس دن کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟“
”جس دن آپ نے پارٹی دی تھی۔“

”نہیں میں شجاع! آپ کی صاف گوئی نے اس دن مجھے بہت بڑا سبق دیا“
عفت کی نگاہیں فرخچر پر پڑی ہوئی گرد و برجم گئیں۔

”مجھے احساس ہوا کہ میں نے جذبات میں آکر ایک فیصلہ کیا تھا۔ اس کے
نتائج پر میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔“

عفت خاموش کھڑی رہی۔

”میں اس بات کا اعتراف کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ
کی صاف گوئی اگرچہ بے حد تلخ ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود مجھے آپ کی برعیا
بہت پسند ہے۔“

”تو گویا آپ نے میری باتوں کا برا نہیں مانا“ عفت مطمئن ہو کر بولی۔

ذیشان چند سیکنڈ تک خاموش رہا پھر کچھ آہستہ سے بولا۔
”دراصل بات یہ ہے میں شجاع کہ.....“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”جی! آپ کچھ کہہ رہے تھے۔“

”میں جن لوگوں کو پسند کرتا ہوں ان کی عزت کی حفاظت کرنا بھی اپنا فرض
سمجھتا ہوں“

عفت چپ چاپ کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ ذیشان اس کے
نکھرے ہوتے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ خدا حافظ کہہ آگے
بڑھ گئی۔

اس کے بعد بھی بار بار ان دونوں کی ملاقاتیں ہوتیں۔ مگر وہ دونوں بہت
رسمی باتیں کرتے تھے اور اب — آنرز فائٹل میں آنے کے بعد لڑکے
لڑکیوں کے بے پناہ عجوبہ کرنے پر وہ جوائنٹ سیکرٹری کی پوسٹ کے لئے
کھڑی ہو گئی تھی۔ ذیشان اس کے لئے بڑی لگن سے کام کر رہا تھا۔ رخشندہ
اسے بار بار طعنہ دے رہی تھی کہ تم نے ذیشان کے لئے پچھلے سال بالکل بھی
کام نہیں کیا تھا۔

اگر آج — رخشندہ نے ذیشان کا ذکر ایک نئے انداز سے کر کے اس
کی سچوں کو منتشر کر دیا تھا۔ وہ آنگن میں پچی کھڑی چارپائی پر لیٹی پچھلے ایک سال
میں ہونے والی اپنی اور ذیشان کی ملاقاتوں کے بارے میں سوچے جا رہی
تھی۔

اس نے سوچا —

اب تک تو میں نے اپنے دامن کو بچا بچا کے رکھا ہے مگر اب یہ کیا ہونے والا ہے۔ رشتہ دار پہلے ہی اس بات پر یقین کتے بیٹھے ہیں کہ ہم دونوں مہینیں ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلاتیں گے۔ سعدیہ باجی کی تنگنی کے بعد ان کی طرف سے تو بالوس ہو گئے ہوں گے لیکن میرے متعلق انہیں اب بھی یقین ہو گا کہ میں ضرور کچھ نہ کچھ کر گزروں گی لیکن ذیشان نے کبھی مجھ سے کوئی واضح بات نہیں کی پھر میں اسے کس طرح ٹوکوں۔ اور یہ رختندہ کتنی ہوشیار ہے؛ اسے ذیشان کے دلی جذبات کا اندازہ کس طرح ہو گیا؛ معلوم نہیں اور کس کس کو خبر ہو گی لیکن ایسا نہیں چاہیئے۔

اس کی سوچوں کا سلسلہ جانے کب تک نہ ٹوٹتا۔ اگر فوزی اسے مخاطب کرتی۔ اس نے برآمدے کی بٹی جلا دی تھی اور اس کے قریب کھڑی نہ رہتی تھی۔

”اماں ابھی تک نہیں آئیں عفت باجی!“

عفت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اٹھ بیٹھی۔

”ہاں! بڑی دیر ہو گئی اماں کو بھائی میاں بھی معلوم نہیں کہاں چلے گئے“ فوزی پانی پی کر پھر اندر سے بیس چلی گئی۔ عفت کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھ گئی۔

بادلوں کے ٹکڑے انجانی سمتوں کی طرف اڑ گئے تھے۔

شام کا ستارہ اوائل تاریکیوں کے باریک مدغم سے چاند کے قریب جھلملا رہا تھا۔

تاریکی دے پاؤں زمین پر اترا آتی تھی۔

نیم کی شاخوں میں بڑی مدغم سی سرگوشیاں تھیں۔

گلاب کے پودے پر کھنے والی تنہا کلی کا جھومنا ہوا سا یہ دیوار پر پڑ رہا تھا۔ چاندنی کے اجلے پھول آنگن کے فرش پر پڑے جگمگا رہے تھے۔ اور موتیا کی نرم و نازک شاخیں رات کی رانی کی شاخوں سے اُلجھ کر رہ گئی تھیں۔

ہواؤں کی دھیمی تال پر رقص کرتی ہوئی گانوں کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ بابل پچھتاہے ہاتھوں کو مل کے کاسے دیا پر دلیں ٹکڑے کو دل کے

کال بیل کی نیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ دروازہ کھولنے کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر فوزی اس کے پہنچنے سے پہلے ہی دروازہ کھول چکی تھی اماں، سعدیہ باجی اور خرم آپکے تھے۔

الیکشن والے روز ذیشان کی حالت قابل دید تھی۔ اپنے دوست یوسف کے ساتھ وہ عفت کے لئے بھی بہت پریشان تھا۔ اپنی موٹر سائیکل لئے کبھی وہ آرٹس فیکلٹی میں نظر آتا کبھی سائنس فیکلٹی میں۔

عفت جنرل ہسٹری ڈیپارٹمنٹ میں دوپٹوں کی قطار کے پاس کھڑی تھی۔ لکھنے والے اگر اس سے کہا۔

”عفت! میرا خیال ہے ایک چکر انگلش ڈیپارٹمنٹ کا بھی لگا لو۔“

عفت رختندہ کو وہیں چھوڑ کر شملہ کے ساتھ انگلش ڈیپارٹمنٹ کی

طرف چل دی۔ دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے ذیشان لگا
وہ اپنے دوستوں کے ساتھ انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہی واپس آ رہا تھا۔
وہ عفت کے قریب رک گیا اس کے دوست عفت کو اطمینان دلاتے
ہوئے میچے اتر گئے اور شہلا بھی یہ کہہ کر گے بڑھ گئی۔

”میں چلتی ہوں عفت! تم آ جانا۔“
ذیشان نے عفت کے تھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔

”آپ پریشان ہیں؟“

”جی! نہیں تو۔“

”میرا خیال ہے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“
عفت چپ رہی۔

”سب کچھ بالکل ٹھیک جا رہا ہے“

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

”آپ کی کامیابی یقینی ہے۔“

”کامیابی یا ناکامی کوئی ایک صورت تو ہوتی ہے۔“

”ہاں! وہ تو ظاہر ہے۔“

”لیکن مجھے اپنے خدا پر بہت بھروسہ ہے۔“

ذیشان نے کہا۔

”بس! انسان کو پر امید ہی رہنا چاہیے۔“

”آپ کے دوست یوسف کی کیسی پوزیشن ہے؟“

”میرا تو خیال ہے وہ کامیاب ہو جائے گا۔“

”ہاں! مجھے بھی امید ہے اس دفعہ صدر وہی منتخب ہوں گے۔“

ذیشان چند سیکنڈ تک چپ چاپ اس کی دھلی دھلی صاف و شفاف
آنکھوں میں دیکھتا رہا عفت ایک دم نروس سی ہو گئی۔

ذیشان مسکرا کر بولا۔

”صبح ناشتہ کر کے آئی تھیں؟“

”ہاں!“ عفت کی نظریں جھبک گئیں۔ اپنے جھوٹ پر وہ کچھ جھینپ سی گئی۔
صبح اسے اتنی دیر ہو رہی تھی کہ وہ صرف چاتے کا ایک کپ پی کر چلی آئی تھی۔
اسے خود اس بات کا احساس تھا کہ اس کا چہرہ بہت مرجھایا ہوا ہے۔

”میرا خیال ہے آپ کینٹین جا کر ناشتہ نہ کر لیجیے۔“

عفت نے پھر جھوٹ بولا۔

”میں ناشتہ نہ کر کے آئی تھی۔“

”مجھے سچ اور جھوٹ کا پتہ بڑی جلدی چل جاتا ہے۔“

عفت خاموش رہی۔

”اور میری نظریں دھوکہ بھی نہیں کھاتیں“ ذیشان کے ہونٹوں پر بڑی گہری
مسکراہٹ تھی۔

عفت کچھ خجل سی ہو گئی۔

”میں نے ناشتہ نہ کیا تھا۔“

”اتنی بہت سی اچھی عادتوں کے ساتھ جھوٹ بولنے کی یہ عادت.....“

ذیشان بات اور صوری چھوڑ کر چپ ہو گیا۔

”آپ کو یقین ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں“

”ہاں! لیکن آپ کو جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہیں“

عفت بات ٹال کر بولی۔

”اچھا! مجھے جلنے دیجئے، شہلا انتظار کر رہی ہوگی“

”آپ پہلے شہلا کے ساتھ کینٹین چلی جاتیے“

”پولنگ ختم ہو جائے پھر دیکھا جائے گا۔“

”پولنگ ختم ہونے میں ابھی کافی دیر ہے“

”کوئی بات نہیں“

عفت سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی۔

ذیشان چپ چاپ زیرِ اترنے لگا۔

اور پھر۔۔۔ اسی روز جب وہ رخصتہ کے ساتھ زولو جی ڈیسارٹمنٹ

میں تھی تو اس نے ذیشان کو امجد کے ساتھ آتے دیکھا۔ اس کا چہرہ گرمی اور

دھوپ کی شدت سے تمٹایا ہوا تھا، بال بکھر کر رہ گئے۔

رخصتہ نے اس کے قریب جھک کر سرگوشی کی۔

”کیا شان ہے اس شخص کی، ہر حال میں جتنا ہے۔“

عفت خاموش رہی۔

”رخصتہ چڑھ کر بولی۔

”حسرت ہی ہے کبھی تو تمہاری زبان سے اس کے لئے تعریف کا ایک

ک لوں“

”میں اور کس کی تعریف کرتی ہوں جو اس کی تعریف کروں؟“

”اوروں سے اس کا کیا مناجلہ؟ اس جیسا یہاں کوئی ہو بھی“

”چپ ہو جاؤ نا، دو نوں قریب آ رہے ہیں“

”آنے دو“

”یہ وقت اس قسم کی باتوں کا نہیں ہے“

”تم تو کسی وقت بھی اس قسم کی باتوں پر آمادہ نہیں ہوتیں“

”رختی اپلیز چپ ہو جاؤ“

ذیشان اور امجد قریب آئے تو امجد عفت سے مخاطب ہو کر بولا۔

”کہوں میں اس معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟“

عفت مسکرا کر بولی۔

”جی ہاں! خدا کا شکر ہے“

ذیشان نے کہا۔

”پھر ہم دونوں بوٹنی ڈیسارٹمنٹ کی طرف جاتے ہیں“

عفت نے کہا۔

”ہاں! آپ لوگ جاتیے۔“

ذیشان امجد کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

پولنگ ختم ہوئی تو سب کو کھانے پینے کی سوجھی۔ مگر ذیشان کو اپنے آپ

سے زیادہ عفت کی فکر تھی۔ حالانکہ خود اس کا تھکن کے مارے برا حال تھا اور

دوسرے روز عفت یونیورسٹی آئی تو سب سے پہلے ذیشان سے ہی اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ ڈین آفس کے باہر کھڑا بڑے انہماک سے نوٹس بورڈ پڑھ رہا تھا۔ عفت کا من روم سے باہر نکلی تو اس نے یونیورسٹی پلٹ کر دیکھا۔ عفت پر نگاہ پڑنے ہی اس کا چہرہ ایک دم دمک اٹھا۔

”ہیلو مس شجاع“ وہ مسکرایا۔

”ہیلو، عفت بھی مسکرائی۔

ذیشان جانے کیوں بڑے غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ عفت نے پوچھا۔

”اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ....“

وہ ایک دم رک گیا۔

”جی؟“

”کہہ دوں؟“

”کہہ دیجئے“

”برائو نہیں مائیں گی آپ“

”اس کا فیصلہ تو آپ کی بات سننے کے بعد ہی کر دیں گی“

ذیشان ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”جو بات آپ کہتے کہتے رک گئے ہیں مائیں اسے سننا ضرور چاہوں گی“

”اچھا تو پھر سنئیے۔“

وہ عفت سے پوچھ رہا تھا۔

”تھک تو نہیں گئیں مس شجاع!“

”نہیں۔“

”مجھے یقین ہے آپ نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔“

”میرا خیال ہے کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا“

”ہم سب لوگ کم سے کم ناشتہ تو کر کے آئے تھے“

”مگر اس وقت تک تو آپ سبھی کا ناشتہ مبغضم ہو چکا ہو گا۔“

”اچھا! میں ابھی آپ لوگوں کے کھانے پینے کے لئے کچھ بھیجتا ہوں۔“

رخشنده نے اس کا آخری جملہ سن لیا تھا۔ قریب آکر بولی۔

”تمہارے طفیل میں باقی لوگوں کو بھی کھانے پینے کو مل جائے گا“

عفت نے خشتگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”جب سوچو گی، بے تکلی بات سوچو گی۔“

”حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ تم نہ مانو وہ دوسری بات ہے“

عفت نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تھکے تھکے انداز سے

قریبی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

ایکشن کارڈ لٹ آیا تو ان لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ سارے

اہم عہدوں کے لئے ان ہی کے امیدوار کامیاب ہوتے تھے۔ سب ایک دوسرے

کو مبارکباد دے رہے تھے۔ لڑکے ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے

جیتنے والوں کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جا رہے تھے۔

”سنائیے۔“

”میں یہ سوچ رہا تھا کہ بعض لوگ مسکراتے ہوتے بے حد اچھے لگتے ہیں۔
لیکن پھر بھی وہ بہت کم مسکراتے ہیں، آخر کیوں؟“
عفت نے پوچھا۔

”کون لوگ؟“

”بس ہیں کچھ لوگ“

”آپ کچھ لوگوں کی بات کر رہے ہیں نا؟“

”جی“

”تو پھر اس میں میل برابانے کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا؟“

”کچھ لوگوں میں آپ بھی تو شامل ہو سکتی ہیں۔“

”اگر آپ میری بات کر رہے ہیں تو کبھی کبھی میں خود بھی سوچتی ہوں“

”کیا سوچتی ہیں؟“

”میں کہ میں اتنا کم کیوں مسکراتی ہوں“

”کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی“

”ہاں! یقیناً کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی“

”آپ کو نہیں معلوم؟“

”شاید میں نے اس کی وجہ جاننے کی کوشش کبھی نہیں کی۔“

”کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ بہت الجھی ہوئی سی رہتی ہیں۔“

”اور کیا کیا محسوس کرتے ہیں آپ؟“

”محسوس تو بہت کچھ کرتا ہوں۔“

”اچھا! عفت پھر مسکرا دی۔“

”جی! لیکن آپ کی طرح انسانہ فطرت نہیں ہوں نا!“

”جی! کیا مطلب؟“

”وہ جلدی سے اپنی بات کا انداز بدل کر بولا۔“

”میرا مطلب ہے کہ اکثر لوگ محسوس تو بہت کچھ کرتے ہیں لیکن اپنے احساسات کا اظہار نہیں کر سکتے“

عفت چپ چاپ کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ذہینان نے اسے غاموش پاکر بات کا رخ بدل دیا اور مسکرا کر بولا۔

”اچھا اس ذکر جانے دیجئے کوئی اور بات کرتے ہیں۔“

عفت پھر بھی چپ رہی۔

”میں نے شاید آپ کی کامیابی پر آپ کو مبارکباد بھی نہیں دی“

”دے تو چکے ہیں، کتنی دفعہ مبارکبادیں گے؟“

”وہ تو بس میں نے یونہی سی مبارکباد دی تھی۔“

”پھر کس طرح دینا چاہتے ہیں؟“

”جس طرح آپ کہیں۔“

”میرے خیال میں تو جو کچھ آپ کہ چکے اتنا ہی کافی ہے۔“

”چلتے، پھر میری عفت وصول ہو گئی۔“

عفت مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔

”ہوم اکٹاکس کالج میں پڑھتی ہے، گھر جانے کے لئے بس میں سوار ہو رہی تھی، ابوری طرح چڑھتے بھی نہیں پائی تھی کہ ڈرائیور نے بس چلا دی، ایک دم ہینڈل چھوٹ گیا اور گر پڑی، بہت چوٹیں آئی ہیں۔ ہاسپٹل میں بے ہوش پڑی ہے۔ ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی سرٹو کوکشن کر رہے۔“

ایک ہیڈنٹ کا سن کر عفت کی ویسے ہی بری حالت تھی اور اب یہ سن کر کہ اس کی حالت بری ہے عفت کا دل اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ عفت کو اس روز ذیشان کی غیر حاضری بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ اگلے روز عفت نے سنا کہ ذیشان کی بہن ثروت کا انتقال ہو گیا۔ اسے اپنا دل ڈوٹا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ کامن روم کے ساتھ والے حوض کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔ شہلا نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھاما وہ برف کی طرح سرد تھا۔ رشتہ نہ نے کہا۔

”ذرا سی تو بہت کم وعفت! ابھی ہم لوگوں کو ذیشان کے گھر بھی جانا ہے۔“ عفت نے مدھم آواز میں کہا۔

”اچھے لوگ اتنی جلدی دینا سے کیوں چلے جاتے ہیں رشتی؟“ رشتہ نہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

”اس کی صورت میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے، کتنی ہنس مکھ اور زندہ دل لڑکی تھی۔ ذیشان کے ساتھ تین چار دفعہ جب بھی آئی، سارا وقت اپنی شگفتہ باتوں سے ہمیں ہنساتی رہی۔“ شہلا نے کہا۔

ایکشن کے ہنگامے ختم ہوتے تو زندگی اپنے معمول پر آگئی۔ ایک روز عفت یونیورسٹی پہنچی تو شہلا اپنی پریشان صورت نے اس کے قریب آگئی۔

عفت نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیا بات ہے شہلا! خیریت تو ہے؟“

”کہاں خیریت ہے عفت؟“

”کیوں؟ کیا ہوا؟“

”ذیشان کی چھوٹی بہن کا بڑا زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔“

”کیسے؟“ عفت بھی پریشان ہو گئی۔

”بس سے گر پڑی۔“

عفت کا دل دھک سے ہو گیا۔

شہلا اسے تفصیلات بتانے لگی۔

دکھ سکھ کا سانحنی تھا۔

آج اس کا دکھ ٹھانے کے لئے بھی سب جمع ہو گئے تھے۔

ذیشان کی امی اور اس کی باقی دو بہنوں کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

موت تو ویسے بھی گھر والوں کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہوتی ہے۔ اوپر سے جو ان بیٹی کی موت کسی طویل بیماری کے بعد اگر یہ حادثہ رونما ہوا ہوتا تو شاید پھر بھی ذہن آہستہ آہستہ اپنے آپ کو آنے والے سانحے کے لئے تیار کر لیتے۔

لیکن یوں اچانک —

کچھ کے بغیر

کچھ سنے بغیر

کوئی چپ چلپ رخصت ہو جاتے۔

ان لمحوں کے کرب کو برداشت کرنا

ان گھڑیوں کی اذیت کو سہہ جانا۔

کس قدر مشکل؟

اور کتنا دشوار ہوتا ہے۔

گھر والوں کی آہ و فغاں کو سن کر غیروں کے دل بھی پیٹے جا رہے تھے۔ شہلا

عرفانہ، رخشنہ اور پروین سسکیوں سے رورہی تھیں۔ وہ بھلا ذیشان کی

امی اور اس کی بہنوں کو تسلی کس طرح دیتیں۔ ان کی حالت خود ناگفتہ بہ تھی۔ عفت

ایک کونے میں بیٹھی سید پارہ پڑھ رہی تھی۔ گھر والوں کے نالہ و شہیوں کی آواز

اس کے کانوں میں پہنچتی تو اس کا دل جیسے کوئی مچھلی میں پکڑا کہ بھینچ دینا سیدھا لے

”اور شکل بھی کتنی پیاری تھی۔“

اسی وقت یوسف، امجد اور سلطان بھی وہاں آ گئے۔ ان سب کے چہرے اتارے ہوئے تھے اور آنکھوں سے بڑے گہرے دکھ جھانک رہے تھے وہ یوں گم سم اور الجھے سمجھے تھے جیسے ان کی اپنی بہن کا انتقال ہو گیا ہو۔ ذیشان سے وہ سبھی بے پناہ محبت کرتے تھے، اس کا دکھ انہیں اپنا ہی دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ خاص طور سے یوسف تو اس پر جان چھڑکتا تھا۔ گزشتہ تین روز سے وہ دل راز

ذیشان کے ساتھ تھا۔

یوسف نے کہا۔

”پھر آپ لوگ رمل رہی ہیں نا!“

رخشنہ اور شہلا نے اثبات میں سر ہلایا۔ عفت سر جھکائے خاموش بیٹھ رہی۔ اسے احساس تھا کہ یوسف کی نگاہیں اسی کی طرف ہیں۔

رخشنہ نے کہا۔

”عرفانہ اور پروین ڈیپارٹمنٹ گئی ہیں، ابھی آتی ہی ہوں گی پھر چلیں گے عفت نے کہا۔

”میں سعیدہ باجی سے مل کر آتی ہوں۔“

وہ جانے کے لئے اٹھی تو شہلا بھی اس کے ساتھ ہو لی۔

عفت سعیدہ باجی کو تباہ کر آئی تو سب اس کے منتظر تھے۔

ذیشان کے گھر ایک کمرہ چھا ہوا تھا۔ اس کے بے شمار عزیز و اقارب

تھے۔ یونیورسٹی کے بھی ان گنت لوگ موجود تھے۔ وہ — جو سب —

کے حروف بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے دھندلا جاتے۔ دل کا سارا درویش
کمر آنکھوں میں آجاتا اور آنسو ایک کے بعد ایک ٹپ۔ ٹپ سیپارے سپر گرتے
چلے جاتے۔

نزدت کا جنازہ جب آخری دیدار کے لئے رکھا گیا تو ہمتی ہوئی سسکیلا
پھر ایک بار بلند ہو گئیں۔

آہ و فغاں کا ایک شور بلند ہو گیا۔

باپ تصویر بے کسی بنا اپنی جوان بیٹی کی لاش کو تکتا رہا۔
لب خاموش تھے۔ آنکھیں ساحل بنی ہوئی تھیں۔
لیکن دل —

دل تو ایک دیا بنا ہوا تھا۔

ماں اپنی بیٹی کو پکار پکار کر رو رہی تھی۔
بہنیں پھوٹ پھوٹ کر فریاد کر رہی تھیں۔

لیکن باپ اور بھائی —

نہ چیخ سکتے تھے، نہ رو سکتے تھے۔

نہ آپس بھر سکتے تھے نہ ماتم کر سکتے تھے۔

ذیشان کے بڑے بھائی چندیاہ قبل ہی جرمنی گئے تھے۔ وہ اتنی جلدی
نہیں آسکتے تھے، وہ اپنی بہن کے آخری دیدار سے بھی محروم تھے چھوٹا

اپنی بہن کی لاش پہ جھکا دھیرے دھیرے کے جا رہا تھا۔

”باجی امیری پیاری باجی! یہ تمہیں کیا ہو گیا؟“

”تم ایک دفعہ تو آنکھیں کھول کر دیکھ لیتیں باجی؟“
ذیشان اپنی امی کے بار بار بلانے پر بھی وہاں نہیں آیا تھا وہ بار بار یوسف
سے کہہ رہا تھا۔

”میں نہیں دیکھ سکتا یوسف! بالکل نہیں دیکھ سکتا۔“

اسے لے جاؤ، میرے دیکھے بغیر ہی لے جاؤ، اس کی صورت تو میرے
دل پر نقش ہے، آخری دیدار کر کے کیا کہہ دل کا؟“

لیکن یوسف اسے سمجھا بکھا کہ شانوں سے پکڑے ہوئے لے آیا۔

ذیشان کو دیکھتے ہی اس کی امی نے کہا۔

”دیکھ لو! ذیشان اپنی لاڈلی بہن کو، پھر کبھی نظر نہیں آئے گی یہ۔“

ذیشان اپنی امی کے شانے پر ہاتھ رکھے، ہونٹ، دانتوں تلے دبائے
بڑی حسرت سے اپنی بہن کی صورت تکتا رہا۔ اس کا چہرہ شدت جذبات سے
سرخ ہو رہا تھا۔

عفت کبھی ذیشان کو دیکھتی اور کبھی نزدت کو جو آنکھیں بند کئے دینا
وہاں سے بے خبر ادبی نیند سو رہی تھی، اس کا سارا سر سفید پٹیوں سے جکڑا
ہوا تھا۔ چہرے پر ایک ملکوتی نور تھا اور ہونٹوں پر خاموشی کی مہر۔
اور جب نزدت کا جنازہ اٹھا تو آہ و فغاں سے دو دیوار لہر لڑاٹھے،

زمین کانپ اٹھی، آسمان تھرا اٹھا۔

گھر آکر عفت منہ سر پٹیت کر پڑ گئی۔ نہ اس نے کپڑے بدلے نہ کھانا کھایا
سعدیہ باجی اٹاں کو پہلے ہی تپا چکی تھیں۔ اس لئے اٹاں لے بھی اس سے کھانا

”مجھے تسلی دینی بالکل نہیں آتی شہلا“
 ”سامنے جاؤ گی تو کوئی نہ کوئی بات سوچہ ہی جائے گی“
 ”چلو“ عفت کھڑی ہو گئی۔

ذیشان اپنے دوست سلیمان کی سفید ڈاٹن سے ٹیک لگائے خاموش کھڑا تھا
 سلیمان اور یوسف بھی اس کے پاس چپ چاپ کھڑے تھے۔ ذیشان کی نظر ان
 دونوں پر پڑی تو وہ خود ان کے قریب چلا آیا۔ شہلا کی ملاقات صبح ہی ذیشان سے
 ہو چکی تھی۔ وہ عفت اور ذیشان کو چھوڑ کر یوسف اور سلیمان کی طرف چلی گئی۔
 ذیشان نے ایک افسردہ نگاہ عفت پر ڈالی اور بولا۔

”کیسی ہیں آپ مس شجاع؟“
 عفت کا دل دکھ کر رہ گیا۔

اس سے پہلے اس نے ذیشان کا اس قدر بچھا بچھا چہرہ کب دیکھا تھا۔
 وہ چپ چاپ ذیشان کی طرف دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔
 ”میں بھلا اس کی دلجوئی کس طرح کر سکتی ہوں؟“
 ”یہ سچ ہے، الفاظ کے سہارے بعض اوقات بہت کھوکھلے اور بے بنیاد
 ثابت ہوتے ہیں“
 ذیشان نے کہا۔

”شہلا نے بتایا تھا کہ آپ بھی کھڑائی تھیں“
 ”یہ کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں تھی جس کا ذکر کر کے آپ شہد مندہ
 کر رہے ہیں۔“

کھانے کے لئے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ دل پر منوں بوجھ لئے چادر میں منہ چھپائے
 لیٹی رہی۔

ذیشان کئی دنوں کے بعد یونیورسٹی آیا تو شہلا نے اسے بتایا۔
 ”آج ذیشان آیا ہے“
 عفت نے کہا۔

”اچھا کہاں ہے؟“
 ”لوگ اس سے؟“
 عفت نے بھیجی ہوئی آواز سے کہا۔

”کیا کروں گی مل کر“
 ”ہم لوگوں کو اس کی دلجوئی کمر فی چاہتے۔“
 عفت نے سر جھکا کر کہا۔

”قدرت انسان کو بعض دفعہ ایسے دکھ دیتی ہے شہلا! کہ محض الفاظ کا
 سہارا لے کر ہم ان دکھوں کو کم نہیں کر سکتے۔“
 ”یہ تو ٹھیک ہے عفت! مگر ہمیں بہر حال اپنا فرض نبھانا ہے۔“
 عفت خاموش بیٹھی گل مہر کے درختوں سے جھڑے ہوئے نارنجی بالکل ہوا
 پھولوں کو دیکھتی رہی۔
 شہلا نے کہا۔

”ذیشان کا دل اس وقت غم سے بوجھ رہا ہے، ہمیں اس کی تسلی کے لئے
 کچھ نہ کچھ تو کہنا چاہیے۔“

”بہر حال! اس عفت! شکریہ“

”کس بات کا شکریہ؟“

”آپ ہمارے غم میں شرکت کرنے آئی تھیں، میرے نزدیک تو یہ بڑی اہم

بات ہے۔“

”پلیز! نشان صاحب! ایسی باتیں کر کے آپ مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔“

”سو تم میں آئی تھیں آپ؟“

”جی ہاں!“

”نشان پھر گری سوچوں میں ڈوب گیا۔“

”عفت اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے بولی۔“

”نشان صاحب! مجھے نہیں معلوم کہ ان لوگوں کو تستی کس طرح دی جاتی

ہے۔ جنہیں اپنوں سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کا صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔“

”نشان ہلکیں جھپکاتے بنا اس کی طرف دیکھتا رہا۔“

”اور یہ کتنا بھی بڑی رسمی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ آپ صبر کیجئے۔“

”صبر بھی آتے آتے ہی آتے گا میں عفت!“

”میں جانتی ہوں کہ آپ دوسری بہنوں کی نسبت خردت سے زیادہ پیارا

کرتے تھے۔“

”ہاں! یہ سچ ہے، میں اس سے بے پناہ پیار کرتا تھا، میں نے اسے

کبھی تنگ نہیں کیا۔“

”وہ جتنی بھی بے حد پیار سی لڑکی! میں تو اس سے صرف تین چار روز

کا جتنی لیکن ان مختصر سی ملاقاتوں میں ہی اس نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔“

”اچھے لوگ ہمیشہ بڑی جلدی ہم سے بچھڑ جاتے ہیں۔“

”نشان کی نگاہیں خلاؤں میں بھٹکنے لگیں۔“

”پھر چند منٹ بعد وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر بولا۔“

”وقت گزرتا ہے تو ہر غم کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔“

”عفت اپنے قدموں کے پاس بکھرے ہوئے زرد سوکھے پتوں کو نکلتی رہی۔“

”اور سنائیے! آپ کی اسٹڈی کیسی چل رہی ہے؟“

”ٹھیک چل رہی ہے۔“

”انسانہ نگاری کا کیا حال ہے؟“

”کافی دنوں سے کچھ نہیں لکھا۔“

”بہت مصروف رہتی ہیں؟“

”کوئی خاص مصروفیت بھی نہیں، پھر بھی جانے کیوں کچھ لکھ نہیں پاتی۔“

”چند منٹ تک دونوں خاموش کھڑے رہے۔“

”یوں — جیسے کہنے کے لئے اب کچھ نہ رہا ہو۔“

”اور سننے کو بھی کچھ باقی نہ بچا ہو۔“

”نشان کی نگاہیں عفت کے چہرے پر جم گئیں۔“

”اور عفت اس کی نگاہوں کو نظر انداز کر کے بالکل بے مقصد ادھر ادھر

دیکھ رہی تھی۔“

”ان کے ارد گرد اسکوڑوں، موڑ سائیکلوں اور گاڑیوں کا شور تھا۔“

قریبی کینٹین میں چائے کی پیالیوں کی کھنکھناہٹ تھی۔
مسکراہٹیں تھیں۔
قمقمے تھے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی باتیں کرنے کی دھیمی اور بلند آوازیں تھیں۔
قدموں کا شور تھا۔
اڑتی ہوتی دھول تھی۔

درختوں کی سرگوشیاں تھیں۔
اور درختوں سے گرتے ہوئے زرد مسکے پتوں کی بے حد دھیمی دھیمی آواز تھیں۔

ہوا کے جھونکوں سے گل مر کے دو تین پھول ٹوٹ کر زمین پر گر پڑے۔
ایک مرجھایا ہوا پھول عفت کے بالوں میں اٹک کر رہ گیا۔
ذیشان کی نگاہیں چند لمحے کے لئے عفت کے بالوں میں اٹکے ہوئے ہوئے
پر جم گئیں۔

اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”اس مرجھاتے ہوئے پھول کو آپ ہی کے بالوں میں اٹکنا تھا“

عفت اس کی بات سمجھ نہ سکی۔ اسے بالکل نہیں معلوم تھا کہ کوئی پھول
کے بالوں میں جگہ بنا بیٹھا ہے۔

اس نے چونک کر پوچھا۔

”جی!؟“

”آپ کے بالوں میں ایک پھول اٹک گیا ہے“
عفت کا ہاتھ فوراً اپنے بالوں کی طرف اٹھ گیا۔

”اگر پھول نر و نازہ ہوتا تو میں خاموش رہتا لیکن مرجھایا ہوا پھول آپ کے
بالوں میں دیکھ کر میں چپ نہیں رہ سکا۔“

عفت نے پھول نکال کر زمین پر ڈال دیا اور ذیشان کی طرف دیکھتے ہوئے
بولی۔

”اچھا! اب میں چلتی ہوں، آپ کے دوست بھی انتظار کر رہے ہیں۔“

ذیشان نے رسٹ واپس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”اب تو میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔“
عفت نے کہا۔

”شہلا کو بھیج دیجئے میرے پاس“

ذیشان سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

پل، لمحے، ساعتیں اور گھڑیاں چپ چاپ بدلتی چلی جاتی ہیں۔

وقت گزر جاتا ہے تو نہ عموں میں اتنی شدت باقی رہتی ہے اور نہ بچھلی یادیں

اتنی اذیت ناک رہ جاتی ہیں۔

ثروت کا دسواں، بیسواں اور چالیسواں ہوتا رہا اور حالات آہستہ آہستہ معمول

پراتے گئے۔ ذیشان کا دل کئی مہفتوں تک چڑھاتی سے اچھا نہ رہا۔ اس کے

دوستوں نے سمجھا بچھا کہ اس کی دماغی حالت کو نارمل کیا۔ یوں بھی یونیورسٹی میں

وہ اس کا آخری سال تھا، آئندہ فائنل میں اس کی پوزیشن تھی۔ لیکن اس سال بھی پوزیشن

نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

”تم نے ذیشان کے بارے میں کیا سوچا ہے عفت؟“

وہ چونک کر بولی۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ذیشان کو اب بہت زیادہ عرصہ تک یہاں نہیں آنا ہے۔“

”وہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔“

”تو پھر تم اسے کب تک لٹکائے رکھو گی؟“

”کیا فضول بات ہے، عفت برا مان کر بولی۔“

”اچھا بھئی! مذہب الفاظ میں یہ بات اس طرح کسی جاسکتی ہے کہ اگر ذیشان

تم سے شادی کرنا چاہے تو تمہارا جواب انکار میں ہو گا یا اقرار میں؟“

”مجھے اس قسم کی باتیں قطعی ناپسند ہیں، بہتر ہو گا تم کوئی اور بات کرو۔“

”دیکھو عفت! میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آتی کہ تم حقیقت کا اعتراف

کرنے سے بھجکتی کیوں ہو؟“

”کون سی حقیقت؟“

”یہ حقیقت نہیں کہ ذیشان تمہیں پسند کرتا ہے؟“

”اس نے کبھی مجھ سے نہیں کہا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔“

”زبان سے کہا جائے بھی تمہیں معلوم ہو گا؟“

عفت خاموش بیٹھی کوک پیتی رہی۔

”بس شہلا، امجد، یوسف اور سلیمان پانچوں یہ بات سمجھتے ہیں کہ ذیشان تمہیں

آنے پر اس کے بہتر مستقبل کا دار و مدار تھا۔ عفت کو بھی اس سال اپنی ڈیوڑھی کی بہت فکر تھی۔ یونیورسٹی میں ہونے والی آنے دن کی تقریبات کی وجہ سے وہ اپنی پڑھائی پر زیادہ توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ بھائی میاں آکے دن اسے تنبیہ کرتے رہتے تھے۔ اماں الگ ٹوکتی رہتی تھیں۔ انہی دنوں سعدیہ باجی کی شادی کا ہنگامہ بھی شروع ہو گیا۔ بڑی آپا کے یہاں ننھے مٹے عہان کی آمد آمد تھی۔ اماں چاہتی تھیں کہ ان کو اپنے گھر بلا کر رکھیں۔ لیکن بڑی آپا کی ساس اس موقع پر اتال اور بھائی میاں کو زیر بار نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اماں کی ایک نہیں اور بڑی آپا کے سارے چاچو بچے خود اٹھائے۔ سعدیہ باجی کی شادی سے پہلے ہی بڑی آپا نے اپنے گل گوٹھنے سے بیٹے کو جزم دیا۔ ان کی ساس نے بڑے چاچے سے اس کا نام کا شف رکھا تو صیت بھائی تو بیٹے کو پاکر بڑی آپا کا کچھ زیادہ ہی دلا کر نہ لگے۔

سعدیہ باجی نے اپنی شادی کے سلسلے میں ڈیپارٹمنٹ سے ایک ماہ کی چھٹی لے لی۔ عفت کو سعدیہ باجی کی شادی کے سلسلے میں کوئی زیادہ کام نہیں کرنا پڑا۔ بے چارہ سعدیہ باجی اس کی پڑھائی کا خیال کر کے خود ہی اماں کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ سعدیہ باجی کی شادی کے بعد گھر میں اور بھی زیادہ مشاٹا ہو گیا۔ عفت شادی کے موقع پر تقریباً دس دن کی چھٹی لی تھی۔

شادی کے بعد وہ یونیورسٹی گئی تو اس روز ذیشان نہیں آیا تھا۔ شہلا سے معلوم ہوا کہ اسے بڑا سخت فلو ہے وہ پھر کو سہی کلاسز ٹانڈ کرنے کے بعد رخصتی کے ساتھ لاہور میری کے سامنے والے لان میں بیٹھی کوک پی رہی تھی کہ

”پھر وہی بے نیکی بات“

”اچھا تو تک والی بات تم ہی کرو۔“

”تک والی بات یہ ہے کہ اس نے مجھ سے کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی، تم سے بھی نہیں کی، تو پھر میں اس کے متعلق کیا سوچوں؟“

”مجھے یقین ہے عفت! کہ عنقریب ہی کسی نہ کسی کے ذریعے ذیشان کا پیغام تم تک پہنچے گا۔“

”تو پہنچے دو۔“

”میں چاہتی ہوں تم ابھی سے سوچ سمجھ کر اپنے آپ کو تیار رکھو۔“

”اس کا پیغام پہنچنے سے پہلے ہی میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے۔“

رخشندہ ایک دم کھل اٹھی اور عفت کے قریب جھکے ہوئے بولی۔

”کیا فیصلہ کیا تم نے؟“

”میرا جواب انکار میں ہو گا رشتی!“

”کیوں؟ آخر کیوں؟“ رخشندہ بے چین ہو گئی۔

”یہ میرا فیصلہ ہے میں یہاں کے کسی مرد سے شادی نہیں کروں گی۔“

”میں کسی اور کی بات نہیں کر رہی ہوں، میں صرف ذیشان کی بات کر رہی ہوں۔“

”ہاں۔“

”ذیشان ہو یا کوئی اور ہو، سب کے لئے میرا ایک ہی فیصلہ ہے۔“

”اس فیصلے کی کوئی وجہ تو ہوگی“

”کوئی وجہ نہیں۔“

”بے پناہ چاہتا ہے۔“

”اچھا!“

”نہیں سمجھتیں تو غمی نہیں سمجھتیں۔“

عفت تو بل ایک طرف ڈال کر درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس قدر معصوم بننے کی کوشش کیوں کرتی ہو؟“

”اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم میرے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہو؟“

”عفت! میں تمہاری دوست ہوں دشمن نہیں۔“

”میں بھی تمہیں اپنا دوست ہی سمجھتی ہوں“

”میں نہ کبھی تمہیں کوئی غلط مشورہ دوں گی اور نہ تمہارے لئے کوئی ایسا

بات پسند کروں گی جو تمہارے لئے نقصان دہ ہو۔“

”اچھا پھر؟“

”پھر یہ کہ ذیشان اگر کوئی ایسا وسیلہ لگا ہوتا تو میں تمہیں اس کے سامنے

مجھ دور رہنے کی نصیحت کرتی۔“

”اور کچھ؟“

”لیکن ذیشان کیونکہ ہر لحاظ سے بہت ہی ڈسینٹ لڑکا ہے اس لئے یہ

نہیں چاہتی کہ تم اسے ٹھکرا کر زندگی بھر بچھتاؤ رہو۔“

”میں نے کب کہا کہ وہ کوئی برا لڑکا ہے“

”تو پھر اس کے متعلق سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتی ہو؟“

” چلتی پھرتی لاسٹیں بھی تو ہوا کرتی ہیں۔“

” چھوڑو، کوئی اور بات کرو رشتی! “

عفت نے بڑی بے دردی سے گھاس کے تنکے نوچتے ہوئے کہا۔

رشتہ کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ کتا ہیں سمیٹ کر گھر جانے کے لئے

کھڑی ہو گئی۔ عفت اسے بس اسٹاپ پر چھوڑ کر لائبریری میں آگئی۔

اس نے سوچا۔

” صبح گھر سے کنارہ بردست موڑ بنا کر آتی تھی لائبریری میں بیٹھ کر پڑھنے

کا، مگر اب تو مشکل ہی نظر آتا ہے۔“

وہ شیلف کے پاس کھڑی ہو کر کتا ہیں دیکھنے لگی۔ پھر دو تین کتا ہیں لے

کر میز پر آگئی۔ بڑی دیر تک بیٹھی پڑھنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن ایک

لفظ بھی داغ میں نہیں گھس رہا تھا۔ وہ اٹھ کر گیلری میں چلی گئی۔ ریلنگ پر

دونوں کمئیاں ٹکائے وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

اس کی نظریں ادھر ادھر بھٹکتی گئیں۔

بہت دور مار تھے ناظم آباد کی پہاڑیاں سرمئی دھند لکڑوں میں ڈوبی خاموش

کھڑی تھیں۔

سپر لائی وے پر سے گزرنے والے رٹک اور گاڑیاں دور سے بہت

چھوٹے چھوٹے کھلونے سے نظر آ رہے تھے۔

سنہری مائل نیلگوں دھند کے حذر نظر تک پھیلی ہوتی چھوٹی، بڑی عمارتوں

کو اپنی بانہوں میں سمیٹے چپ چاپ دشتِ فلک کو تک رہے تھے۔

” میں نہیں مانتی۔“

” تم نہ مانو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ “

” کم از کم تمہیں مجھ سے تو کوئی بات نہیں چھپانی چاہیے۔“

” رشتی! میں نے اب سے تین سال قبل ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں جہاں پڑھوں

گی۔ وہاں کے کسی مرد سے شادی نہیں کروں گی اور..... “

” اور؟ “

” اور اگر آئندہ زندگی میں، میں نے ملازمت کی تو اپنے ساتھ کام کرنے والے

مردوں میں سے بھی کسی کے ساتھ شادی نہیں کروں گی، “

” فیصلے پتھر کی لکیر تو نہیں ہوا کرتے کہ انہیں بدلا ہی نہ جاسکے۔“

” میرے فیصلے کو پتھر کی لکیر ہی سمجھو “

” یہ ظلم ہے عفت۔“

” ظلم؟ کس پر؟ “

” ذیشان پر، “

” کبھی کبھی ہم دوسروں پر ظلم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

” تم تو بس اپنے افسانوں کے ڈائلاگ بولے جاؤ اور وہ غریب اپنی جان سے

جائے گا۔“

” وقت سے پہلے کوئی اپنی جان سے نہیں جاتا۔“

” جان سے جانے کا یہی مطلب تو نہیں ہوتا کہ انسان قبر میں جاسوئے “

عفت چپ بیٹھی رہی۔

خود رو جھاڑیاں سر جھکائے ہوئے لمحوں کے گزرنے کی صدا سن رہی تھیں۔

سلاسنے والی سڑک پر سے بسیں، منی بسیں، سکوڑ اور موڑ سائیکلیں شور کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

لوٹکوں اور لڑکیوں کے غول کے غول اپنی اپنی دھن میں مگن لائبریری سے بس اسٹاپ اور بس اسٹاپ سے مختلف شعبوں کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

اور وہ چپ چاپ کھڑی سوچے جا رہی تھی۔
”اپنے ہی ہاتھوں چینی ہوئی دیواروں میں خود کو محصور کرنا کتنا اذیت ناک ہے رشتی!“

”تم کبھی نہیں سمجھ سکو گی۔

اُس سے سب کو بھردی ہے۔

سب کو پیار ہے۔

اور خود تجھے؟

میں نے تو کبھی اپنے دل کو ٹٹونے کی کوشش ہی نہیں کی۔

کبھی اپنے ذہن کو کر دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔

رشتی جو کچھ کہتی ہے اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو۔

تو پھر انجام کیا ہو گا۔

کچھ پتہ نہیں۔

کچھ خبر نہیں

خدا کرے کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہو ذیشان۔

رشتی اور دوسرے لوگ جو کچھ سمجھتے ہیں۔

اس میں ذرا سی بھی حقیقت نہ ہو۔

تمہارے دل کے ایوان میں جس کے قدموں کی دھیمی دھیمی چاپ

گونجتی ہو۔

وہ میں نہ ہوں۔

کوئی اور ہو۔

تمہارے ذہن کے پردے پر جس کی پرچائیں بکھر پھرتی ہو۔

وہ — میں نہ ہوں۔

کوئی اور ہو

تمہاری آنکھوں میں جس کے خواب سمجھتے ہوں۔

وہ — میں نہ ہوں

کوئی اور ہو

کوئی اور ہو ذیشان!

وہ کوئی اور ہو۔

اس کا دل بے چین ہوا اٹھا

آنکھوں میں مٹی سی اتر آئی

اندر ریڈنگ روم میں لوٹ کے لڑکیوں کی تھم سی سرگوشیاں چند لمحوں کے

لئے اُبھرتیں اور پھر خاموشی کی تہہ میں ڈوب جاتیں۔

کبھی ریڈنگ روم اپنا راج کی آواز اُبھرتی
کبھی کمرسی کھسکانے کا ہلکا سا شور بلند ہوتا

اور پھر —

وہی سناٹا طاری ہو جاتا

وہی خاموشی چھا جاتی۔

ہوا کے جھونکوں سے اس کے بال بکھر کر ماتھے پر آگئے تھے۔

وہ انگلیوں سے اپنے بالوں کو پیچھے کرتی ہوتی ریڈنگ روم میں چلی آئی
کتے ہیں واپس کر کے اس نے اپنا شناختی کارڈ لیا اور اسے پرس میں ڈالتی ہوئی
ریڈنگ روم سے باہر آگئی۔

اور اسی رات — اپنی بے خواب آنکھوں کی چھین سے گھر کر

بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ساتھ والے بستر پر فوزی بے خبر ہو رہی تھی۔ سب کے کمروں میں
اندھیرا تھا۔ چھوٹی آپا بھی آج جلدی سو گئی تھیں۔

اس نے سوچا —

وہ ٹیبل لیپ جلا کر پڑھنا شروع کر دے۔

امتحانوں میں اب دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔

مگر آج دوپہر سے وہ ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکی تھی۔

مچھائی میاں نے آج شام ہی اس سے کہا تھا۔

”عفت بیٹی! اس سال پوزیشن لانی ہے۔“

اس نے باورچی خانے میں اماں کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی تو اماں نے
بڑے لاڈ سے کہا۔

”تم رہنے دو عفتو! امتحان قریب ہیں جا کر پڑھائی کر دو۔“

وہ اگلے دن کے لئے کپڑوں پر استری کر کے جا رہی تھی کہ فوزی نے اس
کے ہاتھ سے کپڑے لے لئے۔

”لائیے، میں آپ کے کپڑے استری کر دوں، آپ پڑھئے۔“

عفت کا دل چاہا۔

وہ فوزی سے کہہ دے کہ اب تک جتنی پڑھائی ہو چکی ہے اسے ہی
غفلت سمجھو، اگے کے لئے صرف دعا کرتی رہو۔

مگر فوزی —

وہ بے چاری ان باتوں کو بھی کیا سمجھتی؟

وہ چپ چاپ فوزی کے ہاتھ میں کپڑے تھما کر وضو کرنے چلی گئی۔

اس نے پڑھنے کی کس قدر کوشش کی تھی۔

مگر رخصتہ نے بے موقع اور بے وقت جو راگنی پھیلتی تھی۔ اس نے
عفت کو کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔

نہ اپنی سوجوں پر اسے کوئی اختیار رہ گیا تھا۔

الانہ نبند اس کی اپنی رہ گئی تھی۔

اسے رخصتہ پر بے پناہ غصہ آیا۔

میرے دل کے سنگھاسن پہ کوئی مورتی براجمان نہیں۔

پھر بیکسی تیرگی ہے جو —

میرے وجود کو اپنی سیر و سخت ہانہوں میں سمیٹ رہی ہے۔

زمینہ زمینہ اترتی ہوئی رات کے سائے طویل ہوتے رہے اور وہ سوچتی ہی۔

کچھ باتیں —

گزر رہی ہوئی

کچھ اشارے

مہم سے

کچھ وسوسے تھے۔

جو دل کو خوفزدہ کر رہے تھے۔

کچھ اندیشے تھے۔

جن کا تعلق مستقبل سے تھا۔

فوزی نے سوتے سوتے کمر وٹ بدلی تو اس کی کلائی میں بڑی سنہری کاپیٹ

کی چوڑیاں بچ اُٹھیں۔

سناٹے بکھر گئے

خاموشی ٹوٹ گئی۔

اس نے درپے درپے کھڑے کھڑے پلٹ کر فوزی کی طرف دیکھا اور اپنے

بستر پر آگئی۔

اس واقعہ کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ رخشندہ کی کہی ہوئی باتیں حقیقت

وہ بستر سے اتر کر دستکے میں چلی آئی۔

رات اپنی بانہیں پھیلائے چپ چاپ اگے بڑھ رہی تھی۔

چاندنی کا اشردہ غبار زمین پر برس رہا تھا۔

سڑک پر جلتے ہوئے بلبوں کی مدھم روشنیاں اندھیروں کا تعاقب کرتی

ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

چار سو پھیلی ہوئی خاموشی جیسے اس کی راز دار بن گئی تھی۔

چنبیلی کی نرم و نازک شاخوں کا سایہ سامنے والے کمرے کی دیوار پر پڑھا

رہا تھا۔

سفید منہ بند کلیاں گہری سوچوں میں ڈوبی ڈھلتی رات کے گزرنے

کی آہٹ سن رہی تھیں۔

اس کے دل کی کیفیت بڑی عجیب تھی۔

اتنی عجیب —

جتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔

اسے یوں محسوس ہوا۔

جیسے وہ درد کی انجانی منزلوں سے گزر رہی ہو۔

اس نے سوچا —

یہ درد یہ سبب ہے؟

میں نے تو کسی کو نہیں چاہا

پھر میری روح درد کے انبار تلے کیوں دب جاتی ہے؟

بن کر سامنے آگئیں۔
ایک روز صبح وہ یونیورسٹی پہنچی تو کلاس روم کے سامنے والے لائن پر
اسے شہلا مل گئی۔

چند رسمی سی باتوں کے بعد شہلانے کہا۔
”عفت! آج مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“
عفت چونک گئی۔

اس کا دل دھڑک اٹھا، لیکن فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو کنٹرول کر لیا
ہوئے کہا۔

”خیریت تو ہے؟“

شہلانے لا پرواہی سے کہا۔

”ہاں! کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔“

”کون سی ضروری باتیں ہیں؟ ابھی کر لو۔“

”تم اس وقت فری ہو؟“

”ہاں۔“

”اچھا! آؤ، کسی اور طرف چلتے ہیں۔“

”کیوں؟ یہاں کیا حرج ہے؟“

”یہاں آس پاس لوڑکیاں بہت ہیں۔“

عفت اپنی نائل اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

وہ دونوں سامنے والے کوریڈور کی طرف بڑھ گئیں۔

کوریڈور کے آخری سرے پر — جہاں لکچر روم ختم ہوتے تھے۔
بڑی خاموشی تھی اور تنہائی۔

سامنے بھوری زمیں پر حوزہ جھاڑیاں سرسٹھائے شفاف نیلے آسمان کو
تک رہی تھیں۔

جھاڑیوں میں کھلے ہوئے چھوٹے چھوٹے زرد اور کاسنی پھول آہستہ آہستہ
بھوم رہے تھے۔

اور ہوا جھاڑیوں اور پتھروں کے درمیان سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر رہی تھی۔
عفت ایک ستون کا سہارا لے کر فرش پر بیٹھ گئی۔ شہلا بھی اس کے قریب
ہی بیٹھ گئی۔

اور پھر — شہلانے اس سے وہی سب کچھ کہا جس کی پیشین گوئی رخشندہ
پہلے ہی کر چکی تھی۔ عفت ستون سے سرٹکائے چپ چاپ شہلا کی باتیں سنتی رہی۔
شہلا اپنی بات ختم کر کے کچھ دیر عفت کے بولنے کی منتظر رہی۔ لیکن عفت تو
بیٹھ رہی۔ موجود ہی نہیں تھی۔

شہلانے مسکرا کر کہا۔

”تم نے تو چپ ہی سادھ لی عفت!“

”پھر کیا کروں؟“

”کچھ اپنے دل کی بات بھی تو کہو۔“

”اپنے دل کی بات“ عفت کا لہجہ مدہم تھا۔

”تمہیں ذہنشان کیسا لگتا ہے؟“

عفت چند سیکنڈ تک بڑی گہری سوچوں میں ڈوبی رہی پھر سر اٹھا کر بولی۔

”دیکھو شہلا! اگر پسند چاہت اور محبت جیسے جذبات کو درمیان میں نہ لاؤ تو ذیشان بہت اچھا ہے بہت شریف ہے، یونیورسٹی میں کم از کم میں تو کسی ایسے لڑکے سے مل نہیں جو ذیشان کی برابر کی کر سکتا ہو۔“

”تمہاری یہ ساری قصیدہ خوانی اپنی جگہ پر ٹھیک ہے لیکن یہ میری بات میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“

”تمہارے سوال کا جواب انکار میں ہے۔“

”عفت!!“

شہلا نے بے یقینی اور حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

عفت اپنا سیدھا سا پاٹ چہرہ لے کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”میں نے اپنے سوال کا جواب تم سے ابھی تو نہیں مانگا تھا۔“

”ہوں۔“

”تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو، پھر مجھے بتا دینا۔“

”سوچ سمجھ کر ہی جواب دیا ہے۔“

”بس نہیں مان سکتی۔“

”یہ حقیقت ہے۔“

”یعنی تم بے ہوش و حواس یہ بات کہہ رہی ہو کہ تمہیں ذیشان کو اپنا زندگی بنانا منظور نہیں ہے۔“

”ہاں۔“

”جانے کیوں مجھے یقین نہیں آتا۔“

”تمہارے یقین ذکر کرنے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔“

”ذیشان میں کیا برائی ہے؟“

”کوئی برائی نہیں۔“

”جہاں تک مجھے علم ہے تم کسی کے لئے آنگیج بھی نہیں ہو۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”اکثر گھرانوں کی طرح کہیں تم بھی تو خاندانی روایات اور بندشوں کی وجہ سے

بجور نہیں ہو؟“

”ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا وجہ ہے عفت؟“

”وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ میں نے خود اپنے اوپر یہ پابندی لگائی

ہے کہ میں یہاں کے کسی مرد سے شادی نہیں کروں گی۔“

”ایسا کون سا عیب دیکھ لیا تم نے یہاں کے مردوں میں؟“

”عیب کی بات نہیں ہے شہلا۔“

”تو پھر کیا بات ہے؟“

”میرے لئے یہی فیصلہ کرنا مناسب ہے۔“

”یہ سرسراہٹ حاکت ہے۔“

”تم جو چاہو کہہ لو۔“

”یعنی تم اپنا فیصلہ نہیں بدلو گی“

”نہیں۔“

”یہ تو سراسر نا انصافی ہے اس بے چارے کے ساتھ“

عفت خاموش رہی۔

”شاید تمہیں اندازہ نہیں، وہ تمہیں کتنی شدت سے چاہتا ہے“

”میرے لئے یہی بہتر ہے کہ اس کی چاہت کی شدت کا اندازہ مجھے کبھی

نہ ہو۔“

شہلا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”بہتر ہوگا، تم تنہائی میں اس موضوع پر سوچو“

عفت نے سوچا۔

”تنہائی میں سوچنے پر بھی میرا یہی فیصلہ ہوگا،“

لیکن اس نے شہلا سے کچھ نہیں کہا۔ سر جھکائے ہوئے کورڈیور میں اس کے

ساتھ چلتی رہی۔

اس روز گھر میں وہ تنہا تھی۔ شام کو سو کر اٹھی تو سب گھر والے کسی

تقریب میں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ اس کی پڑھائی کے خیال سے

کسی نے اس سے چلتے کے لئے اصرار نہیں کیا۔ ان لوگوں کو گھر سے نکلتے نکلنے پر

کا وقت ہو گیا۔ سب کے جانے کے بعد عفت نے کھانا کھایا، چائے بنا کر پی اور

اپنے ذہن کو بڑی مشکل سے آمادہ کر کے پڑھنے کے لئے بیٹھ گئی۔ پھر اسے کچھ

والے گھر میں کسی نے ٹرانسکسٹر آن کیا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ وہ ڈر مڑب ہو گئی اس نے

اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ مگر گانے کی آواز تھی کہ پھر بھی کانوں میں گھسی چلی جاتی تھی۔

یاد کرو گے، یاد کرو گے، ایک دن ہم کو یاد کرو گے۔

تیرا پو گے، فریاد کرو گے، ایک دن ہم کو یاد کرو گے۔

اس نے پوری دل جمعی سے پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا دل اُچاٹ ہو

چکا تھا۔ اس نے کتاب کے درمیان پیسل رکھ کر کتاب بند کر دی اور کرسی کی پشت

سے مڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔

بند آنکھوں میں ایک شبیدہ لہرا گئی۔

ایک تصویر تھمرا اُٹھی۔

جلنے پہچانے سے نقش و نگار

دیکھا، بھالا سا سراپا

ایک واضح صورت

ایک گم سم سی صورت

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

اور پکوں کو جھپکاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

یہ نہیں ہونا چاہیے

یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

بہرے سوچوں پہ اپنے وجود کی پرچھائیں نہ پڑھنے روزِ بستان!

میرے خیالوں کو آزاد رہنے دو۔

جھوٹے پتے
پھولوں کی البیلی سی مہک
آکاش سے دھرتی پر اترتے ہوئے خاموشی کے لمحات
اور ننہانی

اپنی عادت سے عجوبہ ہو کر وہ دھیرے دھیرے گلگانے لگی۔

دل کی لگی ہے کیا یہ کبھی دل لگا کے دیکھ
آنسو بہا کے دیکھ کبھی مسکرا کے دیکھ
پروانہ جل رہا ہے مگر جل رہا ہے کیوں
یہ راز جاننا ہے تو خود کو جلا کے دیکھ

اور پھر — ایک کے بعد ایک اس نے پانچ، چھ گانے گلگانا ڈالے۔
برابر والی پڑوسن کا بچہ رویا تو وہ خاموش ہو گئی۔

چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ نیم کی شاخوں میں چھپا کوئی بیچھی
بڑی نور سے پھر بھڑایا اور چند پتیاں ٹوٹ کر اس کے اوپر آ گئیں۔ اس نے
ایک ہاتھ سے پتیوں کو جھاڑ کر گرہ لیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔
جانے کس طرف سے شہلا کی آواز آئی۔

”بہتر ہو گا تم اس موضوع پر تنہائی میں سوچو۔“

پھر کہیں سے رخسندہ کی آواز آئی

”فیصلے پتھر کی کیک تو نہیں ہوا کرتے کہ انہیں بدلا ہی نہ جاسکے۔“

اس کی سوچوں نے پھر اس کے سامنے ذلثان کی شبیہ کو

وہ کر سی سر کر کر کھڑی ہو گئی اور باہر آگن میں آگئی۔ چار پاتی کو بیچ آگن میں
گھسیٹ کر وہ ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی کھلے آسمان کے نیچے لیٹ کر
اسے بڑا سکون ملتا تھا۔ اس کی نگاہ آسمان پر اٹھ گئی۔ سیاہی مائل نیلگوں آسمان پر
ٹپٹاتے ہوئے ستاروں کا قافلہ بنا آہٹ کے آگے بڑھ رہا تھا۔

پیلہ، گول، بڑا سا چاند نیم کی سب سے اونچی شاخ کے پیچھے چھپا اپنی ٹھڈا
ٹھنڈی کر نہیں زمین پر بکھیر رہا تھا۔

بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے انجانی سمتوں میں اڑے جا رہے تھے۔
آگن میں بنی ہوئی کیا ریوں کے درمیان ہوا سرسرتی پھر رہی تھی۔
نیم کی پتیوں میں ایک بھیل تھی۔

ایک شہد تھا —

دھما دھیماسا

اور باورچی خانے کی دیوار پر برابر والے گھر کے آگن میں لگے بادام کے درخت
کا خوبصورت سایہ آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا۔
رستی پر شکے ہوئے کپڑوں کے آڑے تر پچھے سائے ہوا کے جھونکوں سے
لرز رہے تھے۔

تھم تھم کے گزرتی ہوئی رات کے ریشمی سائے۔

نیم کی اونچی شاخ کے عقب سے جھانکتا ہوا چاند
ٹپٹاتے ستاروں کا قافلہ

اڑتے بادل

سجا دیا۔

اسی وقت کال بیل بجی۔ وہ چلیں پہنتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ سب واپس آگئے تھے۔ ذیشان کی شبیہ پھر کہیں دھندلاہٹوں میں گم ہو گئی۔

شہلانے دو، تین روز بعد پھر وہی ذکر پھیلنا۔
عفت کا جواب اب بھی وہی تھا۔
شہلا کو اس کی دماغی حالت پر شک گذرا۔
اس نے کہا۔

”عفت! میں تمہیں کیا سمجھوں؟“

عفت چپ رہی۔

”تم جانتے بوجھتے ہوئے ایک ایسے لڑکے کو ٹھکرا رہی ہو جس کے لئے
یہاں کی جانے لگتی لڑکیاں دیوانی ہو رہی ہیں۔“
عفت کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”تمہیں اس کی خوبیوں کا بھی اعتراف ہے، تم پر کوئی پابندی بھی نہیں
کوئی خانہ دانی روایت بھی تمہارے پاؤں کی زنجیر نہیں، پھر بھی اس قدر

اجتماع فیصلہ

عفت تنگ آکر بولی۔

کوئی اور بات کرو شہلا

”اچھا یہ تباؤ تمہیں دلیشان سے محبت ہے یا نہیں۔“

عفت ایک لمحے کے لئے خاموش رہی پھر بولی۔

”نہیں“

”یہ دل کا فیصلہ ہے یا دماغ کا؟“

”دونوں کا“

”تو پھر تم سے زیادہ بے حس لوط کی میں نے نہیں دیکھی“

”جو چاہو کہہ لو“

”یعنی تمہارے اوپر کسی بات کا کوئی اثر نہیں؟“

”معلوم نہیں“

”تم بے حس ہی نہیں، سنگدل بھی ہو“

”اور کچھ“

”ذیشان کو کھو کہہ کہیں تمہیں کچھ پتا نہ پڑے“

”کچھ پتا دے اگر میری قیمت میں کچھ ہیں تو نہ میں کچھ کہہ سکتی ہوں نہ کوئی“

دوسرا

”یہ بہت غلط انداز ہے سوچئے گا“

”کون سا انداز؟“

”حماقت تم خود کرو اور الزام سارا قسمت کو دے دو۔“

”خدا را باب اس ممنوع کو یہیں ختم کرو شہلا“

”کیسے ختم کروں؟ کسی کی آئندہ زندگی کا سارا دار و مدار تمہارے فیصلے پر

ہے اور تم ہو کہہ...“

”میں نے سنا تو دیا اپنا فیصلہ“

”یہ فیصلہ سن کر تو اس کی جان پر بن جائے گی۔“

”سب وقتی جذبات ہوتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یہاں سے جانے کے بعد وہ میرے بارے میں اتنا نہیں سوچے

گا جتنا اب سوچتا ہے اور دو، تین سال بعد جب اس کی شادی ہو

جائے گی تو وہ مجھے بالکل بھول جائے گا۔“

”وہ تمہارے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔“

”آخر کب تک نہیں کہہ لے گا؟“

”کبھی نہیں کہہ لے گا۔“

”یہ سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں، عمل کوئی نہیں کرتا۔“

”تم اپنے سانخے سانخے اس کی جان کی دشمن بھی بن رہی ہو۔“

”تم سب لوگوں کو بڑی ہمدردی ہے دلیشان سے“

”دوسرے لوگوں کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہتی۔ لیکن میرے لئے وہ

ایک اچھا دوست ایک اچھا بھائی ہے۔“

ذیشان نے اس موضوع پر عفت سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن وہ محسوس کرتی تھی کہ ذیشان ان دنوں بہت الجھا الجھا سا رہتا تھا۔

پھر رخصت شدہ اور شملہ کو جانے کس نے مشورہ دیا کہ انہوں نے ذیشان کے بارے میں عفت سے بحث کر فی چھوڑ دی یا پھر انہیں امتحانوں کا خیال آگیا جو بالکل ہی سر پر کھڑے تھے۔ ان دنوں سب ہی ہر بات بھول کر کتابوں پر جھکے رہتے تھے۔ امتحان شروع ہوئے تو اور بھی نفسا نفسی کا عالم ہو گیا۔ ذیشان اور عفت جیسے طالب علموں کو تو اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔ امتحان ختم ہوئے تو سب نے سکھ کا سانس لیا۔ عفت کے پرچے بہت اطمینان بخش ہوئے تھے۔ یونیورسٹی کے چیکر اب بھی لگتے رہتے تھے۔ کوئی اپنے پریکٹیکل کی وجہ سے آتا تھا، کسی کے ذہن پر تھیسس سوار تھی۔ اور بیشتر لوگ ملنے ملانے کے خیال سے نفس تفریحاً کرتے تھے۔

یونین کو اپنی جو کچھ کارگزاری دکھانی تھی۔ وہ دکھا چکی تھی۔ اس یونین کے ریانہام بہت سے کامیاب فنکشنز ہو چکے تھے۔ یوسف نے عفت سے کہا تھا۔ امتحانوں کے بعد ایک اہم میٹنگ ہو گی کچھ ضروری حساب کتاب کرنا تھا۔ یوسف بھی پہنچ گیا۔ عفت بھی پہنچ گئی۔ لیکن جنرل بیکر ٹری جہاں زیب جانے کیوں نہیں آسکا تھا۔ میٹنگ ملتوی ہو گئی۔ اس روز رخصت شدہ، شملہ، عرفانہ اور پریون سبھی آئی ہوئی تھیں۔ لڑکے تو خیر روزانہ ہی آتے تھے ان کے لئے گھر میں نہ دلچسپی کا کوئی سامان تھا اور نہ انہیں کوئی کام تھا۔ پھر وہ گھر میں بیٹھ کر کیا کرتے۔ عفت نے گھر جانے کا ارادہ کیا تو یوسف نے اسے روک لیا۔

عفت سر جھکائے جانے کیا سوچتی رہی۔

”اس کی بربادی میرے لئے اتنی ہی تکلیف کا باعث بنے گی جتنی میرے

اپنے بھائیوں آصف اور عامر کی۔۔۔۔۔“

لیکن وہ برباد نہیں ہو گا، کوئی لڑکا بھی برباد نہیں ہوتا، سب آباد خوش رہتے ہیں۔

شملہ افسردہ صورت لئے بیٹھی رہی۔

”اور شملہ! ایک بات میں تمہیں بتا دوں، جنت کے پیچھے کوئی لڑکا

اپنے آپ کو برباد نہیں کرتا“

”سب لڑکوں کو ایک جیسا مت سمجھو“

”یہ تو لڑکیاں بے چاری ہی ہوتی ہیں جو اس جذبے کے پیچھے اپنی

زندگی ویران کر لیتی ہیں۔“

”نہ ساری لڑکیاں باوقاف ہوتی ہیں اور نہ سارے لڑکے بے وقاف ہو

ہیں۔“

”اچھا بھئی! اب اس بحث کو جانے بھی دو۔“

عفت اکتا کر بولی۔ شملہ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

لیکن اس کے بعد شملہ نے اپنا معمول ہی بنا لیا۔ جمال عفت کے

بیٹھنے کا موقع ملتا۔ وہ اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی اور ذیشان

لئے اس کے خیالات بدلنے کی کوشش کرتی۔ یہی طرز عمل رخصت شدہ

اختیار کر رکھا تھا اور عفت کے پاس روز اول والا ہی جواب ہوتا تھا۔

دشوار لگ رہا تھا اور شاید سی صورت حال یوسف کو بھی درپیش تھی مگر وہ —
جو ذیشان پہ جان چھڑکتا تھا۔ اس کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار تھا۔
یوسف نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

”میں آپ سے ذیشان کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“
عفت ایک لمحے کے لئے نزوس ہوئی لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو
نارل کر لیا۔

”شہلا اور رخشندہ آپ سے بہت کچھ کہہ چکی ہیں۔“

عفت پھر بھی خاموش رہی۔

”اگرچہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ نے ذیشان کے بارے میں کیا فیصلہ
لیا ہے، لیکن پھر بھی میں از سر نو اس موضوع پر آپ سے بات کرنا چاہوں گا۔“

عفت نے بڑی متانت سے اس کی طرف دیکھا اور یولی۔

”وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ یوسف صاحب؟“

”کیا مطلب؟“

”آپ کیا سمجھتے ہیں؟ رختی اور شہلا کو میں اور کوئی جواب دوں گی اور آپ
کو کوئی اور؟“

یوسف عفت کی صاف گوئی پر حیران سا رہ گیا۔

”میرا جواب اب بھی وہی ہے اور آئندہ بھی اس میں کسی رد و بدل کی
گنجائش نہیں ہے۔“

اس کا ناقابل تسخیر چٹان کا سا فیصلہ سن کر یوسف کو بہت دکھ پہنچا لیکن

”آپ ابھی گھرنہ جلے گا۔“

عفت نے چونک کر پوچھا

”کیوں؟“

”مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

وہ دونوں اس وقت یونین آفس میں بیٹھے تھے۔ باقی لوگ چند منٹ
قبل ہی اٹھ کر باہر کوریڈور میں گئے تھے۔

عفت نے کہا۔

”رختی اور شہلا چلی نہ جائیں ورنہ مجھے اکیلا جانا پڑے گا۔“

”نہیں، فی الحال گھر کوئی نہیں جلے گا۔“

عفت نے کہا۔

”اچھا تو پھر جلدی کیجئے۔ جو کتنا ہے۔“

”جلدی کس بات کی ہے؟ اطمینان سے سنئے اور اطمینان سے ہی سو رہا

جواب بھی دیجئے گا۔“

عفت نے ہریشان ہو کر سوچا۔

”یقیناً اس وقت یوسف بھی اُنسی موضوع پر بات کر رہے گا۔“

اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یوسف بھی رخشندہ
کی طرح ذیشان کی حمایت میں اس سے گفتگو کر سکتا ہے۔ لیکن اب تو وہ
چکی تھی۔ مجبوراً اسے یوسف سے بات کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا
وہی یہ حقیقت تھی کہ ذیشان کے بارے میں یوسف سے بات کرنا اسے

”اس میں ناقدری کی کیا بات ہے؟“

”یہ ناقدری نہیں تو اور کیا ہے۔ دوسری بے شمار ہمتیاں اس کے لئے بدلتی ہیں، وہ ہے کہ صرف آپ کے سامنے کا تعاقب کر رہا ہے لیکن پھر

بھی۔“

اس نے افسردہ ہو کر سر جھکا لیا۔

عفت چپ چاپ بیٹھی اس کی افسردہ صورت کو نکلتی رہی۔ چند سیکنڈ بعد

وہ بولا۔

”یہ بات مجھے آپ سے کہنی تو نہیں چاہیے لیکن پھر بھی میں کہہ رہا ہوں کہ۔“
وہ ایک لمحے کے لئے رکا۔ عفت جستم سوال بنی اس کی طرف دیکھ رہی

فی۔

”اگر میری بہن شاہانہ کے لئے اس کے دل میں ایسے جذبات ہوتے تو میں
اپنی اور شاہانہ کی خوش قسمتی پر فخر محسوس کرتا۔“

عفت کی پلکیں آہستہ سے لرز کر رہ گئیں۔

”اس کے کردار کی اچھائی اور اس کی شخصیت کی خوبصورتی کے لئے میں اس
سے بڑی اور کیا بات کہہ سکتا ہوں؟“

عفت نے ایک طویل سانس لے کر سر کر سی کی پشت سے ٹکا دیا اور

ل۔

”ویسے! میں پوچھ سکتی ہوں کہ ذیشان نے مجھ سے بات کرنے کی بجائے
اپ لوگوں کے ذریعے یہ بات مجھ تک کیوں پہنچائی؟“

اس نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری۔
”میں ایک بھائی، ایک دوست کی حیثیت سے آپ کو سمجھانا اپنا فرض

سمجھتا ہوں۔“

”سمجھایا تو ان لوگوں کو جاتا ہے۔ یوسف صاحب! جو جذبات میں آکر

کوئی فیصلہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔“

”ہوں،“ یوسف گری سوچ میں ڈوب گیا۔

”میں نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔“

”اگر آپ نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا

آپ کا فیصلہ انتہائی غیر منصفانہ ہے۔“

”یہ تو صرف آپ کا خیال ہے نا۔“

”صرف میرا ہی خیال نہیں ہے، بلکہ شہلا اور خشی نے بھی یقیناً آپ سے

یہی کہا ہوگا۔“

عفت خاموش رہی۔

”میں آپ سے یہی کہوں گا کہ جب آپ کو ذیشان کی خوبیوں کا بھی اعتراف

ہے تو آپ سنجیدگی سے ذیشان کے بارے میں سوچیں۔“

”غیر سنجیدہ تو میں اب بھی نہیں ہوں۔“

یوسف مسکرا کر بولا۔

”یہ تو واقعی جملہ مغترضہ ہو گیا، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم لوگ آپ

غیر سنجیدہ دیکھنے کی حسرت ہی لے کر جا رہے ہیں اس یونیورسٹی سے

یوسف کے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے دوبارہ کہا۔

”ٹھیک ہے وہ اچھا لڑکا ہے، بہت اچھا ہے، لیکن کیا اسے یہ بات تو یہ چاہتا تھا کہ یہ بات گھر کے بزرگوں کے درمیان ہی طے پائے۔“

”ان کوئی تذکرہ ہی نہ ہو۔“

”پھر اتنے سارے لوگوں میں یہ بات کیسے پھیلی؟“

”کتنے سارے لوگ؟ صرف ہم پانچ چھ افراد ہی تو ہیں۔“

”اس بات کو وہ صرف اپنے آپ تک بھی تو رکھ سکتا تھا،“

”کے سامنے دینا پھرے؟“

یوسف نے جبران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”دوسرے کون؟“

”در اصل میں نے ہی اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ گھر تک بات پہنچنے سے

طے سے آپ کی رائے معلوم کر لینی چاہیے۔ وہ کسی طرح آپ سے بات کرنے

کا ارادہ نہیں تھا اس لئے شہلا کا سہارا لینا پڑا۔“

عفت نے کہا۔

”ہم آپ کے لئے غیر تو نہیں ہیں۔“

”لیکن اس قسم کی باتیں آپ لوگوں سے کہہ کر اس نے میری عزت

کو یا آپ کا فیصلہ نہیں بدلے گا۔“

کتنی حفاظت کی ہے؟ ذرا اس سے پوچھتے؟“

”نہیں۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں عفت؟ ہم سب آپس میں بہت

دوست ہیں، آپ سمیت ساری لڑکیوں کی عزت کو ہم اپنی عزت

سمجھیں۔“

عفت کی سی کھسکا کر کھڑی ہو گئی۔

”ہیں۔“

عفت خاموش بیٹھی رہی۔

”اور ایسا مذاہر کی بات تو یہ ہے کہ دلیشان نے آپ کے بارے

”اے دلیشان! ابھی اچھے لوگوں سے دینا خالی تو نہیں ہوتی۔“

لیکن دلیشان جیسا آپ کو کبھی کوئی نہیں ملے گا۔“

عفت خاموش رہی۔

”کیا تھا۔“

اس وقت ذیشان پر عفت کی نگاہ پڑی تو اسے رخشندہ کی صبح کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے بڑی مشکل سے مسکراہٹ کو منبٹ کیا۔ ذیشان اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عفت نے پوچھا۔

”یہاں کیسے کھڑے ہیں؟“

”انتظار کمرہ تھا۔“

”انتظار؟“

”جی ہاں! میٹنگ ختم ہونے کا،“

”کوئی خاص بات؟“

”جی۔“

”کیا؟“

”آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”سب کچھ تو آپ دوسروں کی زبانی کہلو اچکے، اب کون سی بات باقی ہے؟“

ذیشان کا چہرہ ایک دم کچھ کمرہ گیا۔

اس نے سر جھکا کر کہا۔

”مجھے معلوم ہے آپ مجھ سے بدگمان ہو گئی ہیں اور ناراض بھی ہیں۔“

”گویا آپ کو احساس ہے کہ آپ نے غلطی کی ہے۔“

”اگر آپ اسے غلطی سمجھ رہی ہیں تو پھر میں اپنی صفاتی میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

”غلطی اور صفاتی کی بات تو خیر آپ جانے دیکھئے، آپ سے مجھے صرف یہ

یوسف کمرے سے باہر نکل آیا۔ عفت نے باہر نکلی کمرہ دیکھا۔ وہ لوگ طرف والے بل کے باہر کمرہ سپوں پر بیٹھ باتیں کر رہے تھے۔

اگلے روز یونین کی میٹنگ ختم ہوئی تو عفت نے دیکھا۔ ذیشان دایہ

راہداری میں ریلنگ کا سہارا لے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کے بھروسے ہوا

بال ہوا سے اڑ کر ماتھے پر پکھڑ گئے تھے۔ چہرے کی رنگت سرخی تامل ہو رہی

عفت اس کے قریب چلی آئی۔ ذیشان کا منہ ابھی تک ٹھیک نہ

تھا، ناک سرخ ہو رہی تھی اور آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ رخشندہ نے

بڑے رازدارانہ لہجے میں بتایا تھا۔ آج ذیشان بے حد پیارا لگ رہا ہے

عفت نے اسے چھیڑنے کے لئے کہہ دیا

”وہ کب پیارا نہیں لگتا۔“

”ارے نہیں آج تو نظر لگ جانے کی حد تک پیارا لگ رہا ہے

عفت مسکرا کر رہ گئی۔

”تمہیں تو اس کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے ورنہ تمہی سے کہتی کہ اس کا

انار دو۔“

”شروع کر دی تم نے کواکس۔“

”اچھا تم خود دیکھ لینا، نیوی، بیلو پیٹ اور چیک دار شرٹ میں

ڈھار لہ ہے۔“

”اچھا بس! ختم کر و قصیدہ خوانی۔“

رخشندہ نے منہ بسور لیا۔

پوچھنا ہے کہ آپ کو جو کچھ کہنا تھا آپ نے مجھ سے کیوں نہیں کہا؟
ذیشان خاموش کھڑا اس کی طرف دیکھنا لگا۔

عفت نے اپنے لمبے کی برہمی کو دور کرتے ہوئے کہا۔

”حقیقت بہر حال حقیقت ہوتی ہے، کسی کو چاہنا یا نہ چاہنا ایک فطری جذبہ ہے، مجھے اس سے انکار نہیں لیکن.....“
وہ ایک لمحے کے لئے رکی۔

”اس جذبے کا انتشار دینے والی بات مجھے قطعی پسند نہیں آتی۔“
”آپ یقین کیجئے مس عفت! جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں میرے ارادے کو قطعی دخل نہیں تھا۔“

”آپ کا خیال ہے یہ سب کچھ خود بخود ہو گیا؟“

”اصل میں حالات ہی کچھ اس قسم کے ہو گئے کہ میں دوسروں کے کہنے پر

یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔“

”بلت اگر رشتہ اور شہلا ناک محدود ہوتی تو پھر بھی غنیمت تھا۔ لیکن آپ نے

تو اپنے دوستوں تک کو یہ افسانہ سنا دیا۔“

ذیشان نے بڑی سادگی سے کہا۔

”صرف یوسف، سلیمان اور احمد ہی کو تو معلوم ہے۔“

”جی ہاں! یہ تین لڑکے اپنے حلقے میں کہیں گے، باقی لڑکے اس بات کو

اور آگے بڑھائیں گے، پھر میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں

رہوں گی۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ یوسف وغیرہ کو آپ ایسا سمجھتی ہیں؟“

”بس رہنے دیجئے ذیشان صاحب! مجھے اپنی رسوائی کسی صورت بھی

گوارا نہیں۔“

”آپ کو میرے دوستوں کی شرافت اور منانیت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔“

”میں تو خیر ایک سال بعد یہاں سے چلی جاؤں گی لیکن میری بہن یہاں

پڑھاتی ہیں، ان کا خیال بھی نہیں آیا آپ کو؟“

ذیشان نے بڑے تحمل سے کہا۔

”میں تو ہر قدم پر بہت غماخ رہا ہوں عفت! پھر بھی آپ اس قدر شاکہ

ہیں۔“

”یونیورسٹی میں تو ویسے ہی ذرا سی بات کا بنگلہ بن جاتا ہے، اگر میرے

ادراپ کے بارے میں کوئی بات مشہور ہو گئی تو میری بہن کا تو یہاں رہنا

وہ بھر ہو جائے گا۔“

ذیشان کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

”وہ جس طرف سے گزریں گی لوگ انہیں دیکھ کر سرگوشیاں کریں گے

کہ ان کی بہن.....“

ذیشان اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”افو! عفت! آپ تو کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہی ہیں۔“

”پتہ نہیں جذباتی میں ہو رہی ہوں یا جذباتی آپ ہو گئے تھے جو آپ

نے یہ سارا چکر بھیلایا ہے۔“

ذیشان ایک دم مسکرا دیا۔

”کوئی چکرتہ کرتے نہیں ہے، آپ خواغخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔“
 ”دوسروں کے لئے لوگ اسی انداز سے سوچتے ہیں جب اپنا معاملہ آتا ہے تو اندازِ فکر بدل جاتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میں ایک مثال دینے والی ہوں آپ برائے مانجیے گا۔“

”کوئی سی مثال؟“

”فرض کیجئے کہ آپ کی بہن کے لئے کسی شخص کے دل میں یہ جذبات ہونے اور وہ اپنے دوستوں میں اس بات کو کتنا پھرتا تو آپ کے دل پر کیا گزرتی ہے؟“

ذیشان مسکرا کر بولا۔

”آپ ابھی خود ہی اعتراف کر چکی ہیں کہ کسی کو چاہنا یا نہ چاہنا ایک فطری جذبہ ہے تو پھر میں اس جذبے سے کیسے انحراف کر سکتا ہوں۔“
 ”یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہوا۔“

”آپ ہی کے سوال کا جواب ہے۔“

”وہ کس طرح؟ میں سمجھی نہیں۔“

”بھئی! اگر وہ شخص میری بہن کے لئے سیریس ہوگا تو میں فوراً کہہ دوں گا کہ تم دونوں شادی کر لو۔“

”سیریس ہوتا ہی کون ہے یہاں تو لوگ فلرٹ کرتے ہیں۔“

ذیشان کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس کی شفاف پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

”دوسروں کی بات میں نہیں کرتا لیکن میں بہر حال سیریس ہوں۔“

”آپ برا کیوں مان گئے؟ میں نے تو ایک جنرل بات کہی ہے۔“

ذیشان سینے پر دونوں ہاتھ باندھے، ہونٹ دانتوں تلے دبائے جاملے کیا سوچنے لگا۔

عفت نے کہا۔

”جو کچھ ہوا اسے بھول جائیے اور اب اس ٹاپک کو یہیں ختم کر دیجئے۔“

ذیشان نے سر اٹھا کر بڑی عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا

اور بولا۔

”میں کیا سمجھوں؟“

”جی!؟“

”میرے لئے اب بھی آپ کا وہی فیصلہ کیا ہے۔ جو میں دوسروں سے

سن چکا ہوں؟“

”جی یقیناً۔“

”آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کر سکتیں؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”بس! آپ جو کچھ چاہتے ہیں میں اسے مناسب نہیں سمجھتی“

”یہ کوئی مناسب بات نہیں ہے عفت!“

”اپنا اپنا خیال ہے۔“

”کیا میں اتنا بڑا ہوں کہ آپ میرے بارے میں اس انداز سے سوچنا بھی

پسند نہیں کرتے ہیں۔“

”آپ کی شان میں جو کچھ قصیدہ خوانی میں کرتی رہتی ہوں مجھے یقین ہے

وہ آپ تک ضرور پہنچتی رہتی ہوگی۔“

عفت نے مسکرا کر کہا۔

ذیشان نے بچھے بچھے سے لمحے میں کہا۔

”کیا فائدہ اس قصیدہ خوانی کا“

”کیوں؟ آپ ذرا بھی خوش نہیں ہوتے اپنی تعریفیں سن کر۔“

”میں جس بات سے خوش ہو سکتا ہوں۔ اس کا انداز آپ کو اچھی طرح

ہے۔“

”وہ باب تو میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ختم کر دیا، اب اس پر بحث کی

کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

”اس قدر ظالمانہ فیصلہ کرتے ہوئے آپ کو ذرا بھی دکھ نہیں ہوا؟“

”یس ذیشان صاحب! انسان بعض دفعہ بڑا مجبور ہو جاتا ہے۔“

ذیشان کا چہرہ ایک دفعہ پھر پرامید نظر آیا۔ وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں

کو ماتھے پر سے سمیٹتے ہوئے بولا۔

”اگر آپ اپنی بات کر رہی ہیں تو پھر وہ مجبور ہی بھی بتادیں۔“

”دیکھتے ذیشان صاحب! صاف صاف بات بتا دوں آپ کو؟“

”بتاتیے بھی کسی طرح۔“

”بات یہ ہے ذیشان صاحب! آپ میں یقیناً بہت سی خوبیاں ہیں،

لیکن آپ کے بارے میں میں نے جب کبھی بھی سوچا، میرے دل سے یہ

آواز کبھی نہیں آتی کہ میں آپ سے شادی بھی کر لوں۔“

”گویا آپ نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا۔“

”ہو سکتا ہے میں نے اپنے آپ کو ہی آپ کے قابل نہ سمجھا ہو۔“

”نہیں خیر! آپ تو جو کچھ ہیں وہ دوسرے ہی جانتے ہیں، آپ کو تو

شاید اپنی خوبیوں کا علم ہی نہیں ہے۔“

عفت کچھ چھپ کر بولی۔

”چھوڑیے کوئی اور بات کیجئے۔“

”شہلانے بتایا تھا کہ آپ کے اوپر نہ گھر کی طرف سے کوئی بندش ہے

نہ کوئی اور بات ہے، آپ نے خود ہی اپنے آپ کو مجبور بنا رکھا ہے۔“

عفت نے برائے کر کہا۔

”اچھا چلتے یونہی سہی، پھر مطلب کیا ہے؟“

”اگر آپ نے کوئی قسم کھا لی ہے تو اسے توڑ دیجئے۔“

”قسم توڑوں؟ کفارہ کون ادا کرے گا؟“

”کفارہ بھی ادا ہو جائے گا، پہلے آپ قسم تو توڑیئے۔“

”خدا خواہ مشرانے لجانے والی لڑکیاں پسند ہوتیں تو آپ کے سامنے
اس قدر خوار کیوں ہوتا؟“

ذیشان کا انداز قدرے ناراضگی لئے ہوئے تھا۔ عفت کو ہنسی
آگئی۔

”بہت خوش ہو رہی ہیں۔“

”کس بات پر؟“

”یہ تو آپ کو ہی پتہ ہوگا“

”اچھا میں سمجھی۔“

”کیا؟“

”یہ جو اک ذرا اسی ہنسی آگئی مجھے اسی لئے کہہ رہے ہیں نا!“

”ہاں! مگر یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آپ کو ہنستے دیکھ کر ڈھیروں خون بڑھا
ہے میرا۔“

عفت ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”اچھا! اب آپ مزید سنجیدہ ہونے سے پہلے مجھے یہ بتا دیجئے کہ آپ

اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی زحمت کریں گی یا نہیں؟“

”نہیں ذیشان صاحب! یہ میری درخواست ہے کہ اس موضوع پر

اُب مجھ سے کوئی بات نہ کیجئے گا۔“

پھر ذیشان جیسے بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ اس نے ایک طویل سانس

لے کر کہا۔

عفت مسکرا کر بولی۔

”نہیں جناب! یہ توڑنے پھوڑنے والی بات تو ہمیں سرے سے

ناپسند ہے۔“

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب ہم لوگوں کے درمیان اس ٹاپک پر

کوئی بات نہیں ہوگی لیکن.....“

”لیکن؟“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی امی کو آپ کے گھر بھیج دوں۔“

”قطعاً نہیں۔“

”اس میں کیا حرج ہے؟“

”آپ میرے والدین کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ میں یہاں پڑھنے

کے بجائے اپنے لئے بے تلاش کمرنی آئی تھی۔“

ذیشان جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”بڑی مشکل ہے۔“

”کس بات کی مشکل؟“

”ایک تو آپ کی صاف گوئی مار ڈالتی ہے۔“

”جی؟“

”آپ بڑی سے بڑی بات اس قدر آرام و اطمینان سے کہہ دیتی ہیں کہ

دوسرے شخص کو جواب دینے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے۔“

”کیا چاہتے ہیں آپ؟ شرانائے جانا شروع کر دوں۔“

”جیسی آپ کی مرضی! اگر آپ اسی طرح خوش ہیں تو یونہی سہی“
عفت نے پوچھا۔

”اچھا تو اب مجھے اجازت؟“

”ہاں! جب نہ کچھ کہنا ہے نہ سننا ہے تو پھر یہاں کھڑے رہنا ہے۔“
”ہے۔“

”پھر — خدا حافظ۔“ عفت نے کہا۔

”خدا حافظ۔“

عفت نے رینگ کے قریب نیچے جھک کر دیکھا۔ رخشندہ اور شہلا
اس کے انتظار میں کھڑی جانے لگی تھیں۔ وہ نیچے تیرا
لگی جاتے جاتے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ زیشان رینگ پر دونوں کہنیاں لٹا
سر جھکاتے، گری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

لمحے چپ چاپ گزرے جا رہے تھے۔ امتحانوں کے بعد اب اس
فرصت تھی۔ سعدیہ باجی کی طرح اس سال اس نے کنگ کلاسز جو اس کر لیں
ایک دن یونہی موڈ بنا تو اس نے ایک ناولٹ شروع کر دیا۔ جب اس
گھر کے مالی حالات اچھے ہوتے تھے اس نے ہر اچھی کتاب خریدنی شروع
کر دی تھی۔ مختلف قسم کی ادبی کتابوں کا اس کے پاس اچھا خاصہ ذخیرہ
ہو چکا تھا۔ شیلیف میں سچی ہوتی کتابوں پر جب بھی اس کی نگاہ پڑتی اس کا
دل مست سے دھڑک اٹھتا۔ رات کو سونے سے پہلے مطالعہ کرنے کی اس
ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ جب تک کچھ نہ کچھ پڑھ نہیں لیتی تھی۔ اسے

نہیں آتی تھی۔ وہ بڑی احتیاط سے اپنی کوئی نہ کوئی پسندیدہ کتاب نکالتی اور
رات گئے تک پڑھتی رہتی۔ اس کا دوسرا پسندیدہ مشغلہ آگن میں تاروں کی
چھاؤں کے نیچے لیٹے لیٹے، دھم آواز میں گنگنا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا، تیسرا
گانا وہ ایک تسلسل کے ساتھ گنگنا تے جاتی۔ اگر کبھی بجائی میاں یا فرخ بجائی اس
طرف آنکلتے تو وہ جھینپ جاتی، جلدی سے اٹھ کر بیٹھ جاتی اور یوں گانوں کا
تسلسل ٹوٹ جاتا۔

رخشندہ اور شہلا اکثر اس کے پاس آ جاتیں، وہ خود بھی کبھی فوزی کو
لے کر اور کبھی تنہا ان کے گھر چلی جاتی۔ سعدیہ باجی اور بڑی آپا اپنے گھروں میں
بہت خوش تھیں۔ وہ جب بھی اماں اور بجائی میاں سے ملنے آتیں۔ کبھی فوزی
اور کبھی عفت کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جاتیں دونوں کے سسرال والے
بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔ بڑی آپا تو ایک بیٹیا پیدا کرنے کے بعد کچھ اس طرح
سراٹکھوں پر بٹھائی جاتی تھیں کہ عفت کو شک آتا تھا۔ امتحانوں کے بعد کے
تین چار مہینے بڑی جلدی گزر گئے۔ ایک کے بعد ایک کے سب کے زلٹ
آگئے۔ زیشان کی فرسٹ پوزیشن آتی تھی۔ یوسف اس دفعہ کوئی پوزیشن نہیں لے
سکا تھا۔ عفت کی فرسٹ ڈویژن آتی تھی۔ شہلا کی پوزیشن دوسری تھی۔ رخشندہ
غلام، پروین، امجد اور سلیمان سینکڑ ڈویژن میں پاس ہوتے تھے رخشندہ
اور عفت ایم۔ اے (فائنل) میں آگئی تھیں اور باقی سب ساعقی یونیورسٹی کو
خیر باد کہنے والے تھے۔

ایم۔ اے (فائنل) کا زلٹ پہلے آیا تھا۔ زلٹ والے روز شہلا عفت کے

”کوئی بات نہیں، شروع شروع میں یونہی ہوا کرتا ہے، وقت گزرے گا، تو وہ سب کچھ معمول جلتے گا ہاں! اگر تمہارے جی کو کوئی روگ لگ گیا تو تم نہیں سنبھل پاؤ گی۔“

اور وہ مطمئن سی ہو گئی۔

ذیشان اس روز بہت مصروف تھا۔ عفت سے اس کی بہت مختصر سی ملاقات ہوئی۔ عفت نے اسے مبارکباد دی۔ تو وہ بڑے غم و انداز سے مسکرا کر بولا۔

”شکریہ“

دونوں کچھ دیر بہت رسمی قسم کی باتیں کرتے رہے اور پھر عفت اسے خدا حافظ کہہ کر گھر واپس آ گئی۔

اور جس روز عفت کا زلٹ آیا۔ اس روز ذیشان بھی آیا ہوا تھا۔ عفت بس یہ اتنے کہ ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی کہ داسنے طرف والے لان کو پار کر کے ذیشان آ گیا۔ وہ اپنی سوچوں میں ڈوبی تنہا چلی جا رہی تھی۔ اس نے ذیشان کو نہیں دیکھا۔

ذیشان نے اس کے بالکل قریب آ کر آواز دی۔

”عفت!“

وہ چونک گئی، اس نے پلٹ کر دیکھا۔

”آپ ہیں؟“

”جی! آپ کیا سمجھی تھیں؟“

گھر آئی۔ وہ اسے اپنے ساتھ یونیورسٹی لے جانا چاہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ آج زلٹ آیا ہے سارے ساتھی جمع ہوں گے۔ ملاقات ہی ہو جائے گی۔ عفت نے یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ زلٹ تم لوگوں کا آیا ہے۔ آنرز فائنل کا تو نہیں آیا میرا جانا فضول ہے۔ شہلانے یہ رعب جمانا شروع کر دیا کہ میں تو اپنے گھر سے سیدھی بھی جاسکتی تھی، محض تمہارے ساتھ کے خیال سے یہاں تک آئی ہوں اور تم ہو کہ خرے دکھا رہی ہو۔ عفت کا ذرا بھی موٹو نہیں تھا لیکن شہلا دھڑلا کر بیٹھ گئی کہ جاؤں گی تو تمہیں لے کر جاؤں گی ورنہ تمہیں جاؤں گی۔ پھر عفت بادل نحواستہ تیار ہو گئی۔

یونیورسٹی میں اس نے ذیشان کو دیکھا۔ لڑکوں کا ایک گروپ اس کا پیچھا چھوڑتا تھا تو دوسرا گروپ اسے گھیر لیتا تھا۔ کبھی اس کی کلاس فیلو دیکھا لے کر غے میں لے لیتی تھیں۔ ہر شخص اسے مبارکباد دے رہا تھا، کوئی پارٹی تقاضا کر رہا تھا۔ کوئی دعوت کا اور کوئی چائیز کھانوں کی فرائض کر رہا تھا۔ عفت سب کی مبارکباد قبول کرتے ہوئے منہں بھی رہا تھا۔ مسکرا بھی رہا تھا۔ مگر عفت نے غصہ کیا کہ اس کی مسکراہٹ پھیک پھیک تھی، اس کے قہقہے بے جان تھے، اس کے آنکھوں کی چمک کچھ ماند سی تھی اور چہرہ بچھا بچھا سا تھا۔ اس نے گہرا کہہ سوجا۔

”کیا اس کی کیفیت میری وجہ سے ہے؟“

دل نے چپکے سے دھڑک کر کہا۔

”ہاں! یہ تم ہو عفت! تم ہی تو ہو۔“

دماغ سے آواز آئی۔

”شکریہ، مگر یہ کوئی بڑی بات تو نہیں“

”بڑی بات کیوں نہیں؟“

”اور کیا، آپ کی طرح ٹاپ کمرتی تو ایک بات بھی تھی۔“

”پلے کوئی بات نہیں، ایم۔ اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ لے آئے گا۔“

”آپ دعا کیجئے گا۔“

”دعا؟“ ذیشان کی مسکماہٹ بڑی سوگوار سی تھی۔

”کیوں؟ میرے لئے دعا کرنے میں کوئی عار ہے آپ کو؟“

”نہیں، یہ بات نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

”اپنی دعاؤں کے بارے میں شبہ ہی رہتا ہے۔“

”کیوں؟“

”شرف قبولیت نہیں حاصل ہونا نہیں“

”آپ کو کیسے معلوم ہوتی یہ بات؟“

”ساری زندگی میں بس دو ہی دعائیں مانگی تھیں خدا سے، وہ بھی قبول

نہیں ہوئیں۔“

عفت خاموش کھڑی اس کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہی۔

ذیشان نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”آپ پوچھیں گی نہیں، کون سی دو دعائیں مانگی تھیں میں نے؟“

”یہ سوچ کہ چپ ہوں کہ معلوم نہیں آپ بتائیں یا نہ بتائیں۔“

”میں — میں کیا سمجھی تھی؟“

”جی۔“

”اصل بات یہ ہے کہ میں نے آواز تو ضرور سنی تھی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا

کہ کس نے پکارا ہے۔“

ذیشان بڑے تاسف سے سر ہلا کر بولا۔

”خوب! بڑی جلدی! اجنبی بن گیا میں آپ کے لئے“

”جی!! کیا مطلب؟“

”مانا کہ آپ میرے بارے میں سوچا پسند نہیں کرتیں لیکن ایسا بھی

کہ آپ میری آواز تک نہیں پہچان سکیں۔“

”بپ برا مان گئے؟ میں معافی چاہتی ہوں۔“

”معافی کی تو کوئی بات نہیں، ویسے بھی اب میں تو دو چار دفعہ کا ہمارا

ہوں یہاں۔“

”جی!!“

”اور کیا، دو چار کام ہیں جن کی وجہ سے یہاں آنا پڑے گا ورنہ اس کے

بعد یہاں اپنا کیا کام۔“

عفت چپ کھڑی رہی۔

”اچھا خیر! چھوڑتے، ذیشان نے کہا۔

”ہوں۔“ عفت جانے کس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”فرسٹ ڈوشین میں پاس ہونا مبارک ہو۔“

ہے کہ باہر جا کر سی۔ اسے کا کورس کر لوں۔“

”پھر تو آپ وہیں گئے ہو رہیں گے، واپس آنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔“

”ابھی تک تو میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن.....“

”لیکن؟“

”اب آپ نے احساس دلایا ہے تو سوچتا ہوں، واقعی واپس آ کر کیا کروں گا؟“

”انسان کو اتنا خود غرض بھی نہیں ہونا چاہیے۔“

”اس میں خود غرضی کی کیا بات ہے؟“

”آپ کے گھر والوں نے آپ سے نہ جانے کتنی اُمیدیں کتنی توقعات

وابستہ کر رکھی ہوں گی، ان کا خیال تو کرنا چاہیے آپ کو۔“

”ذیشان سوچ میں ڈوب گیا۔“

عفت نے پوچھا۔

”کیوں؟ کیا میں نے غلط کیا؟“

”ہوں اٹھیک کستی ہیں آپ“

”صرف میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے، بات آپ کے عمل کرنے کی بھی ہے۔“

”ہو سکتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ میرے اماناز فکر میں تبدیلی آجائے“

اور میں آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہو جاؤں۔“

”میں نے کوئی نصیحت نہیں کی ہے آپ کو، بلکہ تصویر کا صحیح رخ دکھانے

کی کوشش کی ہے۔“

”میں اس کے لئے آپ کا شکریہ گزار ہوں۔“

”آپ پوچھ کر تو دیکھیں“

”اچھا تو پھر تبادیں۔“

”ایک دعا شروت کی زندگی کے لئے مانگی تھی، اس کا انجام آپ دیکھ رہی

چکی ہیں اور.....“

ذیشان کچھ کہنے کتے رک گیا۔

عفت نے پوچھا۔

”اور؟“

”دوسری دعا کا تعلق آپ سے ہے، اس کے پورے ہونے کا بھی کوئی

امکان نظر نہیں آتا۔“

عفت نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے بھینچ لئے اور جانے کیا سوچے لگی۔

”آپ کیا سوچنے لگیں؟“

”کوئی خاص بات نہیں، بس یونہی، ذہن کسی وقت خالی رہنا ہی نہیں

چاہتا۔“

پھر وہ بات کا رخ بدل کر بولی۔

”ویسے اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

”کس بارے میں؟“

”سروس کے لئے کہیں اپلائی کیا ہے آپ نے؟ یا اعلیٰ تعلیم کے لئے

باہر جانے کا ارادہ ہے؟“

”فی الحال تو دو تین نمکوں میں درخواستیں دے رکھی ہیں، ویسے میرا

”شکریہ گزار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

ذیشان پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھٹکے کچھ سوچنے لگا۔ عفت چند سیکنڈ ٹھک اس کے پڑمرودہ چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر اپنی رٹ واپس پر نظر میں ڈالتے ہوئے بولی۔

”اچھا اب مجھے اجازت دیجئے“

”خدا حافظ“

”خدا حافظ“

عفت آگے بڑھ گئی۔

ایم۔ اے فائنل میں آنے کے بعد عفت نے اپنی توجہ انہماقی سے پڑھائی کی طرف مبذول کر دی۔ یونیورسٹی میگزین کی ادارت میں اس کا نام بھی شامل تھا۔ دوسری ادبی تقاریب میں بھی وہ وقتاً فوقتاً شرکت کرتی رہی۔ لیکن اس سال اس نے الیکشن کے ہنگاموں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ہر آئینہ آساں یونیورسٹی کے ماحول میں غیر محسوس طور پر بڑی تبدیلی لے کر آتا تھا، جتنے اچھے طالب علم یونیورسٹی سے پڑھ کر جاسے تھے، اتنے اچھے طالب علم آتے ہی نہیں تھے۔ نئے طالب علموں میں اچھے لڑکے لڑکیوں کی تعداد کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی۔ اخلاقی قدروں بھی بتدریج متزلزل ہو رہی تھی۔

عفت اور رخشندہ نے گزشتہ سال کی بہ نسبت اس سال لائبریری میں زیادہ بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ شہلا کا سا انتخاب بھی تھا۔ وہ ریسرچ کر رہی تھی اور اپنا بیشتر وقت لائبریری میں گزارتی تھی۔ یوسف، سلیمان اور امجد اب بھی کبھی

کبھی یونیورسٹی میں نظر آجاتے تھے۔ ذیشان صرف دو دفعہ نظر آیا تھا۔ شہلا نے عفت کو بتایا تھا کہ ذیشان کالو۔ بی۔ ایل میں تقرر ہو گیا ہے ان دنوں وہ یو۔ بی۔ ایل اثاث کالج میں ٹیٹنگسے رہا تھا۔

ایم۔ اے فائنل میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ انگلش ڈیپارٹمنٹ کے انشاعیات نے عفت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی خاص کوشش کی وہ انگریزی کا پڑھتا بہترین مقرر تھا اور آڈیٹ سے بھی اسے خاصا لگاؤ تھا۔ اس کا ادبی ذوق بھی کافی بلند تھا۔ ایک ادبی نشست کے موقع پر ہی عفت سے اس کا سامنا ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ آغا شجاعت عفت کو سہراہ روک کر ”ہیلو“ کہہ دیتا۔ عفت جواباً تو ”ہیلو“ ضرور کہہ دیتی۔ لیکن اس نے اپنی طرف سے پہل کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔

آغا شجاعت نے ”ہیلو، کہنے کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھایا تو دو چار رسمی باتیں کرنے کے بہانے راہ روک کر کھڑا ہو جانا۔ عفت دل پر جبر کر کے بڑی ہزار می سے اس کی باتوں کا جواب دیتی اور آگے بڑھ جاتی۔

پھر نائد خان نے اسے بتایا کہ آغا شجاعت تم ہیں انٹرسٹڈ ہے نائد خان بھی میگزین کے اردو سیکشن کی مدیرہ خصوصی تھی، رخشندہ اور شہلا نے بھی اسے نصیحت کی کہ آغا شجاعت سے بچ کر رہنا۔ اس کے ارادے خطرناک نظر آتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں اس کے دل کا پیغام صاف پڑھا جاسکتا ہے۔

اس کی سرخ و سفید رنگت اور بہت تیکھے نقوش کی وجہ سے ہمیں ڈر ہے کہ لیں تم اس سے متاثر نہ ہو جاؤ اس میں دوسری متاثر کرنے والی خوبیاں یہ ہیں

کہ اس کا اور مہتا را ذوق بھی ملتا ہے اور پھر وہ ایک عدد نئے ماڈل کی کار کا مالک بھی ہے۔

کبھی ہے۔
عفت نے ان کی باتیں سن کر بے حد حیران ہو گیا کہ سوچا، احوال و لا قوتہ اب میں
کیا اس قدر رست و نہایت کی ہوں کہ کسی لڑکے کی سرخ و سفید رنگت تک مجھے فوٹو
اور نئے ماڈل کی کار دیکھ کر اس پر مر مٹوں گی، اگرچہ مجھے یہاں کے ہی کسی لڑکے سے
شادی کرنی ہوتی تو ذیشان میں آخر کس بات کی کمی تھی، میرے دل و دماغ میں
اب محبت اور شادی کا خانہ خالی ہے۔“

ابھی محبت اور توادد کی حالت جاری ہے۔
 ناملہ خان کی زبان سے یہ سن کر کہ آغا شجاعت اس میں انٹرسٹڈ ہے
 عفت نے گھر جا کر آئینے میں بے حد تنقیدی نگاہ سے اپنا جائزہ لیا اور
 ”آخر مجھ میں ایسی کونسی بات ہے جو آغا شجاعت مجھ میں انٹرسٹڈ ہے“
 اسے احساس ہوا کہ وہ نہ حین ہے نہ خوبصورت تو پھر؟ اس نے یہ
 سوال ناملہ خان سے کیا۔

”ارے!! تمہیں آج تک یہی نہیں معلوم کہ حسن اور خوبصورتی کسے

حققت نے کہا۔

” ممکن ہے یہی بات ہو۔“

”خوبصورتی اور حسن و راصل دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے آٹا نہ کہ خان نے کہا۔“

کی اور تمہاری جمعہ جمعہ آٹھ دن کی دوستی ہے، وہ کون ہوتی ہے آغا شجاعت کا اور تمہارا سبند باندھنے والی؟ پہلے تو ہمارا حق بنتا ہے تم پر۔“
ان دونوں کو یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ کہیں دیشیان بے چارہ بالکل ہی نہ مارا جائے، عفت کی بات کہیں طے ہونے تک امید کی ایک ہلکی سی کرن تو باقی تھی نا!

پھر عفت نے آغا شجاعت کے قدم اپنی جانب اور نہیں بڑھنے دیے پانی سر سے اوسچا ہونے سے پہلے ہی اس نے بند باندھ دیا۔ آغا شجاعت کا پیغام دل سے نگاہ تک تو آ گیا۔ مگر زبان تک آنے سے پہلے ہی عفت نے اسے تنبیہ کر دی۔ اس نے شرملے یا بھانے کے بجائے آغا شجاعت سے صاف صاف بات کر لی۔

اس نے ناکہ خان کی بات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

”دیکھیے آغا صاحب! اگر آپ اس نظریے سے نجد سے ملتے ہیں تو آج کے بعد زحمت نہ کیجئے گا اور اگر غرض یونیورسٹی کے ایک سامعہ کی حیثیت ملتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

آغا شجاعت کے لئے یہ وار بالکل اچانک تھا۔ اسے کب توقع بھی کہ وہ اس قدر نازک ترین معاملے پر اتنی صاف گوئی سے اس سے بات کرے گی، پہلے تو وہ حیران ہی رہ گیا اور جب ذرا سنبھلا تو اس نے عفت کو تانا کر کہنے کی کوشش کی۔

عفت نے بڑی متانت سے کہا۔

”یہ بات بھی آپ پر واضح کر دوں کہ اس موضوع پر بحث کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔“

اور پھر — عفت کا رویہ آغا شجاعت کے سامنے اس قدر سرد ہو گیا کہ آہستہ آہستہ آغا شجاعت خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔

سیشن ختم ہونے میں یوں بھی زیادہ عرصہ باقی نہیں رہا تھا۔ باقی سارا وقت سکون سے گزر گیا۔ امتحان قریب آئے تو وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر کتابوں کی دنیا میں گم ہو گئی جس روز آخری پرچہ دے کر وہ ہال سے باہر آئی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دل و دماغ پر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ اڈیٹوریم کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے دیشیان نظر آیا وہ چونک گئی۔
کچھ عرصے بعد آیا تھا وہ؟

اس میں ذرا بھی تو تبدیلی نہیں آئی تھی۔

وہ بالکل ویسا ہی تھا۔

کچھ سوگوار اور بچھا بچھا سا۔

عفت ٹھہر گئی۔ دیشیان ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھیرے قریب آگیا۔

”ہیلو عفت! کیسی ہیں آپ؟“

”آپ کیسے ہیں؟“ عفت بھی مسکرائی۔

”آپ کے سامنے کھڑا ہوں، اندازہ لگالیجئے۔“

”ہاں! کچھ ٹھیک نظر نہیں آتے، چہرہ بچھا بچھا سا ہے، آنکھوں میں

سوگوار کی سی کیفیت ہے۔“ عفت نے بڑی سنجیدگی اور صاف گوئی سے کہا۔

فزیشان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
عفت نے کہا۔

”گلتا ہے آپ کو اس یونیورسٹی کو خیر باد کہنا دلاس نہیں آیا۔“
فزیشان بیٹنے پر دونوں ہاتھ باندھے چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”یہاں کیسے آئے آج۔“

”مجھے معلوم ہوا تھا آج آپ کا آخری پرچہ ہے۔“

”جی ہاں، بہت باخبر رہتے ہیں میرے بارے میں“
جی! تو میں نے سوچا کہ

”اچھا! پھر؟“

”بس! یہی سوچ کر آپ سے ملنے چلا آیا“
”آپ کی صاف گوئی مجھے پسند آتی۔“

فزیشان نے پوچھا۔

”کیا میں نے یہاں اگر غلطی کی ہے؟“

”نہیں، ایک ساٹھ پڑھنے والوں کا آپس میں کچھ نہ کچھ تعلق تو ہوتا

ہے۔“

”گویا آپ نے برا نہیں مانا“

”نہیں! اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟“
فزیشان کی آنکھیں گہری سوچوں میں ڈوب گئیں۔

عفت نے زیر لب مسکرا کر دیکھا اور بولی۔

”خیریت؟ آپ کہاں کھو گئے؟“

”ہوں“ فزیشان چونک گیا۔

”کیا سوچ رہے تھے آپ؟“

”میں سوچ رہا تھا کہ.....“

”جی! کیا سوچ رہے تھے؟“

”یہی سوچ رہا تھا کہ یوں کتنی مہربان ہیں لیکن جب زندگی کے سفر میں ساٹھ

ساٹھ چلنے کی بات آتی ہے تو آپ کس قدر نامہربان بن جاتی ہیں“

”کیا خبر؟ میری یہ اس وقت کی نامہربانی آئندہ زندگی میں آپ کے لئے

لکھی سوومند ثابت ہو۔“

”یہ تو آپ سوچتی ہیں نا!“

”اور آپ کیا سوچتے ہیں؟“

”میرے دل سے ایسی کوئی آواز نہیں آتی۔“

”پھر؟ آپ کے دل سے کیا آواز آتی ہے۔“

”میرا دل کہتا ہے کہ میں ساری زندگی ایسا ہی رہوں گا۔“

”کیسے رہیں گے؟“

”جیسا آپ اس وقت دیکھ رہی ہیں۔“

”یعنی یونہی سمجھنے سمجھنے سے، افسردہ اور سوگوار سے“
 ذیشان خاموش رہا۔

عفت نے ناصحانہ انداز سے کہا۔

”دل میں مایوس خیالوں کو جگہ نہیں دیا کرتے ذیشان“

ذیشان نے بڑی بے چینی سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”اچھی باتیں سوچا کیجئے۔“

”آپ کی نصیحتوں پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“

دو، ایک منٹ تک دونوں خاموش کھڑے رہے۔

یوں — جیسے سوچ رہے ہوں کہ اب کیا بات کریں۔

پھر ذیشان نے پوچھا۔

”پرچے کیسے ہوتے آپ کے؟“

”ویسے تو اچھے ہی ہوتے ہیں لیکن دعاؤں کی ضرورت تو بہر حال ہے“

”ٹاپ کر رہی ہیں اس سال؟“

”آپ دعا کیجئے۔“

”میں نے تو اپنی دعاؤں کے بے اثر ہونے کے بعد اب یہ کام بالکل“

چھوڑ دیا ہے۔“

عفت ہنس پڑی۔

”چھیٹوں میں کیا کہیں گی؟“

”کتنا ہیں بڑھوں گی، افسانے لکھوں گی اور اپنے عزیزوں رشتہ“

سے ملنے ملنے کے لئے جایا کروں گی“

”ابن تو آپ کا واسے وار (VIVA) بھی باقی ہوگا۔“

”ہاں انگریز اس کے لئے اتنی زیادہ فکر مند نہیں ہوں۔“

”وہ تو ظاہر ہے، آپ جیسی خود اعتماد لڑکی کو فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے“

عفت مسکرا دی۔

”واسے وار (VIVA) کس تاریخ کو ہے؟“

”کیوں؟ کیا اس دن بھی آنے کا ارادہ ہے؟“

ذیشان بے ساختہ مسکرا دیا۔

”اول گایا نہیں، یہ تو آپ اسی دن دیکھ لیجئے گا۔“

”ویسے بتا دینے میں کیا حرج ہے؟“

”آپ پچھلے تاریخ تو بتاتیں۔“

”میرے نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”کیوں؟“

”میں نہیں بتاؤں گی تو آپ کسی اور سے پوچھ لیں گے۔“

ذیشان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”آپ تو بہت باخبر رہتے ہیں میرے بارے میں“

ذیشان خاموش کھڑا رہا۔

عفت نے کہا۔

”اچھا جناب! اب اجازت؟“

”آپ جانا ہی چاہتی ہیں تو میں کیسے روک سکتا ہوں؟“
 ”پھر خدا حافظ تو کیجئے“

”خدا حافظ“

”خدا حافظ“

دونوں اپنے اپنے راستوں کی طرف مڑ گئے۔

عفت آخری پرچہ دے کر گھر آئی تو سب سے پہلے بھائی میاں سے ہی اس
 کا سامنا ہوا۔ بھائی میاں اس روز آفس نہیں گئے تھے۔ انہیں کافی تیز بخمار تھا۔

بھائی میاں نے پوچھا۔
 ”کیسا پرچہ ہوا عفت؟“

”پرچہ تو بہت اچھا ہوا ہے بھائی میاں! بس آپ لوگوں کی دعاؤں کی ضرورت
 ہے۔“

”ہمارے دل سے تو ہر دم تم لوگوں کے لئے دعا ہی نکلتی ہے بیٹی۔“
 ”ہمیں بھی اس بات کا احساس ہے بھائی میاں! کہ ہم لوگ آج جو کچھ بھی
 ہیں، آپ لوگوں کی دعاؤں کے طفیل ہی ہیں۔“

”نہیں بھئی! تم لوگوں کی اپنی غنت بھی تو شامل ہے۔“
 عفت سر جھکا تے فائل کے سروں پر انگلی پھیرتی رہی۔ اتنے میں آباں

بھی تھی۔ عزیزوں، رشتہ داروں سے ان لوگوں کا ملنا بہت کم ہوتا تھا۔ عموماً تقریبات کے موقع پر ہی آمننا سامنا ہوتا تھا۔ جب ان لوگوں کے مالی حالات اچھے نہیں تھے تو عزیز، رشتہ دار انہیں خفیہ سمجھ کر بلانا اور بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور جب مالی حالات اچھے ہوتے، سب کسی نہ کسی قابل ہوئے تو لوگوں نے انہیں مغرور سمجھ کر ان سے کترانا شروع کر دیا پھر عزیزوں کی بے جا انعام تراشیوں نے اس خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا۔ کون سا عیب ایسا تھا جو شجاع احمد صاحب کی اولادوں سے ملسوب نہیں کیا جاتا تھا۔ باقی سب کی اولادیں نیک پارسا، شرافت اور سادگی کا مرقع تھیں۔ حالانکہ جاننے والے اچھی طرح جانتے تھے کہ تصویر کا صحیح اور شیراز کون سا ہے۔

جن چند لوگوں کے دلوں میں عدوت وغیرہ کے لئے محبت اور خلوص موجود تھا انہیں روز و شب کی مصروفیتوں نے ان لوگوں سے دور کر رکھا تھا۔ پڑھنے پڑھانے اور گھر کے کام کا ج کے بعد اتنا وقت ہی کہاں بچتا تھا کہ تیرے میرے گھر جانے کا موقع مل سکے۔

بڑے ماموں جاباں بشد تھے کہ عفت اسی وقت ان کے ساتھ چلے اور ایک دو ہفتے بعد واپس آجائے۔ کسی کے گھر ایک، دو ہفتے رہنا کیسی انہونی سی بات تھی۔

عفت نے اپنی جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

”میں کسی دن صبح سے رات تک کے لئے آپ کے گھر آؤں گی“

ماموں جان ناراض ہو گئے۔

ادھر آنکلیں، ان کی آنکھیں پیاز کاٹنے کی دج سے سرخ ہو رہی تھیں۔ پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے چپک رہے تھے۔ اپنی ملکچی ساڑھی کا پلو سیٹھتے ہوئے اماں نے بھی پوچھا۔

”پرچہ کیسا ہوا عفتو؟“

”آپ نے میرے لئے اتنی دعائیں مانگی تھیں اماں! پھر پرچہ اچھا کیے“

”ہوتا؟“

”شکر ہے خدا کا۔“

”آج شام کو بڑی آپا یا سعدیہ باجی کے گھر چلیں گے“

”ہاں! تم نے تو بہت دنوں سے جھانکا بھی نہیں ان کے یہاں“

”اب تو فرصت ہی فرصت ہے۔“

”منہ ہاتھ دھو کر آؤ کھانا تیار ہے۔“

”ابھی کسی نے نہیں کھایا؟“

”نہیں، آج کچھ دیر ہو گئی، ابھی تو سلا دینا کے نکلی ہوں“

عفت اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

شام کو وہ سوکر اٹھی تو حرم اور فوزی کے ساتھ بڑی آپا کے گھر چلی گئی وہاں سے واپس آتے ہوئے ان لوگوں کو رات ہو گئی۔ ٹیکسی ہے اتکر اندرائی تو بڑے ماموں جان سے ٹبھیڑ ہو گئی۔ وہ گھر جانے کے ارادے سے اٹھنے عفت اور فوزی نے اصرار کر کے انہیں پھر روک لیا۔ وہ گلہ کرنے لگے کہ بہت عفت اور فوزی نے اصرار کر کے انہیں پھر روک لیا۔ وہ گلہ کرنے لگے کہ بہت گزر جاتے ہیں تم لوگ عزیز ماموں کے گھر آکر بھانکتے بھی نہیں۔ اور یہ بات

بورہا تھا۔

عفت کو ان کا دل توڑنا اچھا نہیں لگا۔

اس نے کہا۔

”اچھا! میں اس وقت آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی، بہت تھکی ہوئی ہوں پھر کسی دن پروگرام بناؤں گی“

ماموں جان اس بات پر تو آمادہ ہو گئے لیکن رہنے والی منظر سے دستبردار ہونے پر رضامند نہیں ہوئے۔

عفت نے سوچا۔

”چلو! اخیر دیکھا جائے گا۔“

ماموں جان مطمئن ہو کر چلے گئے۔

ایک روز عفت اچانک ان کے گھر پہنچ گئی۔ ماموں جان کا گھر ایک پس ماندہ سے علاقے میں تھا۔ بہت چھوٹا سا، دو منزلہ گھر تھا۔ جس میں ان کے بیوی کے میکے والے بھی کرائے پر رہتے تھے۔ ماہ و سال کا ایک قافلہ تھا جو گزر گیا تھا لیکن عفت نے ان کے گھر کے ماں حالات کبھی بھی اچھے نہیں دیکھے تھے۔ وہ جب بھی ان لوگوں کے بارے میں سوچتی اسے بے حد دکھ ہوتا تھا۔

عفت جب بڑے ماموں جان کے گھر پہنچی تو صبح کے دس بجے تھے۔ گھر کے مرد اپنے اپنے کام پہ جا چکے تھے۔ اس نے رکشہ سے اتر کر کنڈی کلنگا تو کسی بچے نے آکر دروازہ کھولا۔ وہ ننگے پاؤں ہی جھاگا چلا آیا تھا۔ اس کی دماغ قمیض خاصی میلی ہو رہی تھی، کت کتے ہوئے تھے، گمربان میں پورے ٹپن نہیں تھے، نیکہ اپنے سے بڑے سائز کا پن رکھا تھا جو دھل دھل کر رنگ سے بے رنگ

عفت کو اس نے سر سے پاؤں تک دیکھا اور اس سے کچھ کہے بغیر تیر کی طرح بھاگا جھاگا اندر چلا گیا اور جانے کس گوشے میں جا کر چھپ گیا۔ عفت اپنا بھاری سا بیگ ہاتھ میں سنبھالے اندر داخل ہو گئی۔ کمرے میں اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ اپنی اٹیچی ہاتھ میں تھامے اور آگے بڑھ گئی۔ آئین میں کھینے والے دروازے تک وہ پہنچی ہی تھی کہ وہی بچہ پھر دوڑتا جھاگتا آیا اور عفت سے ٹکرا گیا۔ اگر عفت ایک ہاتھ سے اسے سنبھالتی تو وہ چاروں شانے چیت گرا ہوتا۔

عفت نے پوچھا۔

”اے بھوٹ تو نہیں لگی؟“

وہ کھسیانا ہو کر بولا۔

”نہیں۔“

عفت کی نگاہ صحن کے اس پار اٹھ گئی۔ باورچی خانے کی دھیزلہ ممانی بیٹی دال صاف کر رہی تھیں۔ پاس ہی ایلوینیم کی دوسری سینی میں چاول رکھے تھے۔ عفت نے اپنا اٹیچی کیس دروازے کے پاس ہی رکھ دیا اور ممانی کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر حیرت زدہ سی رہ گئیں۔ وہ بچہ عفت کو پہچانتا نہیں تھا، عفت نے بھی اسے پہلی بار ہی ممانی کے گھر دیکھا تھا۔ اس نے معلوم نہیں ممانی سے کیا کہا تھا۔ ممانی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹین کی بد رنگ سی رٹے فرش پر رکھ دی اور اٹھ کر اس کے قریب آ گئیں۔

عفت نے کہا۔

داری مدقے ہوتے ہیں۔“

عفت نے کہا۔

”اصل میں بات یہ ہے ممانی جان! کہ ہماری کوثر آپا ہیں بھی بہت خوش مزاج اور سلیقہ شعار“

”سسرال میں یہی عادتیں کام آتی ہیں بیٹی“

”ہاں! مگر کوثر آپا خوش شکل بھی بہت ہیں۔“

”بس لڑکیوں کا نصیب اچھا ہونا چاہیے۔“

عت خاموش رہی۔

”ابھی پچھلے دنوں کوثر کے میاں کی ترقی بھی ہوئی ہے“

عت خوش ہو کر بولی۔

”یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔“

ممانی نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”ارشدمیاں (کوثر کے میاں) جہاں کام کرتے ہیں وہاں آئندہ بھی ترقی

کے بہت امکانات ہیں۔“

عت نے کہا۔

”چلے، کوثر آپا کی طرف سے تو آپ کو اطمینان ہے۔“

”ہاں۔ بیٹی! ہم بوڑھے ماں باپ تو ایسے دعا ہی کرتے رہتے ہیں کہ اللہ ہمیشہ

ہماری اولاد کو سکھی رکھے،“

پھر ممانی ایک دم چونک کر بولیں۔

”آداب ممانی جان۔“

ممانی نے اسے دعا میں دیتے ہوئے گلے سے لگا لیا۔ ان کے کپڑے میلے اور ملگجے تھے، کپڑوں میں پیاز، لہسن اور پیسنے کی ہلکی سی بو بسی ہوئی تھی۔ مگر ان کے خلوص اور محبت کی مہک اس بو پر حاوی ہو گئی۔

ممانی نے کہا۔

”کیسی ہو عفت؟ اب کے تو کئی مہینوں بعد شکل دکھائی۔“

عت اپنی پڑھائی کی مصروفیت کا رونا رونے بیٹھ گئی۔ ممانی باقی سب گھر والوں کی خیریت پوچھنے لگیں عفت نے فردا فردا سب کی مصروفیات ممانی کے گوش گزار کر دیں۔

ممانی نے دوسری بیڑھی اس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

”کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔“

عت بیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

ممانی نے پوچھا۔

”شانتہ اور سعیدہ تو اپنی سسرال میں خوش ہیں نا؟“

”ہاں ممانی جان! اللہ کا شکر ہے۔“

پھر عفت ممانی کی بڑی بیٹی کوثر کو پوچھنے لگی۔ اس کی شادی ڈیڑھ ما

قبل ہی ہوئی تھی۔

ممانی بڑی سرور سی ہو کر بولیں۔

”ہاں! وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے، شوہر، ساس، نندیں سب

” ارے کوثر کے یہاں پچھلے دنوں بیٹیا بھی تو بوا ہے، تمہیں نہیں خبر؟“

” جی بتایا تھا ماموں جان نے“

” ماشاء اللہ بڑا خوبصورت بچہ ہے“

” ماں باپ دونوں ہی اچھے ہیں منافی جان! پھر بچہ کیوں نہ اچھا ہوتا؟“

منافی مسکراتے لگیں۔

عفت نے اپنے ارد گرد نظر میں دوڑاتے ہوئے کہا۔

” گھر میں بڑی خاموشی ہے، کوئی نظر بھی نہیں آ رہا،“

” مرد تو اس وقت ہوتے ہی نہیں ہیں، بچے کچھ اسکول گئے ہیں کچھ باہر کھیل کود رہے ہوں گے۔“

” اور ہماری بھابھی جان کہاں ہیں؟ وہ بھی نظر نہیں آ رہی ہیں؟“

” دلہن کا پاؤں بھاری ہے، اس کی طبیعت بھی آج کل یونہی سی رہتی ہے“

اندرا کرے میں ہوگی۔“

” در بچہ کون تھا منافی جان؟“

” ارے وہ! اجو کو کہہ رہی ہو تم؟“

” وہی جو دروازہ کھولنے آیا تھا۔“

” ہاں! وہ میری بھابھی کا بھانجا ہے، دو تین روز سے آیا ہوا ہے“

عفت نے چاول کی سینی اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

” لائیے! چاول میں مین دول۔“

” ارے نہیں، تم اندرا کرے چل کر بیٹھو۔“

” میں کوئی مہمان بن کر تھوڑی آئی ہوں۔“

” مہمان نہ سہی، مگر کچھ دیر تو آرام کرو، ابھی تو آئی ہو۔“

اس نے بہت اصرار کیا مگر منافی نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔

” تم اندر چل کر بیٹھو، یہاں گھر می بہت ہے۔“

” آج کل تو موسم خوشگوار ہے، گھر می کہاں ہے؟“

” دھوپ تیز ہے، کافی پینش ہو رہی ہے۔“

منافی اسے ساتھ لے کر اپنی بھوکے کمرے میں آ گئیں۔ وہ بستر پر لیٹی رسالہ

پڑھ رہی تھیں۔ ان دونوں کو کمرے میں آتے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئیں، اور

اپنے دوپٹے کو گھسیٹ کر پیٹ تک پھیلایا پھر کنگھیوں سے اپنے پیٹ

کا بازو بھی لے لیا کہ کہیں کسی طرف سے بہت زیادہ نمایاں تو نہیں۔

عفت نے انہیں سلام کیا تو عین اسی لمحے انہوں نے بھی سلام جھاڑ دیا۔

منافی نے کہا۔

” کیوں صبح؟ اس کو پہچانا؟“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

منافی یہ کہہ کر رے سے باہر چلی گئیں۔

” تم دونوں بات چیت کرو۔ میں ذرا باورچی خانے کی خبر لے لوں۔“

مگر دونوں ہی ایک دوسرے سے بے تکلف نہیں تھیں۔ عفت سوچ رہی

تھی کہ آخر ان سے کیا بات کروں؟ اور شاید وہ بھی یہی سوچ رہی تھیں۔ دونوں

نے بہت سوچ سوچ کر کچھ رسمی سی باتیں کیں۔ اس کے بعد پھر وہی خاموشی چھا

گئی۔ عفت نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہ کمرہ اس کمرے کی نسبت کافی صاف ستھرا اور اچھا تھا۔ جس سے گزر کر عفت آئی تھی۔ اس کی وجہ وہ فرنیچر تھا جو ممانی کی ہوا اپنے جہیز میں لائی تھیں۔ ایک نسبتاً کم چوڑا ڈبل بیڈ تھا۔ جس پر شاید بہو بیگم کے ہاتھ کا ہی کڑھا ہوا بیڈ گور تھا۔ کمرے نیلے رنگ کے یونہی پر زرد و اسبک کا کام کیا ہوا تھا، بیڈ کے داہنی طرف میز پر اسی طرح کا بیڈ پڑا ہوا تھا۔ میز پر چند دوسری چیزوں کے علاوہ درمیان میں پتیل کا ایک بدقلعی گلدان بھی سجا ہوا تھا، جس میں کاغذ کے رنگ برنگے پھول بڑے اتار سے سجے ہوئے تھے، ان پھولوں کا اصل رنگ و روپ تو جانے کیا ہوگا یا گزرتے ہوئے وقت کی اثراتی دھول نے ان رنگوں کو دھندلا کر رکھ دیا تھا۔ مختصر سے کمرے میں ایک بے حدستے قسم کا چھوٹا سا صوفہ سیٹ بھی تھا۔ بٹائس کر کر دیا گیا تھا۔ سنسٹریبل پر چینی کی ایک ایش ٹرے رکھی تھی جس پر سکریٹ کی رکھ کے بجائے کیو یا مالٹے کے بیج پڑے تھے۔ بیڈ کے نیچے رکھے ہوئے صندوق بھی جھانک جھانک کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ دیوار میں بنی ہوئی پختہ المار سی میں پٹ نہیں تھے۔ المار سی کے سب سے اوپر والے خانے میں سیدے ہاتھ کی طرف ریشمی کپڑے کے پر میں لپٹا ہوا قرآن مجید رکھا ہوا تھا وہ بھی یقیناً بہو بیگم کے جہیز کا معلوم تھا۔ سجاوٹ کی چند ایک چیزیں، چینی کا ایک ٹی سیٹ، ایک نئی مٹی صندوقی، ستے قسم کا میک اپ کبس۔ سبھی چیزیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ ہم بہو بیگم کی ملکیت ہیں۔ المار سی کے سب سے پہلے خانے میں

الغناؤں سینڈل، ہجوتوں اور چپلوں کے چند جوڑے رکھے تھے۔ دیوار میں ایک طرف گول سا مینڈر ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک پھوٹے سے بریکٹ پر شیو کا سامان دوآلوں کی چند چھوٹی موٹی شیشیاں اور ڈبے سجے ہوئے تھے۔ تیل چنبیلی قسم اول اور تیل دھوتی قسم اول کی شیشیاں بھی اسی بریکٹ پر بسی تھیں، بریکٹ پر ایک مفید رنگ کا کپڑا بچھا تھا جس کے کناروں پر کروشید سے بنی ہوئی گونے ڈیزائن کی میل لگی ہوئی تھی۔ اوپر بنے ہوئے چنان پر کپڑوں میں لپٹے ہوئے جانے کیسے بڑے بڑے بندل اور گھڑیاں رکھی تھیں، کمرے کی کھڑکیاں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں، کھڑکیوں اور دروازوں پر پڑے ہوئے معمولی سوتی۔ پردوں کے رنگ، دیواروں کے رنگ سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے تھے۔

عفت نے کمرے کا جائزہ لے کر بہو بیگم کی طرف دیکھا تو انہیں اپنی ہی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ وہ نہ جانے کب سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ شاید اس کے پرے کا جائزہ لے کر وہ کمرے کی سجاوٹ کے بارے میں اس کے تاثرات کا اندازہ کرنا چاہتی تھیں۔ عفت کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو اس نے ان کے شلوار سوٹ کے پرنٹ کی ہی تعریف کر دی، دوپٹے کے کناروں پر لگی ہوئی گور کناری کی تعریف کر دی اور کانوں میں پہنے ہوئے بندوں کے ڈیزائن سے ہی دلچسپی کا اظہار کر دیا۔

پھر وہ سوچنے لگی کہ اب ان سے اور کیا بات کروں۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو آرام کرنے کا مشورہ دے کر کمرے سے باہر آگئی۔ ممانی باورچی خانے میں بیٹھ رہی تھیں۔ مٹی کے تیل کے چولہوں میں سے ایک پر دال چڑھی ہوئی تھی۔

اور دوسرے پر تیلی چڑھا کے پیاز بھون رہی تھیں۔ قریب ہی پلاٹک کے ایک کٹورے میں گوشت دھلا ہوا رکھا تھا، دوسرے کٹورے میں آلو اور مرچ بھیکے ہوئے تھے۔ دوپہر کے کھانے میں گوشت کا اہتمام ممانی نے یقیناً اسی کی وجہ سے کیا تھا۔ ہو بیگم کے کمرے میں بیٹھے ہوئے اس نے دیکھا تھا کہ اجو میاں ایک بد رنگ تھیلے میں کوئی چیز چھپاتے باورچی خانے کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے پہلے ہی سے گوشت پکنے کا پروگرام ہوتا تو صبح ہی گوشت آگیا ہوتا۔ ایک بچے تک ممانی کا سب سے چھوٹا لڑکا ستار اور اس سے بڑی بہن

نثریا بھی آگئی۔ ستار دسویں جماعت میں تھا اور نثریا فرسٹ ایئر میں۔ ان دونوں بڑی بہن زرینہ بی ایڈ کر رہی تھیں۔ نثریا کا سفید یونیفارم گھر میں مسلسل دھل رہا کہ کچھ پیلا سا ہو چکا تھا، ستار کے کینوس کے سفید جوتوں کی ایٹریاں گھسی ہوئی تھیں۔ ستار نے جو تے تار کر جو چلیں پنیں وہ بھی کس مہر سی کی داستان ستار بہن اسفنج کی گھسی ہوئی چلیں تھیں۔ جن میں دو مختلف رنگوں کے پٹے تھے، چارہ اٹنگ سا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے منکے میں سے نکال کر پہنا گیا ہو۔ نسبت نثریا کے کپڑے بہت بہتر تھے اس نے لینن کے اوورے پر سٹار پر زرد دوپٹہ اوڑھا تھا۔ چلیں اس کی بھی اسفنج کی تھیں۔ مگر کافی صاف ستھری تھیں۔

نذرینہ بھی واپس آگئی تو ممانی نے نثریا سے دسترخوان بچھوایا اور ستار کو ہر کوہلانے کے لئے بھیج دیا۔ ہو بیگم کے آنے تک کھانا دسترخوان پر چنا جا جا کھانا رکھتے وقت عفت نے اپنی خدمات پیش کرنے کی بہت کوشش

گراس کی کوشش بالکل بے سود ثابت ہوئی۔ دسترخوان پر کئی چیزیں تھیں ادھر کی دال میں ممانی نے اصلی گھی کا ترہا لگایا تھا۔ گوشت میں آلو مرچ کے ساتھ مٹاڑ اور سویا بیج بھی ڈالا تھا ادھر کی دال اور چاول کے ساتھ مینو کا اچار اور آم کی میٹھی چٹنی بہت مزہ دے رہی تھی۔ گوشت اگرچہ کھائے کا تھا لیکن آلو مرچ کے ساتھ سویا بیج ڈالنے سے بہت ذائقہ دار ہو گیا تھا۔ ممانی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں میں ویسے بھی بڑی لذت ہوتی تھی۔ ممانی نے لگے ہاتھوں سوچی کا تھوڑا سا ملوہ بھی بنالیا تھا۔ عفت حالانکہ بہت بے تکلف ہو کر کھانا کھا رہی تھی مگر پھر بھی سب اس سے بار بار اصرار کر رہے تھے اور عفت سوچ رہی تھی۔

”معلوم نہیں یہ لوگ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہیں؟ کیا ہوا جو میں یہاں کبھی کبھار آتی ہوں۔ میں تو اپنے آپ کو بالکل بھی اجنبی نہیں محسوس کر رہی ہوں۔“

ہو بیگم کا جی کہہ کر ماندہ تھا اس لئے انہوں نے حلوے اور گوشت کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ہاں! اچار اور چاول بڑی رغبت سے کھا رہی تھیں۔ عفت کو یاد آیا کہ بڑی آپا کے یہاں جب بیٹا پیدا ہونے والا تھا تو وہ بھی گوشت کو دیکھ کر بہت منہ بناتی تھیں۔

کھانا کھانے کے بعد جب برتن سمیٹ لئے گئے تو ممانی نے اپنے ہاتھ سے پان باکر عفت کو دیا۔ عفت پان بالکل نہیں کھاتی تھی اور چھالیہ کا بھی اسے کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ لیکن ممانی نے اتنی محبت سے پان دیا تھا۔ وہ کیسے انکار کر دیتی۔ اس نے پان لے کر مہنہ میں رکھ لیا۔ مگر ذرا ہی دیر میں اسے چکڑ سا آگیا اور

غفار بھائی کچھ ناراض ہو کر بولے۔

”واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

ماموں جان نے بھی کہا۔

”یہ دودن رہنے والی بات بالکل غلط ہے بیٹی!“

ممائی جان نے مسکرا کر کہا۔

”آئی اپنی مرضی سے ہو لیکن جاتے وقت ہماری مرضی کا خیال رکھنا پڑے گا۔“

زرینہ اور شریانے بھی اپنے اپنے دل کی بات کہی تو عفت کچھ بول ہی نہ سکی۔

ماموں جان نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

”بس! اب اس ذکر کو ختم کر، عفت مجھ سے پوچھے بغیر نہیں جائے گی۔“

غفار بھائی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے، ماموں جان بھی اپنے

کپڑے کھونٹی پر سے اتار کر غسل خانے میں چلے گئے۔ نذریا باورچی خانے میں

شام کی چلتے بناتے چلی گئی۔ ممائی اور زرینہ گھر کے تیسرے کمرے کے دروازے

کے پاس کھڑی جانے کون سا الجھا ہوا مسئلہ سلجھا رہی تھیں۔

شام کی چائے کے ساتھ مٹکے کی ہی کسی دوکان سے لاتے گئے تیل میں

تیلے ہوئے باسی نمک پارے اور تازہ سمو سے بھی تھے۔ دوپہر کا بچا ہوا سوچی

لا علوہ بھی ممائی نے ایک طشتری میں سجا دیا تھا۔ چائے اور اس کے لوازمات

ہو بیگم کے کمرے میں سنڈ میبل پر سجائے گئے کچھ لوگوں نے صوفہ سیٹ پر بیٹھ

کر اور کچھ نے بیڈ کے کناروں پر ٹک کر چائے پی۔

مغرب کے وقت ممائی کے بھائی بھی اپنے کام پر سنے واپس آ گئے۔ شریا

کینٹیوں میں سے آگ سی نکلنے لگی۔ وہ بہت ضبط کئے ہوئے چار پائی پر بیٹھی زریزہ

اور شریا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ ستار، زرینہ اور شریا سے دیکھ کر بہت

مسرور تھے اور بار بار اس بات پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ وہ ان کے یہاں

کے لئے آئی ہے۔ عفت کو اچھی طرح یاد تھا کہ بچپن میں وہ، بڑی آپا اور سعید

باجی کبھی کبھار ممائی کے یہاں رہنے کے لئے آجاتی تھیں۔ لیکن اس بات کو اب

برسوں گزر چکے تھے، ان برسوں میں اتنی تبدیلیاں آئی تھیں اور زندگی اتنی مٹ

ہو گئی تھی کہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ہمینوں گزر جاتے تھے۔

عفت نے دیکھا۔ اس کا اٹیچی کیس دروازے کے پاس سے اٹھا

کسی نے کمرے کے ایک کونے میں اوپر تلے رکھے ہوئے صندوق پر رکھ دیا

شام کو غفار بھائی اور ماموں جان گھر واپس آئے تو وہ بھی عفت کو دیکھ

کر اس طرح کھل اٹھے۔ جیسے ان کے گھر میں عفت نہیں بہا آئی ہو۔ ماموں جان

نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بھائی میاں کی خیریت پوچھی اور غفار بھائی مرد

اور کپڑے بدلے بغیر اس سے باتیں کرنے بیٹھ گئے، انہوں نے گھر کے ایک ایک

کا نام لے کر سبھی کو پوچھ ڈالا۔ اس کے اٹیچی کیس پر ان کی نظر پڑی تو بولے۔

”ارے! اتنا چھوٹا سا اٹیچی کیس لے کر آئی ہو!“

عفت نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”بھئی! کم سے کم اتنا بڑا صندوق تو لاتیں کہ تین چار ہفتوں کے کپڑے“

میں آجاتے۔“

”میں تو صرف دودن کے لئے آئی ہوں۔“

بارہ تھے۔ پل کے دوسری طرف نشیب میں بنے ہوئے مکانات تاریکی کی لگی سی
چاند اور مے۔ آسمان کی طرف سر اٹھاتے کھڑے تھے شاید اپنی کس مپرسی پر شکوہ کماں
تھے۔ نشیب میں کھڑا ہوا پانی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا۔
جللاتی ہوتی آدھم روشنیوں کا عکس پانی میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

وہ ارد گرد کے منظر کو نگاہوں میں سمیٹتے ہوئے زلینہ اور ثریا سے دھیرے دھیرے
باتیں کر رہی تھی۔ آگن سے ستارے نے ثریا کو آواز دی تو وہ تینوں نیچے اترا آئیں۔

رات کو کھانے میں سوائے سوچی کے حلوائے کے باقی ساری چیزیں موجود تھیں
چاول البتہ تازہ پکائے گئے تھے جن میں سے گرم گرم خوشبودار بھاپ نکل نکلی کہ
بوک میں اور بھی اضافہ کر رہی تھی۔

عفت کے لئے سونے کا انتظام اسی کمرے میں کیا گیا جس میں صندوق وغیرہ
رکھے تھے۔ ثریا اور زلینہ بھی اسے کمرے میں سوتیں۔ ثریا تو جلدی ہی سو گئی، زلینہ
کافی دیر تک پڑھتی رہی۔ پھر اسے بھی جمائیاں آنے لگیں تو اس نے بستر پر
بیٹھے ہی بیٹھے کتا میں سمیٹ کر قریب رکھے ہوئے ایک اسٹول پر ڈھیر کر دیں اور
مزید دوپٹے ڈال کر سو گئی۔ عفت کو البتہ دیر میں نیند آئی۔ اس کی ایک
وجہ تو شاید جگہ کا نیا پن تھا۔ لیکن اصل وجہ بالباری کے ہوٹل میں پوری آواز سے
بچنے والا ریڈیو تھا جو کانوں کے پردے پھاڑے ڈال رہا تھا۔

عفت تین روز بعد ہی واپس جانے کے لئے بصد ہو گئی لیکن سب اس
ہی طرح اس کے پیچھے پڑے کہ عبوراً اسے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ مزید تین
روز ہنسنے کے بعد وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے واپس چلی آئی۔

اول زلینہ عفت کو لے کر دوسری منزل پر آگئیں۔ عفت نے ان کے ماموں اور ماماں
کو سلام کیا اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر اس مختصر سی بالکونی میں آکر کھڑی ہو گئی۔
ان کے بیڈروم کے سامنے تھی۔ وہ بالکونی کے جنگلے پہ دونوں کہنیاں ٹیک کر
کھڑی ہو گئی اور جھک کر نیچے گلی میں دیکھنے لگی۔ نیم تاریک گلی میں محلے کے پتے اب
بھی اپنے اپنے پسندیدہ کھیلوں میں مشغول تھے۔ ایک طرف گلی ڈنڈا اور دوسرے
طرف پتھر پڑے زور و شور سے کھیل رہا تھا تیسرے جگہ کھٹ کو دیکھ کر خیال آیا
کہ شاید یہ لوگ بھی اپنے کسی پسندیدہ کھیل میں مشغول ہیں۔ مگر فوراً ہی اسے احساس
ہوا کہ یہ تو پھلے بازوں کا کوئی کمرہ ہے۔ بات چیت کرتے کرتے ایک دنگا
کا لم گلوچ اور مل تھا پانی کی نوبت آگئی۔

گلی کے نکر پر کسی مالباری کا ہوٹل تھا۔ جہاں سے برتنوں اور کوئلہ ڈر نکس کی
بوتلوں کے ٹکڑے کی آوازیں کے ساتھ ساتھ فلمی گانوں کی مسلسل جھج پکار بھی
سنائی دے رہی تھی۔ ماموں جان کے گھر کے سامنے والے گھر میں ایک دوکان
بھی کھلی ہوتی تھی۔ جہاں نون تیل وغیرہ خریدنے والوں کا تانا و قضا وقفے سے
سارا دن بندھا رہتا تھا۔ کچھ ڈاڑھی والے، ادھیڑ عمر کے ایک شخص کو بچے
پڑے، مرد، عورتیں سب بھامیاں (بھائی میاں) کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔
چھوٹے چھوٹے، مکمل نامکمل اور سچتر نیم سچتر مکانات سے جھٹ کر وہ

شاہراہ تھی۔ جس پر گاڑیاں، بسیں، ٹریک، سکوٹر، موٹر سائیکلیں اور منی بسیں ایک
دوسرے کے پیچھے بھاگی چلی جا رہی تھیں۔ ان کی زد و سرخ بتیوں کے بنتے ہوئے
وائے سے سڑک کے دونوں جانب جلتے ہوئے ملبوں کی تیز روشنی میں گم ہوئے

پھر۔۔۔ بہت سارے دن بیکاری میں گزر گئے۔ بعض دفعہ نہ کچھ کئے
دل چاہتا تھا نہ پڑھنے کو، گانے سننے کی وہ بہت شوقین تھی۔ لیکن کبھی کبھی گانے
سننے کا بھی موڈ نہیں ہوتا تھا۔ گھر کی جھاڑ پونچھ کے علاوہ کھانا پکانے کی ذمہ داری
بھی اس نے اپنے سر لے لی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اماں کی شاگردی میں اس
بھی مزے دار کھانے پکانے سیکھ لئے۔ گھر کے لوگ اس کے پکائے ہوئے کھانوں
کی تعریفیں کرتے تو وہ خوشی سے نہال ہو جاتی۔ بڑی آپا کے بیٹے کے لئے وہ
نئے ڈیزائن کے کپڑے سی کر دیتی تو بڑی آپا سے زیادہ ان کی سانس نہ لیا
سیلنڈر شکاری کو سراہتیں۔ کھانا پکاتے ہوئے اور گھر کے دوسرے کام کرنا
ہوئے کبھی کبھی اسے ذیشان کا خیال آ جاتا اور وہ سوچتی۔۔۔ معلوم نہیں
کے دل سے میرا خیال نکلا یا نہیں۔ اس نے کسی دفعہ اپنے آپ کو ٹوٹے
کوشش کی۔

”مجھے ذیشان سے محبت ہے؟“

لیکن جواب میں سوائے سنسناتی ہوئی خموشی اور جامد سناٹے کے اور کچھ

نہ ہوتا۔

اس روز بھی وہ رات گئے تک ایک ناول پڑھتی رہی۔ لیکن فائدہ
پھر بھی کسی طرح آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کتاب میز پر
دبی اور بیٹی بجا کر دریچے کے قریب چلی آئی۔ دریچے کے پیٹے سے
رنگتے وہ بڑی بے ربط سی باتیں سوچتی رہی۔ کبھی اس کا دھیان اپنے
کی طرف چلا جاتا، کبھی سرحدیہ باجی اور بڑی آپا کی طرف اور کبھی رشتہ

سعدیہ باجی نے بغیر کوئی ”گل کھلائے“ اپنی فیلم ختم کر لی۔ ان کی شادی کے
بعد لوگوں کی تمام تر توجہ میری طرف تھی۔ انہیں یقین تھا کہ بڑی نے نہ سہی لیکن
جو بی حرور خاندان کا نام ”روشن“ کرے گی، ان کے یقین کو کتنا زبردست دھچک
ہینے لگا۔

اسے ذیشان کا خیال آیا تو دل کے جلنے کس گوشے سے آواز آئی۔
کہ اگر اس نے اپنے آپ کو اس قدر پابند نہ کیا ہوتا تو شاید ذیشان کے لئے
اس کی سوچوں کا انداز بدل گیا ہوتا لیکن وہ مطمئن تھی کہ جو کچھ بھی ہوا ہے بالکل
یہاں ہے۔ ورنہ لوگوں کی زبانیں جو باتیں بنائیں ان کو برداشت کرنے کے
لئے ہیں پتھر کا جگر کہاں سے لاتی۔

ہوا کی لہروں پر ڈولتی ہوئی جانے کس سمت سے رخشدہ کی آواز آئی۔

”میں نہیں چاہتی کہ تم ذیشان کو ٹھکرا کر زندگی بھر بچھتا رہو۔“

پھر ٹھلا اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”ذیشان کو کھو کر کہیں نہیں بچھتا نہ پڑے۔“

پھر یوسف اپنی تمام تر متانت کے ساتھ آکھڑا ہوا۔

”میں یہ نہیں کہتا کہ زندگی میں آپ کو اچھے لوگ نہیں ملیں گے، لیکن

ذیشان جیسا آپ کو کبھی کوئی نہیں ملے گا۔“

وہ ذیشان کے متعلق سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر ادھر چند دنوں سے وہ غموں

کر رہی تھی کہ اس کا خیال ایک سائے کی طرح ہر لمحے اس کے ساتھ رہتا تھا۔

”یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟“

وہ پریشان ہو کر سوچتی۔

”میں اپنے نام کے ساتھ کسی کے نام کا بچپنہ نہیں لگانا چاہتی۔“

وہ اپنے آپ سے کہتی۔

مگر کبھی کبھی خیالوں اور سوچوں پر انسان کا ذرا بھی تویس نہیں ملتا۔

اسے ذیشان کے جملوں کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔

”اس قدر ظالمانہ فیصلہ کرتے ہوئے آپ کو ذرا بھی دکھ نہیں ہوا؟“

”کیا میں اتنا برا ہوں کہ آپ میرے بارے میں اس انداز سے سوچاں؟“

نہیں کرتیں؟“

”اگر آپ نے کوئی قسم کھا ہی لی ہے تو اسے توڑ دیجئے۔“

”ساری زندگی میں بس دو ہی دعائیں مانگی تھیں، وہ بھی قبول نہیں ہوئی۔“

اس کا سوگوار چہرہ، بھٹی بھٹی سی لگا ہیں۔

کچھ کہتی ہوتی۔

کچھ فریاد کرتی ہوتی۔

پھیک بے جان مسکراہٹیں۔

عفت کی لگا ہوں کے سامنے تصویر کے نقش بن بن کے بگڑنے لگے۔

اس نے دل ہی دل میں کہا۔

”بغیر سوچے سمجھے تم اس قدر آگے کیوں بڑھ آئے تھے ذیشان؟“

”اگر انجانے میں تمہارے قدم اس منزل تک آہی گئے ہیں تو لوٹ جانے کی کوشش کرو ذیشان!“

”تمہیں کچھ بھی تو حاصل نہ ہوگا۔“

”اپنی ہی آگ میں جل بجھنے سے کیا فائدہ؟“

تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے۔

تمہارے لئے اور۔

تمہارے گھر والوں کے لئے بھی

اپنی ایک ناقص آرزو کے پیچھے اسے یوں دیران نہ کرو۔

تمہارے سامنے زندگی کی راہیں بہت وسیع ہیں۔

کئی موڑ آئیں گے۔

کئی منزلیں آئیں گی۔

کہیں نہ کہیں تمہیں ضرور احساس ہوگا کہ

تم جسے اپنی متاع حیات سمجھ بیٹھے تھے۔

وہ تو بالکل ہی ایک عام سی لڑکی تھی۔

کیا تھا اس میں؟

کچھ بھی تو نہیں!

پھر یقیناً تمہارا انداز فکر بدل جائے گا۔

اور ایسا ہونا بھی چاہیئے ذیشان!

جب کبھی۔۔۔۔۔۔ پچھلے سانچوں میں سے کوئی سانچہ اچانک

بچھے گا اور بنائے گا کر۔

تم بہت خوش ہو۔

بہت کامیاب زندگی گزار رہے ہو

تمہارے چھوٹے سے گھر میں بڑا سکون ہے۔

اور تمہیں اپنی بیوی سے بے حد پیار ہے۔

تو۔۔۔

یقین کر کر۔۔۔

میرے دل کو بہت اطمینان ہوگا۔

اور بہت سکون۔

ہوا کا ایک جھونکا دیے پاؤں کمرے میں گھس آیا۔ میز پر رکھا ہوا صبح کا

اخبار ایک ہلکی سی پٹ پٹ پٹا ہٹ کے ساتھ پیچھے فرش پر گر پڑا۔

دروازوں اور کھڑکیوں میں پڑے ہوئے پردے کا پینے لگے چنبیلی کی بنا

کا سایہ دیوار پر لرزنے لگا۔

دور۔۔۔ سڑک پر گزرنے والی کسی گاڑی کے ہارن نے آؤگھتی ہوئی را

کے سناٹے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

اس نے چونک کر در تپکے سے باہر دیکھا۔

چاندنی کا وہ پہلا غبار فرش پر بکھرا ہوا تھا۔

اور رات بنا آہٹ کے چپ چاپ آگے بڑھ رہی تھی۔

وہ دن بچہ بندہ کے اپنے بستر پر آگئی اور آنکھیں بند کر کے سونے کی ناکام کوشش

لگی۔

طویل انتظار کے بعد اس کا زلٹ آیا۔ اس کی توقع کے بالکل برعکس اس کی

پوزیشن آئی۔ اصل میں وہ اندازہ ہی نہ کر سکی تھی کہ دوسرے لوگوں نے کتنی

ت اسٹڈی کی تھی، مآں تو اسی پر خوش تھیں لیکن اس کا دل بچہ کر گیا

اپا، سعدیہ باجی، توصیف بھائی، اشفاق بھائی، ان کے سب گروالے، ماموں، مان

بان اور غفار بھائی سبھی تو اسے مبارکباد دینے آئے مگر اسے ذرا بھی خوشی

ہوئی۔ وہ پھینکی، بے جان سن مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرے ان سب کی مبارکباد

لے رہی۔ وہ اپنے آپ کو بہت شرمندہ اور جھینپا ہوا سا محسوس کر رہی

اپنا یہ زلٹ دیکھ کر اسے بڑا دھچکہ سال کا متعارف زلٹ والے روز وہ یونیورسٹی

میں گئی۔ یونیورسٹی سے واپسی پر رخصتہ اس کے گھر آئی۔ اس کے ساتھ مشلا

تھی۔ دونوں اس کے یونیورسٹی نہ آنے پر سخت ناراض تھیں۔ اس کا اُترا

برہ دیکھ کر انہیں اور بھی غصہ آیا۔ اُسے ناشکر می اور نہ جانے کیا کہتی رہیں۔

مشلا نے کہا

آج یوسف اور دلشان آئے تھے۔

اس نے بے دلی سے کہا۔

اچھا۔

تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں؟

نہیں۔

مشلا بھاٹ کھانے والے انداز میں بولی۔

”کیوں؟“

”ظاہر ہے کہ یوسف تمہاری وجہ سے آیا ہوگا۔“

”اور ذیشان؟“

”وہ یوسف کی تنہائی کے خیال سے آیا ہوگا۔“

”زیادہ بننے کی ضرورت نہیں ہے“

”اس میں بننے کی کیا بات ہے؟“

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ذیشان تمہاری خاطر آیا تھا۔“

”وہ میری خاطر کیوں آیا تھا؟ اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔“

رخشندہ — جواب تک نہ بنائے خاموش بیٹھی تھی۔ ایک دم دروازہ

بولی۔

”ہونا تو بہت کچھ نہیں چاہیے لیکن پھر بھی ہو جاتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہونا تو یہ بھی نہیں چاہیے تھا کہ تم ذیشان کو اس طرح متاثر

جواب دے دو۔“

شہلانے کہا۔

”وہ بے چارہ ہے کہ اب تک اس لگاؤ سے بٹھا ہے اور تم ہو کہ اپنے لپٹ

میں تکی بھر دو بدل کرنے کے لئے تیار نہیں ہو۔“

عفت خاموش رہی۔

رخشندہ نے جن کر کہا۔

”بلالوہ اپنے اوپر خول چڑھا رکھا ہے“

شہلانے ابرو چڑھا کر کہا۔

”یہ کوئی عقل مند نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کی پابندیوں میں اپنے آپ کو جکڑ کر

میرے کی زندگی بھی برباد کر دو۔“

عفت کو بھی ایک دم غصہ آگیا، چوڑ کر بولی۔

”میں نے کسی کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ اپنی زندگی برباد کرنا پھرے۔“

شہلانے کہا۔

”تم نے مشورہ نہیں دیا لیکن تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی تو دوسرے شخص

پر راہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔“

”یہ سراسر الزام تراشی ہے۔“

رخشندہ نے مشورہ دینے ہوئے کہا

”اب بھی وقت ہے تم اپنی سوچوں کا انداز بدلو۔“

”میری سوچوں کا انداز بالکل درست ہے“

شہلانے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

”اچھا ایک بات بتاؤ گی؟“

”پوچھو۔“

”اس بات کو مانتی ہو کہ محبت نام کا بھی کوئی جذبہ اس دنیا میں ہے؟“

”ہاں! کیوں نہیں مانتی؟“

”چلو! اس کے ہے، ورنہ میں تو سمجھتی تھی کہ تم اس جذبے سے ہی منکھ ہو گی۔“

دل یا نہ کروں؟“

رخشندہ کچھ چھینپ گئی۔

”جس سے ہونی ہوگی، خود بخود ہو جائے گی۔“ عفت نے کہا۔

شملہ نے کہا۔

”بھئی میرا تو یہ خیال ہے کہ تم نے اپنے اوپر یہ پابندی لگا کر کر یونیورسٹی کے

ی لڑکے سے شادی نہیں کرنی، ذیشان کے بارے میں سوچنے سے گریز کیا ہے؟

رخشندہ نے کہا۔

”ہاں اور اس کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذیشان جیسے لڑکے سے کسی کو

نت نہ ہو۔“

عفت بیزار ہو کر نہ لولی۔

”اچھا! اب ختم کرو اس ذکر کو۔“

”ہاں! جب تمہارے اوپر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تو کچھ کہنا سیکار ہے“

رخشندہ نے پوچھا۔

”کل تو یونیورسٹی جاتے کا ارادہ ہے یا نہیں؟“

”دیکھا جائے گا، ہو سکتا ہے چلی جاؤں“

”ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔“

”کیوں؟“

”اگر تمہارا پروگرام ہو تو میں بھی چلی جاؤں گی“

”ویسے کوئی ضرورت تو نہیں ہے جانے کی۔“

رخشندہ نے کہا۔

”جب تمہیں اس جذبے کی حقیقت کا اعتراف ہے تو پھر مجھے حیرت ہے

کہ ذیشان کے لئے تمہارے دل میں یہ جذبہ کیوں نہیں بیدار ہوا؟“

”اس میں میرا کیا قصور؟“

”تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے اسے چاہنے کی کوشش ہی نہیں کی“

”کیا حماقت کی باتیں کر رہی ہو؟ کسی کو چاہنے کے لئے کوشش کی کیا ضرورت

ہے؟ یہ تو ایک غیر اختیاری جذبہ ہے“

”میرا مطلب ہے کہ کسی کی اس قدر محبت کو دیکھ کر دل کو کچھ نہ کچھ تحریک

تو ملتی ہے۔“

شملہ نے کہا۔

”یہی تو مجھے حیرت ہے کہ ذیشان کے اتنے شدید و امانہ پن کے جواب میں

یہاں سوائے بے حسی کے اور کچھ نہیں“

رخشندہ نے کہا۔

”اچھا! کیا تمہارا کوئی آئیڈیل ہے؟ اور ذیشان اس معیار پر پورا نہیں اُترتا؟“

عفت نے بڑے سکون سے کہا۔

”میرا کوئی آئیڈیل نہیں“

رخشندہ نے کہا۔

”کبھی نہ کبھی تو تم کسی سے محبت کر دو گی بی“

”پھر وہی بیکار بات، بھئی! پہلے سے یہ تھوڑی سی سوچ لگی کہ اس سے محبت

” سب پر وفیسر پوچھ رہے تھے، جہاں تو چاہیے۔“
” چھوڑو، خواجہ سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔“

” شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے؟“
” ان سب کو تو پکا یقین تھا کہ میری ہی پہلی پوزیشن آئے گی،“

” ہاں بکلاس میں بھی بیشتر لوگوں کا یہی خیال تھا۔“
” اصل میں مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ دوسرے لوگ کتنی زبردست تیاری

کر رہے ہیں۔“

” پتہ نہیں تم نے کون سے پیپر میں گڑ بڑ کر دی“
” شملانے کہا۔“

” اب جلنے بھی دو جو ہوا سو ہوا۔“

” ہاں! میں بھی یہی کہتی ہوں کہ میسر ی پوزیشن پہ ہی خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔“
” مگر یہ تو ہمیشہ کی ناشکری ہے۔“
” فوزی نے آکر کھانا کھانے کے لئے کہا تو ان تینوں کی گفتگو کا سلسلہ بڑا

گیا۔

دوسرے روز عفت یونیورسٹی گئی تو شملہ اور رخشدہ کے علاوہ کلاس

اور بھی بہت سے لڑکے لڑکیاں آئے ہوئے تھے۔ عفت تقریباً بارہ بجے پہنچے۔

مفتی۔ اور لوگ جاتے کب سے آئے ہوئے تھے۔ اپنے پر وفیسروں اور کلاس

لڑکوں لڑکیوں سے ملنے ملانے کے بعد وہ کافی دین تک کینٹین میں بیٹھی رہی۔
” شملہ اور رخشدہ نے فرمائش کر کے بہت سی چیزیں منگوا لی تھیں۔ دوپٹا

ہاں! راخدی سے کھانے پینے کی چیزوں پر ہاتھ صاف کر رہی تھیں اور اسے
بھی پٹ بھر کر کھانے کی تلقین کر رہی تھیں۔ جب وہ گھر جانے کے لئے بس
اٹا، اس کی طرف جا رہی تھی۔ تو اس نے ذیشان کو موٹر سائیکل پر آتے دیکھا
ذیشان اس کے قریب آکر رک گیا۔ شملہ اور رخشدہ بھی اس کے ساتھ تھیں۔
انہوں نے خاصی اونچی آواز میں ”ہیلو، کہا۔ عفت کی آواز حسب معمول دھیمی
نئی ذیشان کو موٹر سائیکل پر سے اتر گیا اور اپنے گاگلز اتارتے ہوئے بولا
” آپ لوگ گھر جا رہے ہیں؟“

” جی ہاں! وقت بھی تو دیکھئے۔“ شملانے کہا۔

ذیشان نے اپنی رسٹ واپچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

” ہاں دو بج گئے۔“

” بڑی دیر میں آئے آپ،“ رخشدہ نے کہا۔

” ہاں! کچھ زیادہ ہی کام تھا، کسی طرح اٹھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔“
” شملانے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

” چھا! ایسا ہے ذیشان! کہ میں اور رخشی جتنا زیم کا ایک چکرت لگا کر آتے

ہاں غالباً ٹیبل ٹینس کی پریکٹس ہو رہی ہے، آپ لوگ جب تک

رہیں۔“

” عفت نے اس سے بھی زیادہ صاف گوئی سے کہا۔

” مجھے ذیشان سے ایسی کوئی بات نہیں کرنی ہے جس کے لئے تنہائی

” رات ہو۔“

۲۲۲
شہلا کچھ شہ مندہ ہو کر بولی۔

”ارے بھی ایہ بات نہیں ہے“

”پھر کیا بات ہے؟“

”میری اور رشتی کی ان سے کل ملاقات ہو چکی ہے“

”اچھا! پھر؟“

”تم کیونکہ کل نہیں آتی تھیں اس لئے آج مبارکباد وصول کر لو۔“

”مبارکباد تم لوگوں کی موجودگی میں بھی وصول کی جاسکتی ہے۔“

ذیشان جواب تک خاموش کھڑا ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا

سے مخاطب ہو کر بولا۔

”ویسے آپ لوگوں کے جانے کی ضرورت واقعی نہیں ہے۔“

شہلا مسکرا دی۔

رخشندہ نے پوچھا۔

”کیوں؟“

”اب نہ مجھے ان سے کچھ کہنا ہے، نہ انہیں سنتا ہے۔“

”کیا واقعی؟“

”جی! اس باب کو یہ کافی عرصے پہلے ختم کر چکی ہیں۔ اس پر اب“

کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

”اور آپ نے ان کی یہ بات مان لی؟“

”مجبوری ہے، ان کو ناراض کرنا بھی تو گوارا نہیں مجھے۔“

”گویا آپ نے ہار مان لی۔“

”اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔“

شہلا نے کہا۔

”نہیں، آپ اتنی جلدی پیچھے مت ہٹیے“

ذیشان ایک مجروح مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”نہیں شہلا! میں تو آج بھی اُسی مقام پر کھڑا ہوں اور شاید ہمیشہ کھڑا رہوں گا۔“

ایک لمحے کے لئے اس نے عفت کی طرف دیکھا اور بولا۔

”تو تم تو ان کے آگے بڑھ رہے ہیں، دور یہ خود جا رہی ہیں۔“

عفت کی پیشانی پر سلولیں بڑھ گئیں۔ رخسندہ نے کہا۔

”آپ انہیں اپنے سے دور جانے ہی کیوں دے رہے ہیں، ذیشان نے

جنگل سے کہا۔

”یہ زبردستی کا سودا نہیں ہے، میں تو ان کی خوشی میں خوش ہوں۔“

چند سیکنڈ تک چاروں اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے کھڑے رہے۔ پھر

ننان اپنے خیالوں سے چونک کر بولا۔

”اچھا! خیر! پھوٹے ان باتوں کو۔“

اس نے عفت کو اس کی تھرڈ پوزیشن پر مبارکباد دی تو وہ سر جھکائے

دش کھڑی رہی۔

”ذیشان نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔“

”آپ اپنی کامیابی پر ذرا بھی خوش نہیں ہیں؟“

”ایسا تو کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا میں نے“
”کیسا کارنامہ؟“

”جس پر بے پناہ خوشی کا اظہار کروں“
”لیکن آپ تو ذرا سی بھی خوش نظر نہیں آتیں۔“
رخشندہ نے کہا۔

”انہیں افسوس ہے کہ پہلی پوزیشن کیوں نہیں آتی؟“
”افسوس کی کیا بات ہے؟ پوزیشن تو بہر حال ہے“ فزیشنان نے کہا۔
”ایسی پوزیشن کا کیا فائدہ؟“
شہلانے مسکرا کر کہا۔

”کوئی نقصان بھی تو نہیں۔“
فزیشنان نے پوچھا۔

”اب کیا کہنے کا ارادہ ہے؟“
”کہیں سروس مل گئی تو کہ لوں گی ورنہ گھر میں بیٹھی رہوں گی۔“
”ریسرچ کیوں نہیں شروع کر دیتیں؟“
”ریسرچ میرے بس کی بات نہیں۔“
”کیوں نہیں؟“

”میرے رزلٹ سے ہی آپ کو اندازہ ہونا چاہیے کہ میں ریسرچ کر سکتی۔“

”آپ کے رزلٹ کا ریسرچ سے کیا واسطہ؟“

اپنے رزلٹ کو دیکھ کر میں بہت مایوس ہوئی ہوں۔“
اپنی ماکس ٹیٹ تو آجانے دیجئے کیا خبر؟ صرف آٹھ، دس نمبروں کے
نزد سے ہی آپ کی فرسٹ پوزیشن رہ گئی ہے۔“

فرق بہر حال فرق ہے چاہے وہ دو ہی نمبروں کا ہو۔“
اچھا تو پھر ڈبل ایم۔ اے کر لیجئے۔“

اب موڈ نہیں رہا بیڑھنے کا۔“

تو گویا بیڑھانے کا موڈ ہے۔“

موڈ تو اصل میں صحافت میں جانے کا ہے۔“

اچھا! تو ایڈیٹری کا شوق ہے۔“

فی الحال ایڈیٹر بننے کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔“

پھر؟“

کسی اخبار یا رسالے میں کوئی چھوٹا نمونہ کام ہی مل جائے تو بڑی بات

۔۔۔

”صحافت میں کچھ نہیں، آپ نامحق یہ لائن اختیار کرنا چاہتی ہیں۔“

”میں تو اپنا شوق پورا کرنا چاہتی ہوں۔“

”شوق کا معاملہ ہے تو بات دوسری ہے“

فزیشنان یہ کہہ کر جانے کس سوچ میں ڈوب گیا، عفت نے کھد

”کافی دیر ہو گئی ہے، اب ہم لوگوں کو اجازت دیجئے۔“

فزیشنان نے سر جھکا کر کہا۔

”آپ جانا ہی چاہتی ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”اچھا تو پھر خدا حافظ!“

”خدا حافظ“ دیشان نے کہا۔

رخشنده اور شملہ بھی بادل خواستہ اٹھ گئیں۔ دروازہ کی خواہش تو یہ تھی
عنت کچھ دیر اور دیشان سے باتیں کرے۔ جب کہ عفت کے نزدیک یہ بالکل غیر
سی بات تھی جس شخص سے مستقبل میں کوئی واسطہ ہی نہیں رکھنا تھا اس کے ساتھ
طویل ملاقاتوں سے کیا حاصل تھا۔

اسی روز — لمحہ لمحہ اترتی ہوئی شام کے گرم سم سے لمحات میں —

جب گھر میں سوائے اس کے اور کوئی نہیں تھا۔

تنہائی کی ان دیکھی — سخت دکھ دہریا نہیں اسے تھا۔ ہوتے گھر
درو دیوار پر اپنا سایہ ڈال رہی تھیں۔

آنکھ میں بھیجی کھروری چارپائی پر بیٹھی وہ بلا مقصد ٹانگیں ملاتے جا رہی تھی
چھوٹی آپا بھڑکی دیہ پیلے ہی ہاسپٹل گئی تھیں۔ ان دنوں وہ جناح ہاسپٹل پر
کام کر رہی تھیں۔ فرخ بھائی بھی انجینئر بن چکے تھے۔ حرم میڈیکل اسٹوڈنٹ تھا
وہ وہیں بے شک تھا۔ لیکن عنت بہت کم کرتا تھا۔ چھوٹی آپا کو اندیشہ تھا کہ
وہ عنت سے اسی طرح جان چراتارہا تو اس کا ڈاکٹر بننا مشکل ہے۔ ایک تو گمراہ
اس کے دوستوں کی تعداد سے عنت پریشان تھے۔ معلوم نہیں اسے بے حساب
دوست بنانے کا کیا ضبط تھا۔ آئے دن ایک نئے نام کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ الگ
بات تھی کہ پرانے دوستوں کی وہ چھانسی بڑھی کتا جاتا تھا۔

ات آنے والے شیب دروز کا خیال کر کے اُلجھی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں
نہیں تھا کہ ان بیکار دنوں اور بیکار راتوں کا کیا مصروف ہو گا۔ ملازمتیں سربراہ
تھیں تو بیٹھی ہوئی نہیں ہوتیں کہ جو چاہے چلتے چلتے انہیں اٹھائے۔ فی الحال
درو ملازمت ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ٹاپنگ وہ پہلے ہی سیکھ چکی
تھی کہ اس اور سیونگ کا کورس بھی کر چکی تھی۔ اسے دیشان کے مشورے کا خیال

و اب دیر پر شروع کر دیجئے۔“

”بل ایف۔ اے کر لیجئے۔“

چین بات یہ تھی کہ اب یونیورسٹی جانے کو عفت کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا
ن کیوں؟ اس کا دل ایک دم ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔
انے اپنے آپ سے سوال کیا۔

یہ راہ فرار تو نہیں؟

سیا فرار؟

ن مجھے یہ اندیشہ تو نہیں کہ یونیورسٹی میں رہ کر دیشان سے ملاقاتوں کا

؟

ب تک ہم نہیں ملتے رہے؟

ب کہیں مجھے اپنے قدم ڈمگ جانے کا خوف تو نہیں؟

رے قدم اتنی آسانی سے نہیں ڈمگا سکتے۔

ہی خود اعتمادی لوٹ آئی۔

اس نے ذیشان اور اس کی باتوں سے اپنے ذہن کو آزاد کرنا چاہا۔

مگر اس وقت یہ کام کس قدر دشوار نظر آرہا تھا۔

ایک آواز مٹی جو بار بار اس کے ذہن کے پردوں سے ٹکراتی تھی۔

ذیشان کی محنت سے اپنا دامن بچا کر میں نے ٹھیک کیا ہے؟

جواب اثبات میں ہوتا لیکن پھر بھی دل بے چینی اور بے گلی کی دھجکی

آپٹ میں سلگتا رہتا۔

جانے کس طرف سے آواز آتی۔

تم نے ذیشان کو چاہا ہے نا؟

دل کی مدھم سی صدا سننے سے پہلے دماغ کی نہیں نہیں کی تکرار

کے پردے چھاڑ ڈالتی۔

اس نے اپنا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تو یہی بات اس کی سمجھ

سکی۔

دنیا اور دنیا والوں کے خوف سے مجبور ہو کر اس نے اپنے قدم

کی طرف بڑھنے نہیں دیئے۔

اسے یہ ڈر تھا کہ ذیشان کا ہو کر اسے لوگوں کا یہ طعنہ نہ سہنا پڑے۔

ہم تو پہلے ہی کہتے تھے، کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلے گا۔ اسے یقین تھا کہ

بھائی میاں کے خیالات اتنے وقیفانوسی نہیں تھے کہ اس کی پسند کی بات

رکاوٹ بنتے لیکن طنز اور تشبیہ کے وہ نشتر جو اس کی

آٹاں اور بھائی میاں کو سننے پڑتے۔

یہ بات اس کے لئے قطعی ناقابل برداشت تھی۔

شام کی ہواؤں کے دوش پر اڑتے ہوئے بادلوں پر نگاہیں جاتے ہوئے
نے سوچا۔

طے تو یہ ہوا عفت شہباز اکہ۔

اپنے ہی ہاتھوں بناتے ہوئے خول میں تم نے اپنے آپ کو چھپا لیا۔

اپنے ہی ہاتھوں کھڑکی کی ہوئی دیواروں میں تم نے اپنے آپ کو چن دیا۔

ہم روکیاں بھی خدا کی بنائی ہوئی عجیب مخلوق ہیں۔

کبھی کبھی اپنی تمناؤں کے سراٹھانے سے پہلے ہی انہیں کچل دینے پر

در ہو جاتے ہیں۔

کبھی کبھی۔ اپنی خفتہ آرزوؤں کے بیدار ہونے سے پہلے ہی انہیں

ہلک تھپک کر گری بنیںد سلا دیتے ہیں۔

اس ڈر سے اپنے آپ کو بے حس بنا لیا کہ کہیں اس کی چاہ سچ بچے ہی اس

کے حق میں فیصلہ کرنے پر مجبور نہ کر دے۔

اس اندیشے سے اپنا دل پتھر کہ لیا کہ کہیں اس کا جذبہ دل سچ بچے ہی اثر نہ

جاتے۔

کہیں پتھر موم نہ ہو جائے۔

کہیں اس کی بجھی بجھی سنی لگا ہوں کا دھواں شعلہ بن کر نہ بھڑک اٹھے۔

اور شعلہ جب بھڑک اٹھیں تو دامن بچا کر کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

لیکن۔۔۔ یہ جو کچھ بھی ہوا بالکل ٹھیک ہوا۔

اور رہ گئے تم! — ذیشان!

تو وقت بڑی عجیب چیز ہے۔

جو کچھ آج ہے وہ کل نہیں ہوگا۔

جو کل ہوگا آنے والے لمحوں میں اس کے نقش بھی مٹ جائیں گے۔

وقت کی اڑتی ہوئی دھول بے حد شفاف چیزوں کو بھی دھندلا کر

دیتا ہے۔

اس کے ان دیکھے مضبوط ہاتھ زمانے کو درسِ عبرت دیتے ہوئے گر جاتے

ہیں۔

میں — تم — تمہاری چاہ — تمہاری محبت — یہ سب تو ہند

کمزور کھلونے ہیں۔

بالکل ناپائیدار اور کچے۔

وقت کی گردش کے آگے ان سب کی کیا حیثیت ہے۔

وقت گزرے گا تو نہ تمہاری چاہ ہوگی۔

نہ تمہاری محبت

اور نہ تمہاری سوچوں کا یہ انداز ہوگا۔

آتے جاتے لمحوں کا ناہموار سلسلہ تمہارے دل و دماغ سے ہر خدو غل ملتا

دے گا۔

نا تمام آنندوں کے نقش بھی مٹ جایا کرتے ہیں ذیشان!

غم نہ کرو جو آج یہ لہمت تم پر بھاری ہیں۔

میری شبیہ بھی بڑی جلدی تمہاری نگاہوں کے سامنے دھندلا جائیگی۔

اور پھر — آہستہ آہستہ مٹ جائے گی۔

بالکل مٹ جائے گی۔

دروازے پر دستک ہوتی تو عفت اپنے خیالوں سے چونک پڑی۔

نے دروازہ کھولا تو بھائی میاں نظر آئے۔ بھائی میاں آنگن میں اس کے

ماہی پلے آئے۔ وہ برائے یس پڑی ہوئی کرسی اٹھا کر ان کے لئے لے آئی

یہ بڑی دیر تک آئندہ کے پروگرام کے بارے میں بحث کرتے رہے۔

یہاں کا مشورہ بھی یہی تھا کہ اسے ریسرچ کرنے کی چاہیے۔ مگر اس نے بھائی

یا کو اپنا قطعی فیصلہ سنا دیا کہ اب آگے پڑھنے کا اس کا بالکل موڑ نہیں ہے۔

و زمت کرنا چاہتی ہے۔

مار وہ بھی چھوٹی آپا کی طرح میڈیکل لائن جو اتن کر لیتی۔ پھر مزے سے وہ بھی پٹل جابا کرتی۔

یوں گھر کے کاموں کی کمی نہیں تھی۔ اماں کے ساتھ کھانا پکوانا، گھر کی صفائی، خزانہ، سجاوٹ، بناوٹ، کپڑوں کی سلائی۔ سبھی کام ہوتے تھے۔ لیکن ان کا دل مطمئن نہیں تھا۔ اسے ہر وقت یہی احساس ہوتا تھا کہ اس کی زندگی لکل بے مقصد گزر رہی ہے۔ یہی حال رخشندہ کا بھی تھا۔ وہ بھی ایم۔ اے کرنے کے بعد بالکل گھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ عفت والے مشاغل اس کے بھی تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اپنے جینز کی چیزیں بڑی محنت اور لگن سے بنا رہی تھی۔ اس کا منیگریٹر عنقریب ہی انگلینڈ سے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس آنے والا تھا۔ شہلا البتہ اپنے کام سے لگی ہوئی تھی۔ اپنے ریسرچ ورک کے سلسلے میں اسے روزانہ یونیورسٹی جانا پڑتا تھا۔ یوسف ایک بنک میں سروس کر رہا تھا۔ لیکن اپنی چھوٹی بہن کی شادی سے پہلے اس کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور شہلا کی خواہش بھی یہی تھی کہ شادی جتنی زیادہ التوا میں پڑ سکتی ہو پڑے۔ اسے اندیشہ تھا کہ شادی ہو جانے کی صورت میں اس کا ریسرچ کا کام ادھورا رہ جائے گا۔ ویسے یوسف اور شہلا کو یہ اطمینان تھا کہ ان کی راہ میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی کوئی چیز درمیان میں حائل نہیں ہے، عفت کبھی شہلا کے یہاں اور کبھی رخشندہ کے یہاں ملنے جلی جاتی تھی یا پھر وہ دونوں اس سے ملنے آجاتی تھیں تو عفت کا اچھا خاصا وقت گزر جاتا تھا۔ ماموں جان کے یہاں بھی وہ کبھی اماں کے ساتھ اور

لمحے چپ چاپ گزر رہے تھے۔ وقت پیچھے پلٹ کے دیکھ لیں گے۔
بڑھد ہا تھا۔ روز و شب کے ہنگامے اپنے معمول پر تھے۔ لیکن عفت کو اپنی زندگی بہت پھینکی اور بے رنگ نظر آتی تھی۔ مستقبل کے سارے منصوبے دھڑکے دھڑکے رہ گئے تھے۔ بڑی آپا، سعدیہ باجی اور چھوٹی آپا کے اوپر اسے رونا آتا تھا۔ بڑی آپا اور سعدیہ باجی کو کیا مزے سے سمجھ پٹ ملازمتیں مل گئی تھیں۔ ٹھاٹھ سے کالج اور یونیورسٹی جاتی تھیں۔ چھوٹی آپا کی مصروفیت کا تو کوئی ٹھاٹھ ہی نہیں تھا۔ کبھی صبح ہاسپٹل بھاگی جا رہی ہیں، کبھی رات کو ڈیوٹی لگ رہی ہیں اور ایک وہ تھی کہ اتنے مہینے گزر جانے کے بعد بھی اسے کہیں ملازمت نہیں ملتی۔ پڑھانے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن تھک مار کر اس نے سوچا کہ کسی کالج میں ہی ملازمت مل جائے، مگر اس معاملے میں اس کی قسمت جانے کیوں یا ورنہ نہیں کر رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ اس سے تو یہ

کبھی اکبلی ہی چلی جاتی تھی۔ ممانی کی بہو بھی اب اس سے کافی فری ہو گئی تھیں۔ ان کی گردیا سی بیٹی کے لئے وہ ڈھیروں ننھے مٹے کپڑے سی کہ لے گئی تو انہوں نے کئی بار کچھ اس انداز سے اس کا شکریہ ادا کیا کہ وہ بشر مندہ ہو کر رہ گئی۔ اس نے سوچا۔

لو جی! یہ کیا بات ہوئی؟ ان کی بیٹی رشتے میں اس کی بھی تو کچھ لگتی ہے۔ ماموں اور ممانی اس کے سنگھڑاپے کو سراہے جا رہے تھے۔ ممانی اور زریزہ کے ساتھ ایک روز وہ کوثر آپا کی سسرال بھی گئی۔ کوثر آپا نے اسے دیکھ کر بے اختیار گلے سے لگایا۔ عفت نے دیکھا۔

کوثر آپا کھڑکھڑاہٹ سے بھی زیادہ پیاری ہو گئی تھی۔ ان کی ساس نندیں بڑی ہنس مکھ اور محبت کرنے والی معلوم ہوتی تھیں۔ کوثر آپا کا چھوٹا سا، صاف ستھرا اور خوب صورت گھر دیکھ کر عفت کو بڑی خوشی ہوئی۔ ممانی بھی کوثر آپا کی خوش قسمتی اور سسرال میں ان کی قدر دیکھ کر بے حد مسرور تھیں اور اپنے خوب صورت تندرست فواسے کے ہمارے چوہنکلوں میں لگی ہوئی تھیں۔ عفت دوپہر کے وقت کوثر آپا کے گھر گئی تھی۔ ارادہ تو یہی تھا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے بیٹھ کر واپس آجائے گی لیکن خود کوثر آپا اور ان کی ساس نندوں نے شام سے پہلے آنے ہی نہیں دیا۔ شام کو ارشد بھائی سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ ساتھ لے سافرے پر کشش سے ارشد بھائی کی آنکھوں سے اپنی بیوی کے لئے بے پناہ محبت اور اپنے ننھے مٹے بیٹے کے لئے انتہائی شفقت جیسا کہ رہی تھی۔ ممانی جان

آگے بھی وہ بچھے جا رہے تھے۔ اپنی بہو کے میکے والوں کی خاطر مدارات کے لئے کوثر آپا کی ساس نے شام کی چائے کے لئے دو تین چیزیں اپنے ہاتھ سے تیار کر ڈالیں، یہ الگ بات تھی کہ کوثر آپا نے بھی ان کا ہاتھ بٹانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ایک ایک چیز بے حد اصرار کر کے ان لوگوں کو کھلاتی گئی۔ کم سے کم وقت کو تو یہی احساس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی کھا گئی ہے۔ چلتے وقت کوثر آپا، علاوہ ان کی ساس نندوں نے بھی اس سے پھر آنے کے لئے اصرار کیا اور وہ دماغ پر بڑے خوشگوار اثرات لئے پھر آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

کچھ وقت اور بڑی خاموشی سے گزر رہا۔ پھر اس کی توقع کے بالکل برعکس اسے ایک ہفتہ وار رسالے میں خواتین کے صفات کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس کے لئے پھر باتیں بتائی جانے لگیں۔ جو اڑتی اڑتی اس کے کانوں تک بھی پہنچیں۔

لو اور سو! اخبار کے دفتر میں کام کرے گی، وہ کوئی شریف لڑکیوں کے کرنے کی جگہ ہے، جانے کس کس قماش کے مرد وہاں ہوتے ہیں، جو گلے تک نہیں کھلا ہے وہ اب کھل جائے گا، خوب روشن ہو گا۔ خاندان کا نام عفت نے یہ سب کچھ ایک کان سے سنا اور دوسرے سے اڑا دیا۔ اب کچھ کچھ ان باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا۔

جب بھائی میاں اور اماں کو کوئی اعتراض نہیں تو دوسرے لوگ کیوں ہر لمحے میں دخل اندازی کرتے ہیں۔

شروع شروع میں وہ لوگوں کی باتیں سن کر بڑی گم سم سمی ہو گئی تھی۔ لیکن

مے قریب تر آتی گئی۔ عفت کو کافی دیر میں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ واقعی ایک دوسرے کی اچھی دوست ہیں۔

شہلا اور رحشندہ، عفت کی من پسند نوکری مل جانے پر کچھ کم مسرور تھیں۔ وہ دونوں کبھی کبھار اس کے آفس کا چیکٹر لگا لیتی تھیں۔ عفت اپنی پرسودوں کی فائل سامنے رکھے بڑے انہماک سے اپنا کام کرتی ہوتی ملتی۔ اسے کام سے سبھی بڑے متاثر تھے۔ سب کا خیال تھا کہ جب سے وہ خواتین صفات کی انچارج بنی ہے ان صفات کا حن نکھر آیا ہے، مہربان، شہلا اور شندہ کو بھی بہت پسند آتی تھی۔ آفس کے دوسرے لوگوں کے بارے میں ان دونوں نے عفت سے یہی کہا کہ —

”بظاہر تو سبھی شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں، اندر کا حال الٹا بہتر جانے، شہلا نے ایک دفعہ عفت سے پوچھا کہ اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو بان اس سے ملنے کے لئے آفس آجائے۔“

عفت کی پیشانی پر تسکینیں پڑ گئیں۔
اس نے کہا۔

”میرے نزدیک یہ بات سخت نامناسب ہے۔“

”اس میں کیا حرج ہے؟“

”میں یہاں کے لوگوں کو اپنے متعلق کسی قسم کی کوتاہی بات بنانے کا موقع

میں دینا چاہتی۔“

شہلا خاموش ہو گئی۔

اتار اور بھائی میاں نے اسے سمجھایا کہ —

”تمہیں لوگوں کے کہنے کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ تمہارا اپنا دل اور ضمیر صاف ہونا چاہیے۔ انسان چاہے تو اپنی خود اعتمادی اور گرفت کے سہارے بڑے ماحول میں بھی اپنا دامن مہر راتی سے بچا سکتا ہے، اچھے اور برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ مگر دار کی بلندی اور مضبوطی کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب برے لوگوں کے درمیان رہ کر بھی انسان کا دامن صاف رہے۔“

پھر عفت نے بڑے اعتماد کے ساتھ آفس جانا شروع کر دیا۔ اسٹاف میں جوان مردوں کے علاوہ ادھیڑ عمر کے مرد بھی تھے۔ خواتین میں ایک خاتون تو چالیس سال کی عمر کی تھیں۔ دوسری ان سے کچھ چھوٹی اور تیسری لڑکی مہربان کی ہم عمر معلوم ہوتی تھی۔ مہربان بے حد خوبصورت نقش و نگار کی لڑکی تھی۔ بات بات پر ہنسنی مسکراتی تھی۔ اسے ڈھیروں لطیفے یاد تھے، جنہیں موقع مل کر اعتبار سے سن کر دوسروں کو بھی ہنسنے مسکانے پر مجبور کر دیتی تھی، اسے لباس پہننے کا بے حد سلیقہ تھا، میک اپ بہت ملکا کرتی تھی اور بڑی ہمارت سے کم کرتی تھی۔ اس کی شخصیت ایسی تھی کہ پہلی ہی نظر میں اسے دیکھ کر متاثر ہو جانا لازمی تھا۔ مردوں کے علاوہ خواتین بھی اسے بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ عفت کو اس کی اور عادتوں سے قطع نظر یہ عادت پسند نہ آئی کہ اسے اپنے حن پر فدا سا بھی ناز نہیں تھا۔ عفت خود خاموش طبیعت رکھتی تھی۔ دوستی کرتے وقت اسے پہل کرنے کی بھی عادت نہیں تھی۔ اس کی ریزرور ہنسنے کی عادت کے باوجود مہربان غیر محسوس طریقے پر اس کا

عفت کو اس لمحے ذیشان سے چڑھی محسوس ہوتی۔

زور دے۔

اس نے سوچا۔

”جو دوسروں کی عزت کے محافظ ہونے کے دعویدار ہوتے ہیں۔ وہ اس

طرح کی گھٹیا باتیں نہ سوچتے ہیں نہ کہتے ہیں۔“

اس نے اپنے اس خیال کا اظہار شہلا پر بھی کر دیا۔

شہلا نے فوراً صغافی پیش کرتے ہوئے کہا۔

”تم ذیشان کی طرف سے بدگمان مت ہو، اس نے ایسی کوئی بات نہیں

نہیں کہی۔“

”پھر؟“

”یہ بات میں نے خود کہی ہے، بلکہ ذیشان کے سامنے اس بات کا ذکر ہوا

تو اس نے سختی سے مجھے منع کیا تھا کہ میں ایسی کوئی بات تم سے نہ کہوں“

”پھر تم نے اس قدر احمقانہ بات مجھ سے کیوں کہی؟“

”میری تو اب بھی یہی خواہش ہے عفت کہ تم دونوں ایک ہو جاؤ۔“

”اس بات کو اب بالکل بھول جاؤ۔“

”جو بات میں ایک دفعہ ختم کر چکی، اس کو دہرانایا بیکار ہے۔“

”تم اپنے فیصلے پر مطمئن ہو؟“

”ہاں بالکل۔“

”تمہیں ذیشان کا خیال نہیں آتا؟“

”یونہی بھولے ہوئے، بس! جیسے ایک سایہ سانگا ہوں کے سامنے“

شہلا نے مایوسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”بلکہ سچی بات تو یہ ہے شہلا کہ جب سے میں نے یہاں کام شروع کیا ہے

مجھے ابھی خیال نہیں آتا۔“

شہلا نے طنز سے کہا۔

”مجھے تم سے یہی امید تھی۔“

لیکن آج کیونکہ تم نے اس کا ذکر کیا ہے اس لئے یقیناً اس کا خیال آئے گا“

بڑی عنایت ہے تمہاری، شہلا نے کہا اور مہربن کے آجانے سے

ختم ہو گئی۔

پھر ایک روز عفت شہلا سے ملنے گئی تو شہلا نے اسے بتایا کہ ذیشان

کے سفر لوی بی۔ ایل کی پنڈی برانچ میں ہو گیا ہے۔ عنقریب ہی وہ چلا

جائے گا۔

”اچھا۔“

عفت نے روزمرہ کی عام خبروں کی طرح اس خبر کو بھی سنا۔ اسی دوران

مذہ کی شادی ہو گئی۔ اس کا منیجر انگریڈ سے واپس آ گیا تھا۔ رخصت شدہ

مادی میں عرفانہ اور پروین سے بھی ملاقات ہوئی۔ دونوں اب تک بیکار

ہیں ملازمت نہیں ملی تھی۔ پروین نے کالج کی ملازمت سے مایوس ہو

ی سال بی۔ ایڈ میں ایڈمیشن نے لیا تھا۔ عرفانہ بڑی سنجیدگی سے یہ سوچ

رہی تھی کہ بیکار بیٹھے رہنے کے بجائے پرائیویٹ طور پر دوسرا ایم۔ اے

اب کیا کروں عفت؟ یہ تو میان مکہ پہنچے۔
عفت اس کی گھبراہٹ سے غلط ہو کر بولی۔

”یہ تو بتاؤ تمہیں مکہ کیسے؟“

”دیکھو نا، خالی صورت شکل سے کیا ہوتا ہے، اصل چیز تو انسان کی شرافت
دتی ہے۔“

”شرافت کا اندازہ انہیں پرکھے بغیر تو نہیں ہو سکتا۔“

”مگر بعض اوقات شرافت کو پرکھے پرکھے ہی کافی نقصان ہو جاتا ہے۔“

”پھر؟ کیا ارادہ ہے؟“

”ویسے تو میں نے کافی سخت لہجے میں کہہ دیا ہے کہ آئندہ یہاں آنے کی
رحمت نہ کریں۔“

”لیکن؟“

”بس! آثار کچھ اچھے نظر نہیں آتے۔“

”اصل میں اس بے چارے کا اتنا قصور بھی نہیں ہے۔“

”پھر کیا میرا قصور ہے؟“

”تم ہو ہی ایسی چیز کہ تمہاری طرف متوجہ ہوتے بغیر رہا ہی نہیں جاتا۔“

”تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے، میری جان پر بنی ہوئی ہے۔“

”جان پر کیوں بنی ہوئی ہے؟ ذرا ہمت سے کام لو۔“

”یعنی کیا کروں؟“

”دو چار دفعہ اور جھڑک دیکھو، پھر بھی باز نہ آئیں تو پھر انہیں پرکھو اور

کر لے۔ شہلا کا بھی یہی خیال تھا کہ وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا
گزرتے ہوئے وقت کے ہر لمحے کی قیمت اسی طرح وصول کی جاسکتی تھی
کہ انسان کچھ نہ کچھ کہتا رہے پڑھنا لکھنا زندگی میں کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔
ایک طویل عرصے تک بیکار رہنے کے بعد عفت کو اپنی پسندیدہ ملازمت
ملی تھی۔ وہ اس کے لئے خدا کی تسکین گزار بھی تھی اور مطمئن بھی۔ آفس میں اس کا
بڑا اچھا وقت گزرتا تھا۔ وہ نئے نئے موضوعات کا انتخاب کر کے ان
سروے کرتی۔ خود نئے سے نیا آرٹیکل لکھنے کی کوشش کرتی۔ بہتر سے بہتر
افسانوں کا انتخاب کرتی اور بعض معمولی افسانوں میں قطع برید کر کے انہیں
قابل اشاعت بنا دیتی۔

ادارے میں شامل ہونے والوں کی تصاویر رسالے کے شروع ہونے
تھیں۔ مہربین کی خوبصورت سی تصویر دیکھ کر ایک رئیس زاوے اس پر بری نظر
عاشق ہو گئے۔ پہلے پہل ان کے ٹیلیفون آتے رہے۔ اگر کوئی دریافت طلب
بات ہوتی تو مہربین بڑی سنجیدگی سے ان کے سوالوں کے جواب دے دیتے
ورنہ ٹیلیفون نہ کہہ دیتی۔ پھر ایک روز وہ شرف ملاقات کے لئے خود
مہربین کے ہاتھ پر پھول گئے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو نواز
اور وہ جو بڑی زندہ دلی سے منہستی مسکراتی اور باتیں کرتی تھی
منینہ اور سنجیدہ بن کر بیٹھ گئی۔ عفت کو اس نے شروع ہی سے اپنا
بنار کھا تھا اور اس معاملے میں وقتاً فوقتاً اس سے مشورہ مانگتی رہتی
رئیس زاوے کے جانے کے بعد وہ گھبرا کر عفت سے بولی۔

کہ وہ تمہارے لئے کس قدر آگے بڑھ سکتے ہیں، انہیں سمجھانے کی کوشش کرو۔“

مہرین جو بڑی بیخودگی سے اس کی باتیں سن رہی تھی اس کے خاموش ہوتے ہی بولی۔

”اچھا! پھر کیا کروں؟“

”اس کے بعد سیڑھی سی بات یہ ہے کہ ان سے کہو کہ بھی اگر آپ فلاں نہیں کر رہے ہیں تو جا کر میرے ماں باپ سے بات کیجئے۔“

مہرین کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔
عفت نے پوچھا۔

”کیا سوچنے لگیں؟“

وہ چونک کر بولی۔

”کچھ نہیں۔“

”پھر بھی کچھ تو۔“

”میں یہ سوچ رہی تھی کہ وہ پٹرا ایک رئیس زادہ۔“

”رئیس زادہ ہے تو کیا ہوا؟“

”ان لوگوں کے یہاں شرافت کا معیار کچھ اور ہوتا ہے۔“

”بس تو پھر ڈانٹ ڈپٹ کر اس قصے کو ابھی ختم کر دو۔“

”ہاں! میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“

”پھر اتنی فکر مند کیوں ہو؟“

”فکر مندہ مومن تو کیا کروں؟ بیٹھے بیٹھائے ایک پریشانی شروع ہو گئی۔“
”سب ٹھیک ہو جائے گا، زیادہ پریشان مت ہو۔“

”اصل میں بات یہ ہے عفت کہ مجھے فلرٹ کرنے والے مردوں سے بڑا لگتا ہے۔“

”تمہیں ڈر لگتا ہے اور مجھے نفرت آتی ہے ایسے مردوں سے۔“

دونوں کچھ دیر اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبی رہیں پھر مہرین اپنی ٹیبل پر چلی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

مہرین کو عفت کے بتائے ہوئے سارے مشوروں پر عمل کرنے کی رت ہی نہیں پڑی۔ وہ رئیس زاوے — جن کی شخصیت کی طرح ہلکا م بھی بڑا خوبصورت سا تھا۔ سچ مچ مہرین کو اپنا جیون سا بھتی بنانے کے لئے حد بخندہ تھے۔ وہ دوبار کے بعد تیسری بار مہرین سے ملنے آفس آئے اس کے بعد انہوں نے اپنے گھر والوں کے ذریعے باقاعدہ پیغام دیا۔ ان کے گھر والے مہرین کے گھر کے چکر لگانے لگے۔ مہرین کی ڈانٹ ڈپٹ بے خیال سے اب وہ اسے فون بھی نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی انہوں نے کبھی مہرین ہل یا کسی تفریحی مقام پر لے جانے کی پیشکش کی عفت کو ان کی شرافت کو کچھ اعتبار سا اچکا تھا۔ اعتبار اگرچہ مہرین کو بھی اچکا تھا لیکن پھر بھی جانے والے باقی خوف مندہ تھی۔

عفت نے جب اس خوف کی وجہ اس سے پوچھی تو اس نے بڑے بے

خودگی سے کہا۔

ہوں کی اتنی اور بہنوں کی بہت مدد کی۔ مہرین کے گھر والے اس کے سگھڑاپے
اور اسے سہاوت تھے۔ شادی کے سلسلے کی تمام تقریبات میں عفت گھر کے ایک
نزدیکیت سے ہر کام میں پیش پیش تھی۔ مہرین کے کام کر کے اسے انجانی
مترت ہوتی تھی۔ اسے خود حیرت تھی کہ تقریباً سال بھر کے عرصے میں مہرین
اس حد تک کیسے اشد انداز ہو گئی تھی۔ جب کہ رخصتی اور شہلا پانچ طویل
ہوں میں بھی اس کے دل میں وہ جگہ نہیں بنا سکی تھیں۔

مہرین کی بری اس قدر شاندار آتی تھی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی
رہ گئیں شاندار کیوں نہ ہوتی؟ رئیس زادے کی شادی تھی اور شادی
بے نیاز ارمانوں کی۔ مہرین اختر کے چاہنے کا انداز بے پناہ والا نہ تھا۔
نادرنگی کو دیکھ کر کبھی کبھی تو یہی احساس ہوتا تھا کہ اگر ان کا بس چلے تو
ان کے ستارے توڑ کر مہرین کا دامن ان جھلملاتے ہوئے ستاروں
بے بھر دیں۔

مہرین کا حسن نہ جھلملاتے ہوئے قیمتی کپڑوں کا محتاج تھا اور نہ جھلملاتے
بے بیش بہا زیورات کا۔ لیکن یہ تمام چیزیں بہر حال اسی کے لئے آئی
تھیں اور انہیں پہننا بھی ضروری تھا۔ سچ بن کر تو مہرین پر اس قدر روپ
چاہتا تھا کہ ان کا بس اس کے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ اوپر سے اس
پشیمان، کچھ گھبراؤ اور کچھ سہما ہوا سا انداز کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔
شادی میں اس کی چند سہیلیاں اور رشتے کی بہت ساری بہنیں بھی
ہیں مگر مہرین کے نزدیک جو کچھ عفت تھی وہ کوئی نہیں تھا۔ مہندی

”مردوں کی ذات اچھی نہیں ہوتی عفت!“

اس نے اپنے بہنوئی اور چھوٹے چھوچپا کے سیاہ کرہ تو لوں کی خنجر ولسان
اسے سنائی۔ اس کی چھوچپی کے ماتھے پر لفظ ”طلاق“ ایک سیاہ داغ بن کر رہ گیا تھا
اور مہرین اس داغ کی سیاہی سے خوفزدہ ہو کر اپنے شوہر کا ہر عیب اور بظاہر
ستم بوجہ و کراہ برداشت کر رہی تھیں۔

عفت نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔
اچھے برے سب طرح کے مرد ہوتے ہیں، اگر دنیا اچھے مردوں سے خالی ہو
جائے تو پھر عورتوں کا دنیا میں کہیں ٹھکانہ نہ رہے۔ ضروری نہیں کہ مہرین
اختر بھی تمہارے بہنوئی اور تمہارے چھوچپا کی طرح ظالم و جاہل اور اوباش
مرد ہوں۔

مہرین نے جیسی یہ کہہ کر اپنے آپ کو سمجھایا تھا کہ جب قسمت کی ڈور مہرین
اختر کے ساتھ بندھتی ہے تو بچہ لے ڈرنے اور خوفزدہ ہونے کے آنے
والے حالات کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھنا چاہیے۔

مہرین اختر کے گھر والوں کو مہرین کے گھر کے چکر لگاتے دنوں بلکہ مہینوں
گزر گئے۔ ایک داماد کو دیکھنے کے بعد دوسرے کے معاملے میں ان لوگوں کا
معتاد ہونا لازمی تھا۔ اپنے اطمینان کے لئے وہ جانے کن کن ذرائع سے
مہرین اختر کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے۔ پھر آخر کار انہوں
اللہ کا نام لے کر ان کے گھر والوں کو زبان دے دی۔ مہرین کی شادی کے
تیاریاں شروع ہو گئیں۔ عفت نے اس کے جینے کی بہت سی چیزیں تیار

والے روز سے مہرین نے اسے بلا کر رکھا ہوا تھا جب پہلے پہل مہرین نے اس سے رہ جانے کے لئے کہا تو عفت سوچ میں پڑ گئی۔

ارے ایہ کیسی انوکھی بات ہو رہی ہے؟ میں تو رشتہ کی شادی کے موقع پر بھی مہمانوں کی طرح شریک رہتی تھی۔ سوائے ماموں جان کے گھر وہ کبھی کسی کے گھر نہیں رہی تھی۔

اماں اور بھائی میاں کیا سوچیں گے، وہ ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیں گے اور نہ ہی یہ مناسب ہے۔

اس نے مہرین اور اس کے گھر والوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ لوگ خود اماں اور بھائی میاں سے اجازت لینے کے لئے تیار تھے عفت کو یکا یک یقین تھا کہ صاف انکار ہو جائے گا۔ مگر جب اماں اور بھائی میاں نے یہ جبر و کرہ نہیں بلکہ بے حد خوشی کے ساتھ اسے مہرین کے گھر رہنے کی اجازت دی تو اسے احساس ہوا کہ ان دونوں کو اس کے اوپر کتنا اعتماد تھا

اس نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی —

خدا یا! اعتماد کی یہ دیوار کبھی ٹوٹنے نہ پائے۔

مہرین اور اس کے گھر والوں کو اور بہت سے خدشات کے ساتھ خدشہ یہ بھی تھا کہ اتنے بڑے گھر میں جا کر کہیں وہ احساسِ کمتری کا شکار نہ ہو جائے۔ جب مہرین آخر کے گھر والے ان کے گھر کے پھیرے لگاتے تھے تو مہرین کے ابا نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ —

”دیکھتے صاحب! یہ رشتہ قبول کرنے میں ایک بڑی پیچیدگی ہے۔“

اپنی بیٹیوں کو اپنی ہی حیثیت کے لوگوں میں بیاہنے کا قائل ہوں۔ جہیز پہ بیٹی ہی کو دیا جاتا ہے لیکن سسرال والے توقع کرتے ہیں کہ جہیز ان شایانِ شان ہونا چاہیے۔ میں آپ لوگوں کی یہ اُمید قطعی پوری نہیں کر سکتی اور نہ ہی آئندہ زندگی میں اپنی بیٹی کو مسلسل کچھ نہ کچھ دیتے رہنے کے لئے میرے پاس کوئی بہت بڑا بینک بیلنس ہے۔

اپنے طور پر ہر بات کی وضاحت پہلے سے کر دینا مہرین کے گھر والوں کا غرض تھا۔ لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ جب پسند، چاہت اور محبت کے بات درمیان میں آ جاتے ہیں تو جہیز، اس کی شان و شوکت، خاندان اور مال کی آہان اور درجوں کا مساویانہ ہیں۔ ان سب کی حیثیت محض نوئی ہو کر رہ جاتی ہے اور یہاں بھی بات مہرین کے لئے بے پناہ پسند، بے پناہ عزت اور شدید محبت کی تھی۔ یہاں سے اسے کسی اور بات کی گنجائش کہاں باقی رہ سکتی تھی۔

شادی کی ساری رسمیں ہوئیں، وقتِ رخصت قریب آیا اور مہرین اپنی جہیز کی ہیکلوں تلے ڈھیروں آنسو چھپانے، دل میں خوف اور ڈر چھپانے، رومارغ میں ان گنت دوسروں کے لئے مہر و زختر کی ملکیت بن کر چلی گئی۔ اس رات بڑی دیر تک جاگتی رہی اور مہرین کے بارے میں سوچتی رہی۔ دوسرے روز وہ مہرین سے ملی تو اسے خوش دیکھ کر عفت کو قدرے مینال ہوا۔

پھر وقت گزر رہا ملا گیا، عفت کے وہی شب و روز تھے، وہی مہرین تھیں

نہیں۔ مہرین نے اب ملازمت چھوڑ دی تھی۔ لیکن عفت سے اب بھی اس کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ٹیلیفون تقریباً روزانہ ہی آتا تھا۔ فرخ بھائی نے سہ ماہ قبل چھوٹی آپا کی وجہ سے ٹیلیفون لگوایا تھا۔ مہرین کی سسرال میں کوئی بھی تقریب ہوتی تھی، عفت ضرور بلائی جاتی تھی اور ویسے بھی مہرین اکثر گاڑی بھیج کر عفت کو بلوالیتی تھی۔ مہرین اختر کے ساتھ کئی دفعہ وہ اس سے ملنے کے لئے گھر بھی آتی۔ مہرین اختر اور اپنے سسرال والوں کی تعریفیں کرتے اس کی زبان نہیں ٹھکتی تھی۔

عفت کبھی کبھی اسے چھیڑنے کوں۔

”تم کس قدر غوف زدہ محفیں مہرین؟ اب کہاں گیا تمہارا ڈر؟“ وہ بڑی معصومیت سے پلکیں جھپکا کر کہتی۔

”تم بھٹیک کتنی محفیں عفت! ابھی دنیا اچھے مردوں سے خالی نہیں ہوئی دیکھو نا! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مہرین اتنے اچھے انسان ثابت ہوئے ہیں تو یہی خیال کرتی ہوں کہ خدا نے میری حیثیت سے کہیں زیادہ مجھے دے دیا ہے۔“

عفت بھی اسے مسرور پا کر بہت مطمئن تھی۔ مہرین کی شادی کو ایک سال ہو گیا تھا۔ اس شام اس کی شادی کی سالگرہ تھی۔ مہرین اختر نے اس تقریب کا اہتمام بڑے اونچے پھیلنے پر کیا تھا۔ عفت کے گھر سے بھی سبھی مدعو تھے۔ لیکن سوتے عفت کے کوئی بھی نہیں گیا۔ عفت کو لینے کے لئے مہرین اختر کا بورڈی ملازم سفید چمکتی ہوئی گاڑی لے کر آیا عفت کو

ملے تھا کہ تقریب میں شریک ہونے والی خواتین اور لڑکیوں کی سچ و سچ قابل دیدار۔ لیکن پھر بھی اس نے تیار ہوتے وقت کوئی اہتمام نہیں کیا۔ بیکل انار کے رنگ کی ساڑھی پر سیپ کا بہت نازک اور نفیس سا کام بنا ہوا تھا۔ بالوں کا انار انار کی طرح سادہ تھا، سیاہ خمدار بالوں کی چوٹی پشت پر لہرا رہی تھی۔ پھر آپا نے اسے ایک ایسا (GARVET) کا ہلکا سا سیٹ پہنا یا۔ وہاں نے ان کے ہمہ سنے حال ہی میں بنوایا تھا۔ سفید بچہ ایڑی کی ہٹانیں اس ہاتھ چھوئے۔ نمایاں ٹاک رہا تھا۔ ہلکے ہلکے میک اپ نے اس کے چہرے کے رنگ و روپ کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ فزنی اور چلنے آپا نے اسے اس قدر سراہا کہ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

فزنی اور چھوٹی آپا تک تو پھر بھی غلبت تھا۔ لیکن جب مہرین نے اسے دیکھتے ہی قصیدہ خوانی شروع کی تو اس کی جھینپ کسی طرح کم ہونے ہی نہیں آئی۔ اس نے سوچا۔

مہرین تو کچھ زیادہ ہی بے وقوف بنا رہی ہے اپنے آپ کو نہیں دیکھتی۔ اتنے غضب کی حسین لگ رہی ہے۔ چمکدار سرخ میکسی اور ڈانمڈ کے ہڈاناز اور نفیس سے سیٹ میں اس کا حسن شعلہ بھولا بنا ہوا تھا۔ اس کے خوبصورت اسٹائل میں اس کی مراحی مائل گردن کچھ اور نمایاں لگ رہی تھی۔ مہرین اختر کے ساتھ کھڑی وہ مسکرا مسکرا کر مہمانوں کا استقبال رہی تھی۔

عفت نے پیار سے ان دونوں کو دیکھا اور سوچا۔
کس قدر خوبصورت پیڑھے دونوں کا۔

مہرین کی بڑی نندا سے ساتھ لے کر نشستوں کی طرف چل آئیں۔
اس نے سرسری نگاہ سے پورے لان کا جائزہ لیا۔ بے شمار لوگ تھے۔
جنہیں وہ بالکل نہیں جانتی تھی۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جن سے اس کا
آمناسا مناسا دوستی کے موقع پر ہوا تھا۔ وہ ایک نسبتاً پرسکون گوشے کی
طرف بڑھ گئی۔ اپنا پرس میز پر ڈال کر کسی کی نشست سے ہٹا کر اور بڑے
مطمئن انداز میں ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ درختوں میں لگے ہوئے
سبز نیلے پتیلے اور سرخ قلعے جھلکائے تھے۔ آدکسٹر کی آواز بہت دیر
تھی۔ شام کی ہواؤں سے پلٹی ہوئی مچھو لوں کی مہک قیمتی پرفیسو مزے
سے ہم آہنگ ہو کر فضا میں رچ گئی تھی، قیمتی سنگھٹوں اور سنگاروں کی خوشبو
اور اڑتے ہوئے دھویں نے ماحول میں کچھ گھٹن سی پیدا کر دی تھی۔ لوگوں کے
ہجوم پر نظر پڑوڑاتے ہوئے اس کا ذہن بھٹک گیا۔ وہ جانے کہ سہول
میں ڈوب گئی اور چونکی تو اس وقت جب کوئی بڑی بے تکلفی سے اس کے
سامنے آکر بیٹھ گیا اس نے پلٹ کر اٹھا کر دیکھا اور یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں
لگی کہ بیٹھنے والا اپنی مرضی سے یہاں نہیں بیٹھا تھا۔ اس کی راہنمائی کرنے
والا لمٹ کر جا چکا تھا۔ وہ مہر و زختر کا کوئی بھانجا یا بھتیجا تھا جو ہمال
کو خالی نشست تک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

اور اب —

دو مہمان —

اور اجنبی

ایک دوسرے سے ناواقف
اپنی اپنی نشست پر گم سم بیٹھے سوچ رہے تھے۔
ہر کون ہے؟

ہر کون ہے؟

نہ۔ اس سوال کا جواب کون کسے دیتا؟

اور پھر سوال کرنے میں پہل کون کرتا؟

کتنا ہنگامہ تھا اور کتنا شور؟

نہ وہاں —

اس گوشے میں کتنی خاموشی تھی۔

خاموشیوں کے تلے کون توڑنا؟

ایک دفعہ جو دونوں کی نگاہیں اٹھیں تو کلمہ اگئیں۔

عفت نے اپنی نگاہوں کا رخ بدل دیا۔

اور وہ —

وہ جو کوئی بھی تھے حجب میں اپنا سنگھٹ کیس تلاش کرنے لگے۔ سنگھٹ
مل گیا تو لاسٹر ہی نہ ملتا تھا اور حجب دونوں ہی مل گئے تو وہ شاید سوچ

بڑے کئے کہ —

ہائیں یا نہ جلاتیں؟

سلاگتیں یا نہ سلاگتیں؟
وہ سوالیہ لگا ہوں سے عفت کی طرف دیکھ رہے تھے اور عفت اپنی
بہن بیٹھی تھی۔

پھر انہوں نے اس کی جانب قدرے جھکے ہوئے کہا۔
”معاف کیجئے گا۔“

عفت نے ان کی طرف دیکھا۔

”اگر اجازت ہو تو میں ایک سگریٹ.....“

عفت نے ان کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔
”تمہیں نیک لو، کہہ کر وہ اپنے سگریٹ کیس کی طرف متوجہ ہو گئے مگر
نکال کر انہوں نے ہونٹوں میں دبایا اور لائٹر سلاگنے لگے۔ لائٹر کا

ساشعلہ ان کے چہرے پر کانپ اٹھا۔ وہ سر جھکاتے اپنے کام میں مشغول
تھے اور عفت بڑے اطمینان سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان کی عمر کا
پینتیس چونتیس سال ہوگی، سرخی مائل گیواں رنگ شام کی جھللا ہوا
بے مدخو بصورت نظر آ رہا تھا۔ چہرے کے نقش و نگار بہت جاذب
تھے، بالوں میں کوئی پیچ و خم نہیں تھا نہ کوئی مانگ تھی۔ اوپر کی طرف
کہ بالوں کو ایک خاص انداز سے سیٹ کیا گیا تھا یا کہ وایا گیا تھا۔ بے
قیمتی سوٹ، سفید بے داغ قمیض اور خوبصورت ٹائی ان کے قد و قامت
پر بہت سچ رہی تھی۔ دونوں ابروؤں نے آپس میں مل کر ایک چھوٹے
چاند کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جوان کی ستواں ناک کی سیدھ میں بہ

ان تھا پلکیں بے مدچکیلی سیاہ تھیں، جس وقت لائٹر کے شعلے کی لوانکے
رے پر کانپ رہی تھی وہ کچھ اور زیادہ پرکشش لگ رہے تھے۔

سگریٹ سلاگ کر انہوں نے جونہی عفت کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی
رہیں دوسری طرف کر لیں۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے سگریٹ پیتے ہوئے دھویں
کے مرغولے بکھرتے رہے۔ پھر قدرے جھکے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

”آپ مہر و ز اختر کی رشتہ دار ہیں؟“

عفت نے سر گھما کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

”جی نہیں،“

”پھر مسٹر مہر و ز کی رشتہ دار ہوں گی،“

”نہیں۔“

وہ خاموش ہو گئے۔ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ اتنے مختصر جواب دے
اس نے تو آگے کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہیں دیا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے پھر ہمت کی۔

”آپ نے بتایا تھیں کہ آپ مسٹر اور مسٹر مہر و ز کی کون ہیں؟“

عفت نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”آپ نے پوچھا تھا؟“

وہ اس سے بھی زیادہ حیران ہو کر کہہ بولے۔

”کیا میں نے نہیں پوچھا؟“

”میرا خیال ہے نہیں۔“

”پھر میں زبردستی تو نہیں کر سکتا نا یہ تو آپ کی خوشی پر منحصر ہے۔“

”ہوں! خاصی معقول بات کہی آپ نے“

”یہ پہلی معقول بات ہے؟“

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“

اسی دوران مہرین اور مہروز اختر وہاں آگئے۔ مہروز اختر اپنی مصروفیت کا روزا روتے ہوئے ان سے معذرت کر رہے تھے اور مہرین محنت سے کہہ رہی تھی۔

”نور ہو رہی ہو محنت؟“

”نہیں۔“

مہروز اختر نے محنت سے کہا۔

”غالباً آپ دونوں کا تعارف نہیں ہوا۔“

”تعارف کی ضرورت قطعی نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”میرا خیال ہے یہ تقریب آدھ گھنٹے یا ایک گھنٹے میں ختم ہو جائے گی؟ اور اتنی دیر خاموش بیٹھنا میرے لئے مشکل نہیں ہے۔“

مہروز اختر اور مہرین دونوں ہنس پڑے اور وہ اس کے سامنے بیٹھے بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

مہروز اختر نے کہا۔

”آپ بے شک خاموش بیٹھ سکتی ہوں گی لیکن ان بے چاروں کا خیال

”اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے پوچھا تھا۔“

”آپ نے پوچھا تھا کہ میں ان کی رشتہ دار ہوں؟“

”جی ہاں؟“

”غالباً آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے کہا تھا نہیں“

”جی“ وہ کچھ الجھن میں پڑ گئے۔

”اس کے بعد آپ نے یہ تو نہیں پوچھا کہ میں ان کی کون ہوں۔“

وہ ایک دم ہنس پڑے اور بولے۔

”آپ کو تو وکیل ہونا چاہیے،“

”کیوں؟“

”بحث کرنے کی عادت معلوم ہوتی ہے آپ کو۔“

”لیکن مجھے وکالت سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”پڑھتی ہیں آپ؟“

”جی نہیں۔“

”پڑھاتی نہیں۔“

”قطعی نہیں۔“

”تو پھر خود ہی بتا دیجئے کہ آپ کیا کرتی ہیں؟“

”اور اگر میں بتانا پسند نہ کروں تو؟“

”کوئی حرج ہے“

”ممکن ہے، ہو۔“

دیئے شہاب صاحب! میرا خیال ہے میں ان کا تعارف آپ سے کروا ہی

”اے“

اس نے عفت کی طرف اشارہ کیا۔

چیس آپ کی مرضی۔“

یہ میری بہت پیاری سہیلی ہیں عفت شجاع۔“

اچھا۔“

بڑی اچھی ادیبہ ہیں۔“

بہت خوب۔“

ہم دونوں نے تقریباً ڈیڑھ سال تک کام کیا ہے۔“

وہ چونک کر بولے۔

”اچھا! تو یہ بھی اسی ہفتہ وار رسالے میں کام کرتی ہیں؟“

”جی! یہ خواتین سیکشن کی انسپراج ہیں۔“

پھر تو بڑی خوبیوں کی مالک ہیں۔“

انوں نے بڑے انداز سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

نہرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ بہت کم سخن ہیں۔“

”جی! اس کا اندازہ تو مجھے بڑی اچھی طرح ہو چکا ہے۔“

”اگر آپ دو گھنٹے تک ان کے سامنے خاموش بیٹھ رہیں تو یہ بھی جپ

ٹھہریں گی۔“

کیجئے۔“

عفت نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں! مہروز بھائی! میں بھی محسوس کر رہی ہوں کہ یہ بہت بور ہو رہے

ہیں، آپ ان کے لئے کسی اچھی سی کمپنی کا انتظام کر دیجئے۔“

مہروز اختر نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کیوں شہاب؟ کہیں اور بیٹھنا چاہو تو.....“

مہروز اختر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی شہاب احمد بولے۔

”نہیں! میں بالکل مناسب جگہ بیٹھا ہوں۔“

نہرین نے کہا۔

”شہاب صاحب! تکلف کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس طرف میرے

بھائی جان بیٹھے ہیں آپ چاہیں تو ان سے آپ کا تعارف کروادوں۔“

شہاب احمد نے کہا۔

”شکریہ سفر مہروز! دراصل اس وقت میرا خاموش بیٹھنے کا ہی موڈ ہے۔“

مہروز اختر نے کہا۔

”کیوں؟ خیریت؟“

”مہنگاموں میں خود خاموش بیٹھ کر ہجوم کو دیکھتے رہنا کافی دلچسپ

مشغلہ ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو پھر آپ اپنا مشغلہ جاری رکھتے۔“

نہرین نے جاتے جاتے رک کر کہا۔

”لیکن جب دوسرا شخص انہیں خود ہی مخاطب کرے تب تو انہیں جواب دینا چاہیے نا!“

”ہاں! کیوں نہیں؟ آپ باتیں کر کے تو دیکھتے۔“

”آپ کے آنے سے پہلے بھڑکیا تو تھا۔“

”اچھا پھر؟ کیسا راز راز لٹ؟“

”بس! کچھ یونہی سارہ۔“

”چلیے دوبارہ بھڑکیا کر کے دیکھتے۔“

”ہرمن نے جاتے جاتے کہا۔“

”ہرمن کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ایک کاٹنے کی رسم شروع ہو گئی۔ سب اس طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر تصویریں کھینچوانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب کھانے پینے کا وقت ہوا تو عفت نے دیکھا کہ شہاب احمد اس کے قریب کھڑے تھے۔ یا تو انہیں اتفاقاً ادھر جگہ ملی تھی یا پھر دانستہ وہ اس کے قریب چلے آئے تھے۔ عفت نے کنکھیدوں سے ان کی طرف دیکھا اور وہ سر گھٹائی سے لہجے میں بولے۔“

”غالباً میرا یہاں کھڑا ہونا ناگوار گزر رہا ہے آپ کو؟“

”یہ خیال کیسے آیا آپ کو؟“

”آپ کا دیکھنے کا انداز یہی ظاہر کرتا ہے۔“

”تو کہیں اور جا کر کھڑے ہو جاتے۔“

”مجھے اپنے لئے اس سے زیادہ مناسب جگہ کہیں نظر نہیں آئی۔“

پنے لئے مناسب اور نامناسب کا فیصلہ بڑی جلدی کر لیتے ہیں آپ! نا ہاں! قوت فیصلہ خاصی تیز ہے میری۔“

”راپنے بارے میں خوش فہمی بھی کافی ہے آپ کو۔“

”نا!؟“

”جی۔“

”کچھ حیرت زدہ سے کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں یہ جملہ سننے کی توقع نہیں تھی۔“

”عفت نے پوچھا۔“

”کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟“

”اس کا فیصلہ تو آپ خود ہی کیجئے۔“ ان کی پیشانی پر پہرہ سلوٹیں پڑ گئیں۔

”عفت کے ہونٹوں پر ایک دم مسئلہ امیٹ بکھر گئی۔ اسے مسکراتے دیکھ کر

بوڈیل گیا۔ وہ قدرے مدعو لہجہ میں بولے۔“

”شکر ہے خدا کا۔“

”جی! عفت نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔“

”یہ خیال تھا کہ مسئلہ امیٹ کا کمزور اس طرف سے بالکل نہیں ہوتا۔“

”کس طرف سے؟“

”یہی! آپ کے ہونٹوں کے ارد گرد،“

”اور کیا کچھ سوچ ڈالا آپ نے میرے بارے میں؟“

”عفت کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔“

سین؟

”یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے میں نے اس بار سے میں کچھ سوچنے کی رحمت قطعی
ہی کی“

شہاب احمد سر جھکاتے کچھ سوچتے رہے عفت نے ایک لمحے کے لئے
ایک طرف دیکھا اور پہلی بار انہیں مخاطب کیا۔
”شہاب احمد صاحب!“

”جی! فرمائیے۔“

”میں ایک بات آپ پر واضح کر دینا مناسب سمجھتی ہوں۔“
”جی! ضرور!“

”یہ جو ماحول آپ دیکھ رہے ہیں نا!“
”جی!“

”میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں“
”اچھا۔“

”مہربن کے بے پناہ اصرار اور محبت سے مجبور ہو کر میں یہاں چلی آئی ہوں۔“
”جی، آپ کسے جانتے، میں سن رہا ہوں۔“
”میرے گھر کا ماحول اس سے قطعی مختلف ہے۔“
”یقیناً ہو گا۔“

”آپ مجھے جس قسم کی لڑکی سمجھ رہے ہیں۔ میں ایسی نہیں ہوں۔“
”یعنی کس قسم کی لڑکی؟“

”اگر آپ کے برہم ہو جانے کا خیال نہ ہوتا تو بتا دیتا۔“
پھر عفت نے خاموش رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی
نشست پر اسکر بیٹھ گئی۔ اپنے پرس میں سے الپچی نکال کر منہ میں ڈالتے
ہوئے اس نے دیکھا سامنے سے شہاب احمد آ رہے تھے۔ چلنے کا انداز خاصا
پر وقار تھا۔ وہ پھر اس کے سامنے آکر بیٹھ گئے۔ چند منٹ گزر گئے۔ شہاب
خاموش بیٹھ رہے۔ بات کرنے میں عفت کے پہل کرنے کا سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا تھا۔ شہاب احمد گاہے گاہے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور عفت
اس طرح انجان بنی بیٹھی تھی جیسے اب سے کچھ دیر پہلے تک ان دونوں میں کوئی
بات ہی نہ ہوئی ہو۔

پھر شہاب احمد قدرے جھجکتے ہوئے بولے۔
”غالباً ہم دونوں کی ملاقات آئندہ تو نہیں ہو سکے گی۔“
”جی! یقیناً۔“

”آپ کو کوئی خواہش بھی نہیں؟“
”کس بات کی؟“

”یہی، آئندہ ملاقات کی۔“
”قطعی نہیں۔“

”اور میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”جی؟ میں سمجھی نہیں۔“
”میرا مطلب ہے کہ کیا آپ سمجھتی ہیں مجھے بھی آپ سے ملنے کی کوئی آفر؟“

”میرا مطلب ہے مردوں سے بہت جلد فری ہو جانے والی یا ایک ملاقات کے بعد دوسری ملاقات کی متنتی....“

”ہوے“

”اے آپ عرض ایک اتفاق سمجھتے کہ آپ کو یہاں نشست ملی اور ہمارے درمیان اتنی باتیں ہو گئیں ورنہ....“

”کتنی رہتے“

”ورنہ اس کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔“

”جی! آپ ٹھیک کہتی ہیں“

عفت خاموش ہوئی تو انہوں نے کہا۔

”اب کچھ میں بھی کہوں؟“

عفت خاموش رہی۔

”میں تو آپ کو بہت اچھی لڑکی سمجھ رہا ہوں۔“

عفت پھر بھی چپ رہی۔

”آپ یقین کیجئے یہ تو وقت اور ماحول کا تقاضا تھا جو میں آپ سے اتنی

باتیں کر بیٹھا۔“

عفت نے ایک نگاہ غلط اندازان پر ڈالی۔

”مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میری بیشتر باتیں ناگوار گزری ہیں۔“ شہاب احمد

نے کہا۔

عفت نے ان کی بات کی تصدیق یا تردید نہیں کی۔

”چاکی مرضی نہیں ہے تو ہم ہرگز نہیں ملیں گے، کبھی نہیں ملیں گے“

وقت مہربان ادھر آگئی۔

نت نے کہا۔

”رین! اب میں گھر جاؤں گی۔“

”دیر اور نہیں بٹھرو گی؟“

”میں بہت دیر ہو جائے گی“

”اس سے آج تم بہت بدمعاش ہوئی ہو، میں تمہیں وقت نہیں دے سکتی نا“

”بے موقعوں پر انفرادی توجہ دینا بہت مشکل ہوتا ہے، تم بے فکر رہو۔“

”نقطی محسوس نہیں کیا۔“

”اچھا یہ تھا، اب کب آؤ گی؟“

”بب تم بلواؤ گی۔“

ٹھیک ہے پھر تیار رہنا ہیں کسی دن بھی ڈرائیور کو بھیج دوں گی۔“

ٹھیک ہے مگر اس وقت تو مجھے بھجوانے کا انتظام کرو۔“

”اؤ، میں ڈرائیور سے کہتی ہوں“

عفت جانے کے لئے کھڑی ہوئی تو شہاب احمد نے کہا۔

”ملاحظہ میں متجان“

ملاحظہ عفت نے ایک سرسری نگاہ ان پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

اس بات کو کتنی روز گزر گئے۔ ایک دن آفس میں اس کا ٹیلیفون آیا۔ عام طور

پر ایسی باتیں اور مہربان سے اسے ٹیلیفون کیا کرتی تھیں۔ مگر اس روز خلاف توقع

دوسری طرف ایک مروانہ آواز سن کر وہ چونک گئی۔

اس نے حیلان ہو کر کہا۔

”شہاب صاحب! آپ؟“

”جی! میں“

”فرمائیے، کیا کام ہے؟“

”کام تو کوئی خاص نہیں۔“

”عام ہی سہی۔“

”پھر میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے ٹیلیفون کرنے کی زحمت کیوں کی؟“

”آپ ناراض ہو گئی ہیں؟“

”آپ کو میری ناراضگی کی بہت پرواہ ہے؟“

عفت کا لہجہ بے حد تیکھا تھا۔

دوسری طرف شہاب احمد بالکل خاموش تھے۔

”اور کچھ نہ سہی، انسان کو اپنے الفاظ کا تو پاس ہونا چاہیے۔“

”مس شجاع! کیا میں بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں؟“ وہ کچھ ادم سے تھے۔

شہاب افسردہ بھی آواز کی شکستگی تو بھی بتاتی تھی۔

عفت نے کہا۔

”آپ کو یاد ہے؟“

”کیا؟“

”آپ نے مجھ سے کیا کہا تھا؟“

”میں نے تو آپ سے بہت سی باتیں کی تھیں، جانے آپ کس بات کا ذکر کر رہے ہیں“

”آپ ہی کے الفاظ دھراتی ہوں۔“

”جی! میں سن رہا ہوں۔“

”آپ نے کہا تھا۔ اگر آپ کی مرضی نہیں ہے تو ہم ہرگز نہیں ملیں گے،

”نہیں ملیں گے۔“

دوسری طرف شہاب احمد خاموش تھے۔

عفت نے کہا۔

”کیوں؟ یہی کہا تھا نا آپ نے؟“

”جی! مجھے یاد ہے۔“

”بھبھ؟“

”کیا میں اپنے الفاظ پر قائم نہیں ہوں؟“

”جی! عفت نے قدرے حیرت زدہ ہو کر کہا۔“

”میں آپ سے ملنے تو نہیں آیا۔“

عفت سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

شہاب احمد نے کہا۔

”غالباً فون پر بات کرنے یا نہ کرنے کی کوئی شرط عائد نہیں کی تھی آپ نے۔“

عفت چر کر بولی۔

”الفاظ سے کھیلنے کے فن میں خوب ماہر ہیں آپ“

”آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔“

شہاب احمد پھر خاموش تھے لیکن انہوں نے ٹیلیفون بند نہیں کیا تھا عفت
، خود ہی ٹیلیفون بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ کافی دیر تک الٹی الٹی سی بیٹھی رہی
باب احمد کے جملوں کی بازگشت نے اسے کوئی کام نہیں کرنے دیا۔
اس نے سوچا۔

آخر شہاب احمد کو کیا ہو گیا ہے؟

اس قدر سنجیدہ اور پروقار سا انسان ایک ہی ملازمت میں دل کے ہاتھوں
میں غبور ہو گیا ہے!
نہیں! میں نہیں مان سکتی۔

یہ سراسر فلرٹ ہے۔

بے وقوف بنانے کا انداز ہے۔

اور وہ خود مجھے کیا سمجھ بیٹھے ہیں؟

میں کوئی ایسی لڑکی ہوں کہ ان کی اس قسم کی باتیں سن کر ان کی طرف کھینچی
لا جاؤں گی۔

ان کی شخصیت انٹر اگیزر سی لیکن —

لیکن سر راہ اس قسم کے لوگ کبھی کبھی مل ہی جایا کرتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان کے بارے میں کچھ جانے بوجھ بغیر ان پر
تلاش کر لیا جائے۔

ان کی باتوں کا انداز خوبورت کمی لیکن —

”آپ جو چاہیں کہہ لیں۔“

”بہر حال! اگر بات تک یہ شرط عائد نہیں کی تھی تو آج کے بعد سے اس شرط
کا خیال رکھنے لگا۔“

”گو یا ٹیلیفون کرنے کی اجازت بھی نہیں۔“

”قطعاً نہیں۔“

”کیا یہ ظلم نہیں؟“

”اس میں ظلم کی کیا بات ہے؟“

”کوئی بات کہنے سے پہلے یہ تو سوچ لیجئے کہ دوسرا شخص اس کی پابندی کر

بھی سکے گا یا نہیں؟“

”آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟“

”آپ کیا سمجھتی ہیں؟ میں نے اس حرکت سے باز رہنے کے لئے اپنے دل

کو ذرا بھی نہیں سمجھایا ہو گا؟“

”کون سی حرکت؟“

”یہی آپ کو ٹیلیفون کرنے والی۔“

”مجھے کیا معلوم“

”پتہ نہیں مس شجاع! آپ کو اس کا اندازہ ہے یا نہیں کہ بعض باتوں پر

ہمارا ذرا بھی تواختیار نہیں ہوتا۔“

”میں ان سب پیکروں میں نہیں پڑنا چاہتی، آپ ٹیلیفون بند کر دیجئے۔“

”وہ یہ آپ کا حکم ہے؟“

دل ایسی ارزراں تھے تو نہیں کر محض انداز گفتگو سے متاثر ہو کر اسے ٹھارہ دیا جائے۔
نہیں!

یہ کبھی نہیں ہوگا۔

ہرگز نہیں ہوگا۔

وہ میری طرف جلتے قدم بڑھ آئے ہیں۔

اتنے ہی قدم انہیں پیچھے ہٹنا ہوگا۔

ان کے بارے میں اس قدر قطعی فیصلہ کر کے وہ مطمئن سی ہو گئی۔ سر جھٹک کر

وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

اس بات کو کتنی دن گزر گئے۔ ایک روز پیر شہاب احمد کا ٹیلیفون آیا۔
ان کی آواز پہچانتے ہی اس نے کہا۔

میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ ٹیلیفون نہیں کریں گے۔

جی۔

پھر

میں نے بھی آپ سے کہا تھا کہ آپ ایسی کوئی شرط نہ لگائیے جس کی

میں نہ کہہ سکوں۔

شہ شہاب صاحب!

جی! فرمائیے۔

آپ کو باد ہے؟

کیا؟

”آپ نے کہا تھا آپ مجھے اچھی لڑکی سمجھتے ہیں۔“

”جی! بالکل“

”پھر آپ خود ہی سوچئے آپ کی یہ روش درست ہے؟“

”ایک بات کہوں؟“

”کہئے۔“

”بڑا تو نہیں مانیں گی؟“

”اس کا فیصلہ تو بات سننے کے بعد ہی کروں گی۔“

”وہ جو ایک اچھی سی لڑکی ہے نا!“

عفت خاموش رہی۔

”اس اچھی سی لڑکی نے میری زندگی کا سارا سکون ختم کر دیا ہے۔“

”محض ایک ملاقات میں ہی؟“ عفت طنز پر انداز سے سنیں۔

”دل کے جذبے طویل ملاقاتوں کے محتاج نہیں ہوا کرتے۔“

”میرے نزدیک یہ سب فضول باتیں ہیں۔“

انہوں نے کچھ اور کہنا چاہا مگر عفت نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

اسی شام مہرین کی طرف سے اس کا بلاوا آگیا۔ سارے راستے وہ سوچ رہی کہ اسے مہرین سے شہاب احمد کا ذکر کرنا چاہیے یا نہیں؟ مہرین

آتے آتے اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ مہرین سے شہاب احمد کے بارے میں ضرور پوچھے گی، اس سے ان کا ذکر کر دینا ہی مناسب ہے ورنہ کسی اور سے خود یہ بات معلوم ہوتی تو وہ اس بات کو ضرور محسوس کرتا

نے اتنی اہم بات کا تذکرہ اس سے نہیں کیا۔

مہرین کے سامنے جب شہاب احمد کا ذکر ہوا تو وہ ان کی شان میں قصبہ خوانی

نے لگی۔ عفت کو ان کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ

انٹر کے اچھے دوستوں میں سے ہیں، ان کی دوستی زیادہ پرانی نہیں ہے۔

اشہاد بھی مہرین کو ان کے طبقہ میں ہی ہوتا ہے۔

عفت نے مہرین سے کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔ دونوں دفعہ

فون پر اپنی اور شہاب احمد کی گفتگو کے بارے میں بھی اس نے سرسری طور

بادیا۔ مہرین نے عفت کو وہی مشورہ دیا جو کبھی عفت نے مہرین کو دیا تھا۔ مگر

ت نے اس کے مشورے کو بالکل رو کر دیا۔

پھر ایک روز مقامی آرٹ گیلری میں تصویروں کی نمائش کے موقع پر شہاب احمد

ہاچانک اس کی ملاقات ہو گئی۔ سعدیہ باجی اور اشفاق بھائی جاتے جاتے

یہ بھی ساتھ لے گئے تھے۔ عفت کی نگاہ شہاب احمد پر پڑی۔ وہ انجان بن گئی

دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ شہاب احمد قریب چلے آئے انہوں

نے اسے مخی طیب کیا تو سعدیہ باجی چونک پڑیں۔ عفت کے پاس سوائے اس

علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ان کا تعارف سعدیہ باجی اور اشفاق بھائی سے

کرے۔ تعارف ہو جانے کے بعد شہاب احمد کے لئے راہ کچھ اور ہموار ہو گئی۔

تمام وقت ان لوگوں کے ساتھ رہے۔ ملاقات کے اختتام تک سعدیہ باجی اور

اشفاق بھائی ان سے خاصے متاثر ہو چکے تھے۔ اشفاق بھائی کے سامنے سعدیہ

نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر پہنچ کر بھی اماں، بھائی میاں اور فرخ بھائی

انہیں گھیرے رہے لیکن دوسرے روز انہوں نے ٹیلیفون کر کے عفت کو اپنے گھر لایا اور اس سے بہت کچھ اگلا لیا۔

عفت نے سوچا۔

یہ بہت اچھا ہو اگر سعدیہ باجی نے خود ہی اس سے پوچھ لیا، ورنہ وہ خود شاید کسی کو کچھ بتا نہ سکتی اور احساسِ حرم کا بوجھ اپنے ذہن پر لے رہی تھی۔ اسے شروع ہی سے اس بات کا خیال تھا کہ گھر میں کسی نہ کسی سے اس بات کا تذکرہ ضرور کرنا چاہیے۔

لیکن وہ کس سے کہتی؟

اماں سے؟

نہیں۔ اس کی بہت وہ اپنے آپ میں کبھی بھی پیدا نہ کر سکتی۔

چھوٹی آپا سے؟

ان کے ساتھ وہ اتنی فری نہیں تھی کہ اس قسم کی بات ان سے کہتی۔

فوزی سے؟

اسے تو وہ بالکل بچتی سمجھتی تھی حالانکہ فوزی اب کالج اسٹوڈنٹ تھی۔

سعدیہ باجی کو اسے تنگ کرنے کا بہانہ مل گیا۔ لیکن وہ بے حد سیریس تھی۔

کا خیال تھا کہ شہاب احمد بڑی سنجیدگی سے اس کے عشق میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس عفت کا خیال تھا کہ وہ محض اسے بے وقوف بنا رہے ہیں۔

اسے یقین تھا کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو شہاب احمد کو اس کے عشق میں مبتلا کر دیتی۔ وہ خود اس کے مقابلے میں کیا تھی۔ اس کا احساس بھی اسے

دراچ تھا۔ اس غفل میں ایک سے ایک خوبصورت اور جاذبِ نظر لڑکیاں موجود

تھیں۔ ان سب کو چھوڑ کر شہاب احمد کا اس پر فریضہ ہو جانا۔ یہ بات سرے

ہی فضول تھی۔ وہ اپنے دل میں کسی خوش فہمی کو جبکہ دنیا نہیں چاہتی تھی۔

چند روز بعد شہاب احمد نے پھر ٹیلیفون کیا۔

ان کی آواز سن کر وہ بری طرح برہم ہو گئی۔

یہ سلسلہ آپ کب تک جاری رکھنا چاہتے ہیں؟

”کون سا سلسلہ؟“

”میں مجھے بے وقوف بنانے لگا۔“

”بڑی ٹیکلف دہ بات کسی ہے آپ نے۔“

عفت نے مزید کچھ کہے بغیر ٹیلیفون بند کر دیا۔

تقریباً ایک ہفتے بعد مہربن کے یہاں اسے شہاب احمد نظر آئے اس کے آنے

پہلے ہی منٹ قبل وہ پہنچے تھے۔

نہ روز آخر اس وقت تک گھر نہیں پہنچے تھے۔ شہاب احمد کو دیکھ کر اسے

دوس ہونے لگا۔

اس نے سوچا۔

کچ وہ کیوں یہاں آگئی؟

اُمانے کے بعد فوراً ہی واپس کا خیال بے حد مضحکہ خیز تھا۔

اس نے سوچا۔

وہ ڈرائنگ روم میں نہیں بیٹھ گئی۔

لیکن مہربان شاید جان بوجھ کر اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھانا چاہتی تھی۔ وہ چند منٹ ان دونوں کے پاس بیٹھ کر ملازم کو ہدایات دینے کے بہانے اندر چلا گئی اور کافی دیر تک لوٹ کر نہیں آئی۔

ڈرائنگ روم کے خاموش پرسکون ماحول میں وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے اور باہر شام کے سائے طویل ہو رہے تھے شہاب احمد سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ ان کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش ناکام کر رہی تھی۔ شہاب احمد نے بڑی بے چینی سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور قدرے مدہم آواز میں بولے۔

”آپ بات نہیں کرتیں گی؟“

وہ خاموش رہی۔

”میری موجودگی ناگوار گز رہی ہے؟“

وہ پھر بھی چپ رہی۔

”میں واپس چلا جاؤں؟“

عفت نے ان کی طرف دیکھا اور بے حد سچاٹ لہجے میں بولی۔

”یہ سوال آپ اپنی میزان سے پوچھتے۔“

”کیوں؟ آپ مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں؟“

”آپ آخر مجھ سے بات کرنا ہی کیوں چاہتے ہیں؟“

”میرا دل چاہتا ہے۔“

”دل کا کہا ماننے ہی کیوں ہیں؟“

”ہوں۔“ انہوں نے ایک طویل سانس لی اور بڑی گہری سوج میں ڈوب گئی۔

عفت نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی پیشانی پر غور و فکر کی سلوٹیں نمایاں تھیں۔ مول میں ایک عجیب بے چینی اور پریشانی سی تھی عفت صوفے کی پشت سے ہائے بڑے اطمینان سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے ایک دم نظریں اکر اس کی طرف دیکھا اور بولے۔

”معلوم نہیں میں نے کون سا گناہ کیا تھا جو آپ میری زندگی کا سکون درہم برہم کرنے کے لئے مجھے مل گئیں۔“

عفت نے کچھ برہم ہو کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

”جی! مجھے کیا پڑی ہے جو آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم کرتی پھروں؟“

وہ خاموش بیٹھے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

”آپ ہی مجھے ٹیلیفون کر کے تنگ کرتے ہیں۔“

”آپ میری بات سننا پسند ہی کب کرتی ہیں؟“

”آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ آپ کا یہ بار بار ٹیلیفون کرنا آفس والوں کی نظر مل جائے مشکوک بنا دے گا؟“

”آپ نے کبھی میری عبوری کے بارے میں بھی سوچا؟“

”آپ کو کون سی عبوری ہے؟“

”میں آپ سے کہیں مل نہیں سکتا، ایک ٹیلیفون کا سہارا ہے، وہ بھی آپ

پسند نہیں۔“

تو میں کیوں اس قدر فکر مند ہوں؟
دینا میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جن کے ساتھ کوئی نہ کوئی دکھ، کوئی نہ کوئی غم

ہم کس کس کے لئے فکر مند ہوں گے؟
یہ انداز فکر سوائے پریشانی کے مجھے اور کچھ نہ دے سکے گا۔
مجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔

وہ ان کے خیالوں سے اپنا دامن چھڑا کر مطمئن سی ہو گئی۔
لیکن ایک شام پھر وہ اس کے سامنے چلے آئے۔ مہرزا اختر کے بھتیجے نے بڑے
امتحان میں پوزیشن لی تھی، اس کی کامیابی کی خوشی میں مہرین نے پارٹی کا انتظام کیا
زیادہ لوگ مدعو نہیں کئے گئے تھے۔ خاندان کے افراد بے حد قریبی رشتے دار
چند دوستوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ عفت اس تقریب میں شریک نہیں ہونا چاہتی
اس نے بہت جلدے بہانے تراشے، اپنی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔
وہ جتنا انکار کر رہی تھی مہرین کا اصرار اتنی ہی شدت اختیار کر رہا تھا۔ بارہ کر اس
مہرین کی بات مان لی۔

وہ مہرین کے یہاں پہنچی تو بہت سے مہمان آچکے تھے۔ بیشتر نشستیں بھری
لی نظر آ رہی تھیں۔ مہمانوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے اسے شہاب احمد
لڑائے وہ دو تین مردوں کے ساتھ ایک طرف کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔
نت انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔ مہرین کی ٹھانی چند منٹ اس کے ساتھ بیٹھی
بٹا کر رہی پھر اٹھ کر کسی اور ملنے والی کے پاس چلی گئیں۔ انہیں گئے ہوئے زیادہ

”سوال یہ ہے کہ آپ مجھ سے ملنا یا ٹیلیفون کرنا کیوں چاہتے ہیں؟“
”میرے چاہنے کی بات نہ کیجئے آپ! میری راہ میں تو ایسی دیوار حائل ہے۔“
کہ میں بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔“
عفت نے غصوں کیا کہ وہ پریشانی ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ افسردہ بھی ہو
گئے تھے۔

اس نے سوچا۔
ارے! انہیں کیا دکھ ہے؟
انہیں کون سا غم ہے؟
پھر مہرین آگئی۔ شہاب احمد آگے کچھ بھی نہ کہہ سکے اور وہ ان کی راہ میں حائل بننے
والی مجبوری کی اس دیوار کے بارے میں سوچتی رہ گئی۔
ایک مہینہ گزر گیا۔ شہاب احمد کی طرف سے کوئی ٹیلیفون نہیں آیا۔ اس
دوران وہ مہرین کے گھر ایک دفعہ بھی نہیں گئی۔ ورنہ شاید وہیں ملاقات ہو
جاتی۔

عفت کو بار بار ان کا خیال آیا۔

وہ حیران تھی
یہ کیسی تبدیلی آگئی ہے مجھ میں؟
میں نے تو کبھی کسی کے لئے اس انداز سے نہیں سوچا؟
انہیں اگر کوئی دکھ ہے۔

کوئی غم ہے۔

ویر نہیں گزری تھی کہ شہاب احمد آگئے۔

”ہیلو ایس شجاع!“

”ہیلو۔“ عفت نے ایک نگاہ غلط اندازان پر ڈالی۔

”اگر احانت ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں۔“

عفت نے سر کے خفیف سے اشارے سے ان سے بیٹھ جانے کو کہا۔

”شکریہ“ وہ اس کے سامنے والی نشست پر بیٹھ گئے۔

دو تین منٹ گزر گئے دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ عفت مہمانوں کے ہجوم کو دیکھ رہی تھی اور وہ عفت کو دیکھ رہے تھے، پھر انہوں نے ہی بات کرنے لیں۔

پہلی کی۔

”آپ کا کام کیسا چل رہا ہے؟“

”ٹھیک چل رہا ہے۔“

اس کے بعد پھر خاموشی مٹی۔

چند لمحوں بعد انہوں نے کہا۔

”میں آئندہ ہفتے باہر جا رہا ہوں۔“

”جی!!“ عفت چونک پڑی۔

انہوں نے پھر اپنی بات دہرائی۔

عفت نے پوچھا۔

”کس سلسلے میں؟“

”کاروبار کے سلسلے میں۔“

عفت ”اچھا“ کہہ کر پھر خاموش ہو گئی۔

”آپ نے میری واپسی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔“

”مجھے نہ آپ کے جانے سے کوئی دلچسپی ہے نہ واپس آنے سے۔“

”لوگ رسماً ہی پوچھ لیا کرتے ہیں۔“

”میں رسمی باتوں کی قائل نہیں۔“

”اگر کس کس بات کی قائل تمہیں ہیں آپ؟“

”میں سمجھی نہیں؟“

”میرا مطلب ہے آپ کو دنیا کی کسی بات سے دلچسپی بھی ہے یا نہیں؟“

”یعنی؟ کس بات سے؟“

”چھوڑیے، جانے دیجئے۔“ وہ کچھ شکستہ دل ہو کر لبو لے۔

عفت ہنسی پر بھٹوڑی لگاتے ہوئے قدرے آگے کو جھک کر لبو لی۔

”بعض دفعہ آپ معنوں میں باتیں کرتے ہیں۔“

”جی!!“ انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں۔“

”یعنی کون سی باتیں؟“

”اس روز آپ نے اپنی راہ میں حائل ہونے والی کسی دیوار کا ذکر کیا تھا۔“

”اے آپ کو؟“

”جی ہاں! شاید۔“

”شاید نہیں یقیناً۔“

” اچھا پھہ؟“

” اس دن سے مجھے کئی دفعہ خیال آچکا ہے کہ آپ کون سی عجوبہ سی اور کون سی دیوار کا ذکر کر رہے تھے۔“

” دیکھئے آپ کو میری ذات سے اتنی دلچسپی تو پیدا ہوتی۔“
وہ قدرے مسکراتے۔

عفت نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

” دیکھئے جناب! بات صرف اتنی سی ہے کہ جب آپ کسی کے سامنے اٹھیں
ادھوری باتیں کریں گے تو اسے تجسس تو ہو گا ہی!“

” پوری بات کہنے کا کوئی فائدہ ہو تو کوئی بھی جانتے“

” فائدے نقصان کا اندازہ آپ نے قبل از وقت کیسے کر لیا؟“

” بعض باتوں کا اندازہ قبل از وقت ہی ہو جاتا ہے۔“

” بہر حال اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی اس روز والی بات کی وضاحت

کر دیں۔“

” کیا یہ وقت اور جگہ ان تفصیلی باتوں کے لئے مناسب ہے؟“

” اور کسی جگہ ملنے کی تو آپ توقع بھی نہ رکھئے گا مجھ سے۔“

” اس قدر سنگدلانہ انداز گفتگو کے بعد تو آپ سے کچھ کہنا بھی بے سود

ہے۔“

عفت خاموش رہی۔ وہ بھی چپ رہے۔

پھر تقریب کے اختتام تک دونوں میں محض چند رسمی سی باتیں ہوئیں۔

” بس ایک روز آفس میں ٹاک دیکھتے ہوئے شہاب احمد کا خط اس کی نظر سے
گرا جس کا دل بڑی زور سے دھڑک اٹھا۔ انہوں نے بغیر کسی التاب و آداب
کے لکھا تھا۔“

” ماننا ہوں آپ میری اس جرات پر ضرور مبہم ہو جائیں گی۔ لیکن میں آپ
پر یہ پوچھنا ہوں کہ آپ سے کچھ کہنے کے لئے میں کون سی راہ اختیار کروں؟
اپنے تو ہر دروازے بند کر دیا ہے جس سے ہو کر میں آپ تک پہنچ سکوں
۔۔۔ ٹیلیفون پر بات کرنے کی اجازت آپ نہیں دیتیں ہیں کہیں کسی جگہ آپ
بل نہیں سکتا پھر آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟“

” آپ پوچھیں گی کہ میں آپ سے ملنا یا بات کرنا کیوں چاہتا ہوں؟ اگر آپ اب
مجھے یہ بات نہیں سمجھ سکی ہیں تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ
جس میں یا پھر جانتے بوجھتے ہوئے انجان بن رہی ہیں، کیا میں سچ بچ اتنا بڑا
لاہوں؟ یہ جو صبح سے شام تک بے شمار لمحات چپکے سے گزر جاتے ہیں۔
آپ کے ان لمحوں میں سے کوئی لمحہ بھی میرے لئے وقف نہیں؟“

” کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں نے آپ کے لئے اپنے آپ کو اس حد
تک ڈرا دیا ہے؟ یقین کیجئے مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ یہ میں ہوں؟ شہاب احمد؟
وقت نے کچھ اس انداز سے کروٹ لی ہے کہ میری سوچوں کا انداز تک
بل گیا ہے۔“

” بہر حال نے سے پہلے میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اگر
برے بارے میں کچھ سوچنا پسند کریں تو میں بھی کچھ کہنے کی ہمت

گرا تے۔“

کہہ دے۔

”فقت نے رسٹ واپس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
”بھی تو صرف پانچ ہی بجے ہیں، میرا خیال ہے میں سعدیہ باجی سے
اول۔“

”اب اس وقت کہاں جاؤ گی، تھکی جوتی کر رہی ہو۔“
”دن خاص تھکن تو نہیں محسوس ہو رہی ہے۔“
”مل چلی جانا۔“

”اگر کل پہل گیا تو پھر معلوم نہیں کب تک نہ جاسکوں،“
”بھائی میاں خاموش ہو گئے۔ عفت الماری کھول کر کپڑوں کا جباز تازہ
کی۔“

”سعدیہ باجی خلاف توقع اس وقت اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ شاید نہیں
نہیں تھی کہ ان کے شکوے شکایت کے جواب میں وہ اسی روز ان سے
پلی آئے گی۔ وہ رکتے سے اتر کر جب ان کے چھوٹے سے لان میں داخل ہوئی
تے ہی بادام کے درخت کے نیچے اشفاق بھائی اور سعدیہ باجی بیٹھے
تے۔“

”اشفاق بھائی نے اسے دیکھ کر نعرہ لگایا۔
”اتنا آج تو عید کا چاند نکل آیا۔“
”عفت شرمندہ سی ہو گئی۔“

”اشفاق بھائی کا نعرہ سن کر سعدیہ باجی نے بھی پلٹ کر پیچھے دیکھا عفت

یہ میری درخواست ہے کہ آپ کے دل و دماغ کے کسی گوشے میں اگر برا
مہم سا بھی خیال ہے تو میرے بارے میں.....
شہاب احمد۔

”عفت نے خط پھاڑ کر روتی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور اپنا گزشتہ روز
کا لکھا ہوا آرٹیکل دوبارہ پڑھنے لگی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ پوری کیسول
کے ساتھ آرٹیکل پر نظر ثانی کر سکے۔ مگر آرٹیکل کے الفاظ اور شہاب احمد کے خط
کے الفاظ آپس میں گڑبڑ ہوئے جا رہے تھے اس نے جھنجھلا کر فائل بند کر دی
اور کرسی کی پشت سے سرٹکا کر بیٹھ گئی۔“

”مفس میں سارا دن وہ ڈھنگ سے کوئی بھی کام نہ کر سکی۔ اسے شہاب احمد
پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا۔“

اس نے سوچا۔

”آخر انہیں کیا حق پہنچتا ہے۔ دوسروں کو ڈسٹرب کرنے کا؟
شام کو وہ گھر پہنچی تو بھائی میاں نے کہا۔“

”تم سعدیہ کے پاس کب سے نہیں گئیں؟“
”کافی دن ہو گئے ہیں، وقت ہی نہیں ملا۔“

”بہت سخت ناراض ہے تم سے۔“ بھائی میاں مسکراتے۔
”آج سعدیہ باجی آتی تھیں؟“

”نہیں، میں صدر گیا تھا وہیں اشفاق میاں مل گئے، نہ بدوستی اپنے ساتھ

پرنس گاہ پڑتے ہی ان کے چہرے پر بے پناہ حیرت سمٹ آئی۔
وہ کمرے سے کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

”ارے عفو! تم!“

عفت نے قریب آکر کہا۔

”دیکھ لیجئے، آج ہی اپنے یاد کیا اور آج ہی میں آپ کے پاس چل

آئی۔“

سعید باجی نے بڑی محنت سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”خیر! یاد تو ہم تمہیں روزانہ کرتے تھے۔“

”چھوڑیئے! منہ دیکھے کی باتیں کر رہی ہیں“

”پوچھ لو اشتقاق سے، پس ناشفاق!“

اشفاق بھائی نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں بھئی! روزانہ ہی تمہارا ذکر خیر ہوتا تھا۔“

”آپ تو سعید باجی کی ہاں میں ہاں ملائیں گے ہی،“

”آئندہ باجی کے ہونٹوں پر چھپنی چھپنی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔“

اس وقت سعید باجی کی ساس باہر نکل آئیں۔

برآمدے کی میز چھبوں کے پاس سے ہی انہوں نے پوچھا۔

”دلہن اکون آیا ہے؟“

”عفت آئی ہے امی جان“

”اچھا! عفت آئی ہے“

وہ قریب آئیں تو عفت نے انہیں سلام کیا۔

اسے دعا دے کر وہ بولیں۔

عفت تو اس گھر کا رستہ بھول گئی ہے۔

اشفاق بھائی نے کہا۔

دیکھ لو، سب کو تم سے شکایت ہے۔“

عفت اپنی مصروفیت کا روزنامہ دے دینے لگی۔

اشفاق بھائی اس کی ساری کتابتیں کمرے بولے

بھئی! ہم یہ سب کچھ نہیں جانتے۔“

سعید باجی کی ساس نے کہا۔

”تم سے سب لوگوں کو جو شکایتیں ہیں وہ اسی صورت میں دور ہو سکتی

ہیں! بے غم آؤ، دس دن یہاں رہو۔“

عفت ایک دم گھبرا کر بولی۔

”ارے نہیں امی جان! یہ تو بالکل نہیں ہو سکتا۔“

”یوں نہیں ہو سکتا۔“

”مجھے کسی کے گھر رہنے کی عادت ہی نہیں ہے۔“

”یہ کسی کے گھر کی بات نہیں کر رہی ہوں، اپنے گھر کی بات کر رہی

ہے۔“

”یہ تو آج تک بڑی آپا کے گھر بھی نہیں رہی۔“

”یہ تمہاری بڑی آپا جانیں اور تم جانو لیکن میں آج تمہیں نہیں جانے

دوں گی۔“

عفت نے پریشان ہو کر سعدیہ باجی کی طرف دیکھا۔

”سعدیہ باجی آپ ہی سفارش کریں۔“

سعدیہ باجی مسکرا کر بولیں۔

”میں کیا بولوں؟ تمہارا اور امی جان کا معاملہ ہے۔“

اشفاق بھائی رست و پرجہ پر نظر ڈالتے ہوئے بولے۔

”اچھا بھئی! ایسا ہے کہ فی الحال تو میں کام سے جا رہا ہوں، میری والدہ

یہ معاملہ طے ہو گا۔“

عفت نے کہا۔

”آپ کے یہاں کوئی مہمان آئے تو آپ گھر چھوڑ کر بھاگنے کی سوچتے

ہیں۔“

”میرے جانے سے آپ کی میزبانی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میری

بیگم صاحبہ اور میری والدہ صاحبہ موجود ہیں۔“

اشفاق بھائی کی اتنی لے پوچھا۔

”والہیں کب تک آؤ گے اشفاق؟“

”ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں واپس آ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ٹھیک بتاؤ، ورنہ ہو کہ تمہارے انتظار میں ہم لوگ بھی بھوکے

بیٹھے رہیں۔“

”کھانا کھانے میں ابھی گھنٹوں باقی ہیں، میں سجاوٹ کا جب تک۔“

عفت نے کہا۔

”زیادہ دیر نہ لگیے گا اشفاق بھائی مجھے گھر چھوڑنے بھی جانا ہے۔“

”کوہ۔“

”تم چپ چاپ بیٹھی رہو، تمہارا معاملہ میری والدہ سے طے ہو گا۔“

اشفاق بھائی کارپورچ کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

اشفاق بھائی کی اتنی کچھ دیر ان دونوں کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔

اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ عفت کو بھی وضو کرنا

وہ سعدیہ باجی کے ساتھ ان کے کمرے میں آ گئی۔

مغرب کی نماز کے بعد وہ دونوں باتیں کرنے بیٹھیں تو سعدیہ باجی کو

ادم شہاب احمد کا خیال آ گیا۔

”ارے عفت! ان کا نوکچہ حال بتاؤ۔“

”کس کا؟“

”وہی تمہارے شہاب احمد۔“

عفت کچھ برا مان کر بولی۔

”میرے کیوں ہونے لگے؟“

”وہ تو اپنے آپ کو تمہارا سبھنے پر تکیے بیٹھے ہیں، تم ہو کر انہیں گھاس

انہیں ڈالیں۔“

عفت مسکرا کر بولی۔

”آپ ویسے ہی قیاس آرائیاں کرتی رہتی ہیں۔“

”قیاس آرائیوں کی کیا بات ہے؟“

”اور کیا“

”جو کچھ آنکھ سے دیکھا ہے وہی کہہ رہی ہوں۔“

”کیا دیکھ لیا آپ نے؟“

”ان کی آنکھوں میں تمہارے لئے محبت کا ٹھٹھا اٹھیں تاکہ سمندر کی

لیا۔“

”مجھے کیوں نہیں نظر آیا وہ سمندر؟“

”نظر تو تمہیں بھی آتا ہے۔“

”اچھا“

”اب تم مان کر بھی نہ دو وہ دوسری بات ہے“

”چھوڑیے سعدیہ باجی! یہ سارے مرد فلٹ کرتے ہیں۔“

سعدیہ باجی نے کہا۔

”نہیں بھی! سارے مردوں کو تو نہ کہو، اشفاق تو ایسے نہیں ہیں“

”اچھا چلیے! آپ اپنے اشفاق صاحب کو الگ کر لیجیے“

سعدیہ باجی بولیں۔

”اچھا سنجیدگی سے بتاؤ پھر کبھی ملاقات ہوتی ان سے؟“

”ہاں! ہوتی تھی“

”کیا کہہ رہے تھے؟“

عفت چند سیکنڈ تک کچھ سوچتی رہی پھر الف سے ہی تک انہیں

سنائیے۔“

کچھ یاد آیا۔

سعدیہ باجی نے کہا۔

”وہ خط تو دکھا دیجئے“

”وہ تو میں نے پھاڑ دیا،“

عجیب باگل ہو کیوں پھاڑ دیا؟“

خط دیکھ کر آپ کیا کرتیں؟ خط میں لکھی ہوئی داستان تو میں نے آپ کو

”جی۔“

سعدیہ باجی نے پوچھا۔

”پھر آخر تم نے فیصلہ کیا کیا؟“

”مجھے کیا فیصلہ کرنا ہے؟“

”ان کی واپسی پر کوئی نہ کوئی جواب تو انہیں دینا ہی ہوگا۔“

”یہ جواب انکار میں ہی ہوگا۔“

”بغیر سوچے سمجھے فیصلہ کرنے کو کس نے کہا ہے تم نے؟“

”لیکن میں نے تو سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے“

”میرا سر حاقیت پر مبنی ہے تمہارا فیصلہ“

عفت ہنس پڑی۔

سعدیہ باجی بے حد سنجیدہ ہو کر بولیں۔

”ہنسنے کی بات نہیں ہے، سنجیدگی سے میری بات سنو،“

”پھر کیا کروں؟“

”تم تہائی میں ٹھنڈے دل و دماغ سے شہاب احمد کے بارے میں

پڑھا

”آخر آپ مجھے کیوں پھنسونانا چاہتی ہیں؟“

”اس میں پھنسنوانے کی کون سی بات ہے؟“

”فی الحال میرا شادی کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”پہلے آپ چھوٹی آپا کی شادی تو کر دیتے“

”چھوٹی آپا کی شادی بھی ہو جائے گی، ہر ایک کا وقت مقرر ہوتا ہے۔“

”ان کی شادی سے پہلے تو میں اپنے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔“

”بھئی سوچنے میں کیا حرج ہے؟ بے شک شادی ابھی مت کرو۔“

”خیر شہاب احمد کے بارے میں تو میں قطعی نہیں سوچ سکتی۔“

”پھر وہی بات! بلاوجہ ایک اچھے بھلے آدمی کو ٹھکرا کر انا کساں کی

غلطی ہے؟“

”اب ختم بھی کیجئے اس قصے کو، آپ کے اعصاب پر تو آج کل شادی

ب بھوت بن کر سوار ہو گئی ہے۔“

”لیکارو! عفو! اماں اور بیھائی میاں کا خیال آتا ہے۔“

”کیوں؟ ان دونوں کو کیا ہوا؟“

”دیکھو نا! ان بے چاروں کے اوپر ابھی تین لڑکیوں کی ذمہ داری ہے،

”دیکھو عفو! تمہاری شادی کہیں نہ کہیں تو ہونی ہی ہے“

”ہاں! وہ تو ظاہر ہے“

”تو پھر جب ایک اچھا بھلا رشتہ سامنے ہے تو اس پر غور کرنے

میں کیا حرج ہے؟“

”آپ کو کیسے معلوم کر اچھا بھلا رشتہ ہے۔“

”بظاہر تو اچھا بھلا ہی معلوم ہوتا ہے، باقی معلومات کمر لی جائیں گی“

”آپ کو معلوم ہے یہ صاحب بہادر کس قدر دولت مند ہیں“

”دولت مند میں تو کیا ہوا؟“

”نہ بابا! شادی اپنی حیثیت کے لوگوں میں ہی کرنی چاہیے۔“

”تمہاری سیملی مہرین کی شادی بھی تو دولت مندوں میں ہی ہونی ہے“

”ہاں! ہوتی تو ہے۔“

”ماشاء اللہ مرے میں ہے، کیا براتی ہے مہر و زعفران؟“

”اب مہرین کو اتفاق سے ایک شریف آدمی مل گیا تو ضروری تھوڑی ہے

کہ سارے دولت مند آدمی شریف ہی ہوں گے“

”لیکن یہ بھی تو ضروری نہیں کہ سارے امیر و کبیر بد معاش ہی ہوتے

ہوں گے۔“

”حقیقت کو منہسی آگئی۔“

”سعدیہ باجی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔“

”منہسنے کی بات نہیں ہے عفت“

وہ تو اتفاق سے میری دوست منہلا رکشتے ہیں ادھر سے گزری، وہی بیجاری
بچہ بوڑھی ہوئی گئی ہے۔“

اچھا ابیر خیال ہے تمہیں منہ ہاتھ دھو کر ایک کپ چائے پینی چاہیے تاکہ
کچھ میں جان آئے۔“

میرا ارادہ تو نہانے کا ہے لیکن پھر تم بوری ہو جاؤ گی۔“
نہیں، میں بالکل پور نہیں ہوں گی تم نہاؤ، اچھا ہے، ذرا فریش ہو
جائی۔“

عفت اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

وہ نہا کر آئی تو مہربن اس کے کمرے میں ہی کھڑکی کے پاس کھڑی
تھی۔

عفت نے گیلے بالوں میں تولیہ لپیٹے ہوئے پوچھا۔

تم نے چائے پی لی؟“

صرف چائے پی لی بلکہ اس کے ساتھ اور بھی بہت کچھ کھا لیا،

یعنی؟ کیا کچھ؟“

نرا گرم پکڑے، قیمے کے سمو سے، بے حد لذیذ چٹنی، گلاب جامن اور

پارے۔“

میرے لئے بھی کچھ چھوڑا یا تم ہی لوگ سب کچھ صاف کر گئے؟“

ہیٹ کیوں پریٹ رہی ہو؟ تمہارے لئے بھی رکھا ہے۔“

ایلا انتظار بھی نہیں کیا تم نے؟“

عفت مسکرا کر بولی۔

”آپ اس قدر بوڑھی دادی کیوں بن گئی ہیں؟“

”آجکل اچھے رشتے ملتے بھی تو نہیں ہیں۔“

”افوہ! سعدیہ باجی! خدا کے لئے اب اس موضوع کو ختم بھی کیجئے۔“

سعدیہ باجی اس وقت تو خاموش ہو گئیں لیکن جب عفت اشفاق جانائی
کے ساتھ گھر واپس جا رہی تھی تو سعدیہ باجی نے موقع پا کر اس کے کان میں
سرگوشی کی۔

”شہاب احمد کے بارے میں ضرور سوچنا۔“

عفت نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

سعدیہ باجی اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پھر ممتنائیں۔

”میں تین چار دن میں آؤں گی، جواب سوچ کر رکھنا۔“

عفت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دوسرے روز عفت آفس سے گھر پہنچی تو گیٹ کے باہر مہربن کی گلاڑی

کھڑی نظر آئی۔ ڈرائنگ روم میں مہربن اس کی منتظر تھی۔ چھوٹی آبا، اماں اور فرنی

اس کے پاس بیٹھی تھیں، عفت اندر داخل ہوئی تو مہربن نے کہا۔

”کیا بات ہے؟ آج تم اس قدر لیٹ کیوں ہو گئیں؟“

”سواری ملنے میں دیر ہو گئی، نہ کسی بس میں جگہ ملتی تھی نہ کوئی رکشتہ ہی

خالی نظر آیا۔“

”پھر؟ کیسے آئیں؟“

”بے چاری اماں“

”فوزی دوسری رٹے میں پکھڑے، سمو سے، چٹنی اور نمک پارے بھی
آئی۔“

فوزی چلی گئی تو مہربین نے عفت کے لئے چائے بناتے ہوئے کہا۔
”ہاں! تو ہم کیا باتیں کر رہے تھے؟“
عفت نے ٹالتے ہوئے کہا۔

”یاد نہیں۔“

مہربین نے خشمگین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
عفت نے کہا۔

”تم اپنے لئے بھی چائے بناؤ،“

”میں پی جی ہوں چائے۔“

”تو کیا ہوا؟ ایک کپ اور سہی“

”نہیں“

”اماں نے دو کپ اسی لئے بھیجے ہیں کہ تم ایک کپ چائے اور پی لور،“

”اب دل نہیں چاہ رہا،“

”میرے کہنے سے ہی پی لور،“

”عفت نے پیالی سیدھی کر کے اس کے لئے بھی چائے بنا دی“

چائے پیئے ہوئے مہربین نے پھر شہاب احمد کا ذکر چھیڑ دیا۔

وہ ان کی حمایت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔

”تمہارا انتظار کرتی تو پکھڑے بھی ٹھنڈے ہو جاتے اور سمو سے بھی۔“

”اور اب مجھے جو یہ دونوں چیزیں ٹھنڈی ملیں گی“

”تمہاری سزا ہے، اتنی دیر سے کیوں آئیں؟“

عفت مسکرا کر بولی۔

”غریب آدمی ہیں، سوار یوں کے پیچھے دھکتے کھاتے پھرتے ہیں، تب لکھ

جا کر گھر پہنچتے ہیں۔“

”ایک بے چارہ شریف آدمی تمہیں ایسا نہانا تو چاہتا ہے کہ تم اسے گاس بنا

نہیں ڈالتیں۔“

عفت انجان بن کر بولی۔

”کس شریف آدمی کا ذکر ہو رہا ہے؟“

”شہاب احمد کو کہہ رہی ہوں۔“

اس وقت فوزی عفت کے لئے چائے لے کر آگئی۔ عفت نے

پوچھا۔

”کیوں فوزی؟ ہمیں صرف چائے لے گئی؟“

فوزیہ نے مسکرا کر کہا۔

”صبر کیجئے، ابھی وہ سب کچھ بھی لے گا جس کا آپ کو انتظار ہے“

”لیکن دونوں چیزیں گرم ہونی چاہئیں۔“

”گرم ہی ہیں، اماں نے ابھی ابھی ملی ہیں۔“

عفت نے شرمندہ ہو کر کہا۔

عفت سے خطا کا مضمون سن کر مہرین نے کہا۔

اب بھلا بتاؤ، اس سے زیادہ شہر لیفانہ انداز کوئی کیا اختیار کر لے گا؟

مجھے تو سرے سے یہ ٹھنڈا چکر ہی ناپسند ہے۔

پہلے تو تم مجھے یہ بتا دو کہ تمہیں کوئی بات، کوئی چیز پسند بھی ہے۔ یا

.....؟

ہاں! کیوں نہیں؟

مہرین نے قدرے غصے سے پوچھا۔

”تم آخر چاہتی کیا ہو؟“

”میں تو کچھ بھی نہیں چاہتی“

میرا مطلب ہے آخر کس قسم کے آدمی سے شادی کرنا چاہتی ہو؟

دیکھو مہرین! سیدھا معاملہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتا

نہ وہ میرے بجائے میرے ماں باپ سے بات کرے۔

”پہلے تمہاری مرضی معلوم ہو تو ہمارے ماں باپ سے بھی بات کی

نہ۔“

”ماں باپ سے بات کرنے کے بعد میری مرضی تو اپنے آپ ہی معلوم ہو

نہ گی۔“

”بہر حال! میں یہی کہوں گی کہ تمہیں شہاب احمد کو نہیں ٹھکرا نا چاہیے۔“

”اصل میں بات یہ ہے مہرین کہ شہاب احمد یوں بھی میرے لئے قابل قبول

ہیں۔“

عفت بڑے اطمینان سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

مہرین چڑ کر بولی۔

”تم تو کچھ بولتی ہی نہیں ہو۔“

”ابھی بولتی ہوں۔ نہ اچاتے ختم کر لوں۔“

”چائے کہیں بھائی تھوڑی جا رہی ہے“

”بھائے گی تو نہیں لیکن ٹھنڈی ہو جائے گی“

”ابھی بات ہے، میں اتنی دیر تک صبر کر لیتی ہوں۔“

عفت نے اپنی چائے ختم کر کے بڑے اطمینان سے کہا۔

”کل شہاب احمد کا ایک خط آیا تھا۔“

”اچھا! کہاں ہے؟ لاؤ دکھاؤ۔“ مہرین کھلی پڑ رہی تھی۔

عفت نے مطمئن انداز سے کہا۔

”میں نے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا تھا، آج صبح جمعہ صفا کرنے

آیا تھا۔ معلوم نہیں اس نے اسے کہاں پہنچا یا ہوگا،“

مہرین ہاتھ پر بل ڈال کر بولی۔

”تم انتہائی بے وقوف لڑکی ہو۔“

”میرا تو خیال ہے میں نے کوئی بے وقوفی نہیں کی۔“

”کم از کم مجھے تو دکھا دیتیں خط“

”خط کا مضمون تم مجھ سے سن لو،“

”بتاؤ کیا لکھا تھا؟“

”کیوں؟ کیا برائی دیکھی تم نے ان میں؟“

”بس یوں سمجھ لو کہ جن باتوں کی وجہ سے ایک زمانے میں تم مہروز اختر سے خوفزدہ تھیں، انہی باتوں کی وجہ سے میں بھی شہاب احمد سے خوف ہوں۔“

”لیکن تم دیکھ لو، مہروز کتنے اچھے انسان ہیں۔“

”ہاں! لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ ہر شخص مہروز اختر ہی ثابت ہوگا۔“

”آزمائنے میں کیا حرج ہے؟“

”آزمانے والی بات تو سراسر غلط ہے۔“

”اس میں کیا حرج ہے؟“

”مہینے بھرتی! میں آزمائش ہی آزمائش میں اپنے جی کو کوئی روگ لگانا نہیں

چاہتی۔“

”مہرین نے جل کر کہا۔“

”گویا کوئی بھی عقل کی بات تمہاری سمجھ میں بالکل نہیں آسکتی۔“

عفت کو ہنسی آگئی۔

”مہرین نے کہا۔“

”ہنسنے سے کام نہیں چلے گا۔“

”پھر کیا کروں؟“

”بس! تم یہ سمجھ لو کہ اگر شہاب احمد کو میں نے ہر لحاظ سے تمہارے لئے

موزوں پایا تو تمہاری جان نہیں بخشوں گی۔“

عفت نے بیزار ہو کر کہا۔

”چھوڑو، کوئی اور بات کرو، آج کل تم لوگوں کے پاس کوئی اور موضوع ہی رہا۔“

”لوگ کون؟“

”سعدیہ باجی کے پاس جاؤ تو وہ بھی شہاب احمد کی حمایت میں طویل لکچر دینا شروع کر دیتی ہیں۔“

”ظاہر ہے ہر عقلمند آدمی تمہیں ہی مشورہ دے گا کہ شہاب احمد کے بارے میں جی سے، ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کرو۔“

عفت نے مہرین کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”اچھا بھئی! اس وقت تو مجھے کچھ بخش دو اور کوئی دوسری بات کرو۔“

”پہلے تم وعدہ کرو۔“

”کس بات کا؟“

”تم میرے اور سعدیہ باجی کے مشورے پر عمل کرو گی۔“

”اگر مجھے فرصت ہوئی اور میرا دل شہاب احمد کے بارے میں سوچنے پر آمادہ

رہا۔۔۔۔۔“

”اب تم اتنی بھی مصروف نہیں ہو کہ اس قدر اہم معاملے کے بارے میں سوچنے

کے لئے بھی وقت نہ نکال سکو۔“

عفت اطمینان سے پیٹھی مسکراتی رہی۔

مہرین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اب میں چلوں گی، بہت دیر ہو گئی۔“
 ”کھانا کھا کر جانا۔“

”کھانے تک رکی تو بہت زیادہ دیر ہو جائے گی۔“
 ”تو کیا ہوا؟“

”مہروز بھی اب گھر پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“
 ”آج انہوں نے تمہارے بغیر کہاں کا پر وگرام بنا لیا؟“
 ”کوئی تفریحی پروگرام نہیں تھا ان کا۔“

”کوئی کاروباری چکڑہو گا؟“
 ”ہاں“ مہرین نے میز پر سے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے کہا۔
 ”عفت بھی اس کے ساتھ ساتھ گیٹ تک چلی آئی۔“

سعیدہ باجی تین چار روز بعد آئیں۔ موقع ملتے ہی انہوں نے شہاب احمد
 بے بارے میں عفت سے پوچھا۔ لیکن عفت انہیں کیا جواب دیتی، وہ کوئی
 میلہ ہی نہیں کر سکی تھی۔ سعیدہ باجی نے خاصی ناراضگی کا اظہار کیا اور اماں کو
 بکچہ بتا دینے کی دھمکی دی۔

عفت نے سہم کر ان کی طرف دیکھا اور بڑی دیر تک ان کی منت سماجت
 نہ رہی کہ وہ اماں سے کچھ نہ کہیں ورنہ اماں کیا سوچیں گی۔ وہ تو یہی سوچیں گی۔
 ہم اس پر اتنا اعتماد کرتے ہیں اور یہ معلوم نہیں کیا کیا چکڑہلاتی رہتی ہے۔
 پھر سعیدہ باجی بڑی مشکل سے اس کی بات ماننے پر آمادہ ہوئیں۔

دوسری طرف مہرین نے ٹیلیفون کر کے اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔
 روزانہ یہی سوال ہوتا تھا کہ شہاب احمد کے بارے میں تم نے کیا سوچا؟ سعیدہ
 باجی اور مہرین نے اس بری طرح اس کا پیچھا پکڑا تھا کہ شہاب احمد اس کے احصاب

اچھا ہے، تھوڑی دیر آرام کر لو۔“

عفت اماں کی بات کا مطلب سمجھ کر مسکرائی اور بولی —

”پھر کیا ہوگا؟“

”سات بجے کے بعد جانا ہے، اس وقت تک تمہاری تکلیفیں بھی دور ہو جائے

“

”لیکن میں پھر بھی نہیں جاؤں گی“

چھوٹی آپا نے کہا۔

”جلی چلنا، ذرا تفریح رہے گی“

”مجھے تو گھبراہٹ ہوتی ہے ایسی تقریبوں میں۔“

فوزی نے کہا۔

”اچھا! فی الحال تو آپ آرام کیجئے، سات بجے اٹھ کر ہی فیصلہ کرے گا۔“

چھوٹی آپا نے کہا۔

”فوزی! تم عفت کے کپڑوں پر بھی استری کر دینا“

”بھیک ہے، میں استری کر دوں گی“

عفت لیٹتی تو تھی کمر ٹکانے کے ارادے سے، لیکن پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

ان فوزی اور چھوٹی آپا نے دو تین دفعہ اسے اٹھانے کی کوشش کی، مگر وہ ہر

نہروٹ بدل کر سو گئی۔ پھر کسی نے اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ سب

لے گئے تو وہ دروازے کی کنڈی لگا کر پھر بستر پر لیٹ گئی۔ لیکن اب نیند اس کی

لہوں سے رخصت ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر بستر پر پڑی اینٹتی رہی۔ پھر منہ دھو کر ٹی وی

پر مسلط ہو کر رہ گئے۔ وقت بے وقت اسے شہاب احمد کا خیال آتا تھا۔

محض سی چند ملاقاتیں یاد آجاتی تھیں۔

ان کے مخصوص جملے، ان کی دھیمی دھیمی مسکراہٹیں۔

عفت سوچتی تھی۔

ان سب کا خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔

کئی دن گزر گئے۔ اپنی الجھی الجھی سی سوچوں کا بوجھ دماغ پر لے، کھوئی

کھوتی سی وہ اپنے کاموں میں مصروف رہی۔

لیکن —

ایک سائیر سا نٹھا جو ہر وقت اس کا تعاقب کرتا رہتا تھا۔

ایک خیال تھا —

جو کسی لمحے بھی بچھا نہیں چھوڑتا تھا۔

شہاب احمد کے خدو خال تصویر کے واضح نقوش کی مانند لگا ہوں کے

سامنے اپنی چھب دکھلاتے رہتے تھے۔

عزیزوں میں کسی کے یہاں شادی کی تقریب تھی۔ سب اس سے بھی

جانے کے لئے اصرار کر رہے تھے۔ اس روز ہاسپٹل میں چھوٹی آپا کی نائٹ

ڈیوٹی نہیں تھی۔ وہ بھی جا رہی تھیں۔ لیکن عفت کا ذرا بھی موڈ نہیں تھا۔

آفس سے واپس آتے ہوئے وہ بہت تھک گئی تھی۔ چائے پینے کے بعد وہ چار

تھان کر لیٹ گئی۔

اماں نے کہا —

عفت نے اپنا دھنا ہاتھ سر کے نیچے رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔
 بند آنکھوں تلے پہلے ایک دھندلی سی تصویر نظر آئی۔
 پھر آہستہ آہستہ تصویر کے نقوش واضح اور اجاگر ہوتے گئے۔
 یہ تو شہاب احمد تھے۔
 شہاب احمد!
 عفت چونک گئی۔

افوہ!

یہ شخص کس بری طرح میرے اعصاب پر مسلط ہو گیا ہے۔
 کس قدر ڈسٹرب کر رکھا ہے اس شخص نے میرے ذہن و دماغ کو۔
 میں چاہوں یا نہ چاہوں لیکن —
 دن میں جانے کتنی بار اس کا خیال بنا کسی آہٹ کے آجاتا ہے۔
 ایک سایہ سا اگر گزر جاتا ہے۔

اس نے سوچا —

ایسا کیوں ہے؟

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔

کیا اس طرح بھی لوگ دوسروں پر اثر انداز ہو جایا کرتے ہیں؟

اس کے دل نے مرین اور سعید باجی کو قصور وار ٹھہرانے کی کوشش کی۔

اس نے سوچا —

دیکھئے بیٹھ گئی کوئی خاص پروگرام نہیں آ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنے ذہن کو مصروف رکھنے کی خاطر وہ ٹی وی دیکھتی رہی۔ جھوک محسوس ہوتی تو وہ ٹی وی بند کر کے باورچی خانے میں آگئی۔ اپنی اکیلی جان کے لئے میز پر کھانا سماٹنا اسے ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ سالن گرم کر کے اس نے پلیٹ میں نکالا اور روٹی کی چنگیر سامنے رکھ کر وہ باورچی خانے میں ہی بیٹھ رہی۔

کھانا کھا کر اس نے سوچا —

اب کیا کروں؟ اس وقت نہ کچھ پڑھنے کا موڈ تھا نہ ٹی وی دیکھنے کا وہ انگن میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چپکے کاٹتی رہی۔ پھر چار پانی پیچ آنگن میں گھسیٹ کر لیٹ گئی۔ اوائل تاریخوں کا باریک دھم سا چاند نیم کی شاخ کے نیچے تھجا کر رہا تھا۔ سفید سفید بادلوں کے پھوٹے پھوٹے ٹکڑے آسمان پر تیرتے پھر رہے تھے۔ برآمدے کے ستون سے لپٹی ہوئی چنبیلی کی بیل میں ڈھیریوں سفید پھول لٹا رہے تھے، بڑی آپا کے ہاتھوں لگاتے ہوئے رات کی رانی کے پودے میں نرم نازک پھول مسکرا رہے تھے، رات کی رانی اور چنبیلی کے پھولوں کی محک ہوا کے نازک شانوں کا سہارا لئے آنگن میں ادھر سے ادھر جھکتی پھر رہی تھی، ہوا کا ایک جھونکا آتا اور رات کی رانی کے ڈھیر سارے پھول آنگن کے فرش پر بنا کسی آہٹ کے گر جاتے اور دوسرا جھونکا ان پھولوں کو اڑا کر آنگن کے دوسرے سرے پر پہنچا کرتا۔ عفت کی نگاہیں نیم کی شاخوں سے الجھتی ہوتی آسمان کی وسعتوں پر بھٹکتی لگیں۔

ستاروں کی دھند پر بڑی خاموشی تھی۔

اور بے حد ستانا۔

”اسی لئے کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو زیادہ تعلیم نہیں دلانی چاہیے، اب ساری عمر لکھنے کا رشتہ ڈھونڈتی رہنا، کوئی آئیں تو یہ شوشہ چھوڑ کر چل دیتیں۔“
 ”بڑھا۔ پے میں شادی کرو گی لڑکی کی؟“

اماں بے چاری پریشان تھیں۔
 آخر چھوٹی آپا کو کس کے پلے باندھ دیں؟ کسی راہ چلنے کو لڑکھڑکھ کر اس کے ساتھ تو چھوٹی آپا کا بیاہ کرنے سے رہیں اور نہ ہی وہ اپنے ساتھ چھوٹی آپا کا نکاح حواسکتی تھیں۔

جہاں کوئی تقریب ہوتی اور چار عورتیں جمع ہوتیں۔ بے چاری اماں کو ہر طرف متنبہایا کرتا۔ دوسروں کے اوپر رکھ کر بات کچھ انداز سے کی جاتی کہ اماں منہ بتی رہ جاتیں۔
 کوئی دل جلی کہتیں۔

”توبہ ہے، کیسے کیسے ماں باپ ہیں، بیٹیوں کی کماٹی کھانے کے پتھر میں ان صوموں کا بیاہ ہی نہیں کرتے۔“

کسی کو یزعم ہوتا کہ
 ”بھئی ہم نے تو اپنی بیٹیوں کو زیادہ نہیں پڑھایا، لمبی چوڑی ڈگریاں دلوں کے سے ملازمت تھوڑی کروانی ہے۔“

اماں کا دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ کبھی بڑی آپا کے شوہر سیف بھائی کے تئیں کبھی اشفاق بھائی سے کہتیں اور فرخ بھائی کے اوپر تو اماں

یہ وہی دونوں تو ہیں۔

جنہوں نے شہاب احمد کا ذکر کر کے انہیں میرے داغ پر مسلط کر دیا۔

لیکن داغ مسلسل بہتی نگہ کر رہا تھا کہ

نہیں! یہ جھوٹ ہے۔

حقیقت سے چشم پوشی ہے۔

جو کچھ بھی ہوا۔

یا جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔

اس سے تم اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتیں۔

وہ سر جھٹک کر اٹھ بیٹھی۔

اور اوپر۔ بہت بلندیوں پر اڑتے ہوئے بادلوں پہ نگاہیں جا کر کوئی

بھولا بلسر اگیت لگنا لگی۔

روز و شب چپ چاپ گزرے جا رہے تھے، زندگی ایک ہی انداز سے گزر رہی تھی۔ اماں کو ان دنوں چھوٹی آپا کے بیاہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ان کے لئے کوئی مناسب رشتہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ دوسری طرف رشتے دار تھے کہ انہوں نے مارے طعنوں کے اماں کا کلیجہ پھلنی کرنے کی اسکیم پر عمل کر رکھا تھا۔ اماں کھلم کھلا تو یہی کہا جاتا تھا۔

”اے ہے، آخر کب تک بٹھاتے رکھو گی لڑکی کو؟“

”ارے اب تو اتنی عمر ہو گئی ہے، آخر کب تک شادی کرو گی اس کی؟“

کوئی خاتون چھوٹی آپا کے ڈاکٹر بن جانے پر جسد کا اظہار اس طرح کرتی تھیں۔

بغت کبھی کبھی بڑی سنجیدگی سے شہاب احمد کے بارے میں سوچنے لگتی۔
 اُن بے چاری کس قدر پریشان ہیں چھوٹی آپا کے لئے اچھے رشتے ملنا آج کل
 مردِ دشوار ہے۔ چھوٹی آپا کے بعد اُن کو میری فکر مسئلے کی اور کچھ تعجب نہیں،
 چھوٹی آپا کے ساتھ ساتھ میرے بیاہ کی فکر بھی پریشان کرتی ہو، فوزی بھی کھیرے
 کی طرح بڑھ رہی ہے۔

اسے سعدیہ باجی کی باتیں یاد آجاتیں۔
 تمہاری شادی کہیں نہ کہیں تو ہونی ہے، حبیب ایک رشتہ سلنٹے ہے۔
 باغِ غور کرنے میں کیا حرج ہے؟

”ایک اچھے بھلے آدمی کو ٹھکرا کر انا کہاں کی عقل مند ہی ہے؟“
 ”کیا کروں عفو! مجھے تو اُن اور بھائی میاں کا خیال آتا ہے۔“
 ”ان بے چاروں کے اوپر ابھی تین لڑکیوں کی ذمہ داری ہے۔“

وہ سعدیہ باجی کی باتوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی تو حیرن کی نصیحتیں
 سوچنے پر غصہ کر کے دیتیں۔

”نہیں شہاب احمد کو ٹھکرا کر انا نہیں چاہتی۔“
 وہ الجھ کر رہ جاتی۔

آفس میں کام کرتے ہوئے شہاب احمد کے خط کے الفاظ اسے ڈسٹر ب کر کے
 دیتے۔ وہ مضامین کے مسودے ایک طرف سر کاٹ کر گری سوچوں میں ڈوب جاتی۔
 پھر بھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پاتی۔ شہاب احمد کا دولت مند ہونا اس فیصلے کی
 اہل ایک بہت بڑی رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا۔

یا قاعدہ غصہ ہی اتارنے بیٹھ جاتیں۔
 ”عذر کے لئے کہیں کوشش کرو نا فرخ! آخر کب تک بیٹھی رہے گی؟“

فرخ بھاتی بے چارے پریشان ہو کر کہتے۔
 اُمّی روپاسی ہو کر کہنیں۔ کوشش تو کر رہا ہوں۔
 ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟“

فرخ بھائی سمجھاتے۔
 ”آپ ناحق پریشان ہوتی ہیں، ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔“
 ”میرے تو کان پک گئے ہیں سننے سننے۔“
 ”کیا سننے سننے؟“

”یہی کہ عذر کی شادی کب کر وگی؟ اسے کب تک بیٹھائے رکھو گی؟ کیا بھلا ہے
 میں شادی کر وگی اس کی؟“

”آپ کہنے والوں کی پرواہ ہی کیوں کرتی ہیں؟“
 ”جب دنیا میں رہتے ہیں تو دنیا والوں کی پرواہ بھی کرنی پڑے گی۔“
 ”لوگوں کو تو کچھ نہ کچھ کہنے کی عادت ہوتی ہے، انہیں کہنے دیجئے۔“
 ”لوگوں کی باتیں سن سن کر میرا تو ناک میں دم آ گیا ہے۔“

فرخ بھاتی نے کہا۔
 ”دیکھئے اُمّی! میں تو بس یہ بات جانتا ہوں کہ انسان کو اپنا دل و ضمیر صاف
 رکھنا چاہیے۔“

اُمّی ان کی بات سن کر گری سوچوں میں ڈوب جاتیں۔ اُمّی کو پریشان اور گم

انہی سوچوں میں ایک مہینہ گزر گیا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ شہاب احمد واپس آچکے تھے یا نہیں۔ اس نے مہرین سے معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی مہرین کو ان کی واپسی کے بارے میں شاید خود بھی علم نہیں تھا ورنہ وہ ٹیلیفون پر محنت کو اطلاع ضرور دیتی۔

شہاب احمد کے بارے میں تو بے شک مہرین نے کوئی اطلاع نہیں دی لیکن اماں اور بھائی میاں کے لئے وہ ایک خوشخبری لے آئی چھوٹی آپا کے لئے کسی ڈاکٹر کا رشتہ تھا۔ ڈاکٹر یا سر مہرین کے سسرالی رشتے داروں میں سے تھے۔ رشتے داری اگرچہ خاصی دور کی تھی لیکن مہروز اختر نے اچھی طرح چھان چٹنگ کرنے کے بعد مہرین سے ذکر کیا تھا۔ اماں کے مرجھاتے ہوئے پریشان چہرے پر خوشی کی ایک کہن نمودار ہوئی جس روز ڈاکٹر یا سر کے گھر کی عورتیں چھوٹی آپا کو دیکھنے آئیں اور جاتے جاتے چھوٹی آپا کے لئے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتی گئیں تو اماں نے بے اختیار مہرین کو گلے سے لگا کر دھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ اپنی گودھری ہونے کی دعاسن کہ مہرین کا چہرہ لال مہجھو کا ہو گیا۔

ڈاکٹر یا سر نے چھوٹی آپا کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اماں سوچ میں پڑ گئیں انہیں یہ بات کچھ مناسب نہیں لگی جب کہ فرخ بھائی اور بھائی میاں کا خیال تھا کہ اس میں کوئی حرج نہیں آخر دونوں تعلیم یافتہ اور باسعود ہیں۔ زندگی ان دونوں کو ہی گزارنی ہے، اس میں کیا برائی ہے اگر وہ دونوں آپس میں مل کر چند باتیں کر لیں۔ لیکن اماں اس بات کے لئے بالکل آمادہ نہیں تھیں۔ توصیف بھائی اور شائق باجی نے بھی انہیں سمجھایا آخر کار لڑے یہ ہوا کہ ڈاکٹر یا سر ہسپتال جاکر چھوٹی آپا کو دیکھا

مل لیں لیکن انہیں گھر پر بلا کر چھوٹی آپا کو ان کے سامنے نہیں کیا جائے گا۔ ڈاکٹر یا سر بردھوے کے لئے گھر آئے، اس روز بڑی آپا اور سعدیہ باجی کو بھی لیا۔ سبھی نے ناک بھانک کر انہیں دیکھا۔ سعدیہ باجی نے جب چھوٹی آپا سے جھانک کرنے کو کہا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے تو صاحب بہادر ہسپتال میں ملنے آئیں گے ہی، جیہی میں بھی اچھی طرح اجازتہ لے لوں گی۔“

لیکن بڑی آپا انہیں مانیں۔ انہوں نے چھوٹی آپا کو پکڑ دھکڑ کر کھڑکی کے باہر اکردیا۔ چھوٹی آپا نے فاسا پر وہ سر کا کہ ڈاکٹر یا سر کو دیکھا اور شوخی سے

”اچھے بھلے تو ہیں، انسان کے ہی نیچے نظر آتے ہیں، بڑی آپا ہنس کر بولیں۔“

”تو ہم نے کب کہا تھا کہ ہم کسی حیوان کے نیچے سے غمہارا رشتہ طے کر رہے“

سعدیہ باجی نے تنبیہ کی۔

”ارے! آہستہ بولو، ڈرائنگ روم میں آواز نہ جاتے۔“

فوزی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس کی ہنسی شروع ہوتی تھی۔ تو رکنے کا نام ہی نہیں تھا، محنت کو معلوم تھا کہ اب فوزی کے منہ سے ہنسی کا فوارہ ابل پڑے گا۔ ہانے لنگھوں ہی آنکھوں میں اسے ٹوکا۔ فوزی منہ دبا کر باورچی خانے کی طرف

برہم کوٹے کے بعد ڈاکٹر یا سر ایک روز چھوٹی آپا کو دیکھنے بلا سچل جا پہنچے۔ انہیں دیکھنے کے بعد ڈاکٹر یا سر نے گھر والوں کو اپنی پسند سے مطلع کر دیا تب کہیں جا کر یہ بات چیت آخری مرحلے میں پہنچی۔ اماں نے سب سے پہلے مہرین کو بلا کر اس کا منہ میٹھا کیا۔ چھوٹی آپا کی بات طے ہوئی تو گھر سے بازار تک کی دوڑ شروع ہوئی ویسے تو اماں نے پہلے ہی کافی تیاری کر رکھی تھی، جہیز کے نام پر وہ چھوٹی آپا اور عفت کے لئے کچھ نہ کچھ بناتی رہتی تھیں۔ خدا کے فضل سے اب گھر میں روپے پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔

چھوٹی آپا کی شادی کی تیاریاں جاری تھیں۔ جمجمی ایک دن — مہرین کو جانے کیا سوچھی، اس نے اماں کے سامنے شہاب احمد کا ذکر کر دیا۔ مہرین اختران دنوں اپنے کاروبار کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے عفت کے آفس میں چھٹی تھی، اس نے مہرین کو صبح سے ہی بلوایا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اماں چھوٹی آپا کا دوپٹہ لے بیٹھی تھیں اور بڑے چاؤ سے اس پر گوگرد کا جال بنا رہی تھیں، عفت اور مہرین دوسرا دوپٹہ پھیلانے اس پر اپنی ہنرمندی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ رشتہ داروں کی ذہنیت کا ذکر کرتے ہوئے اماں کچھ رومانسی ہو گئیں تو مہرین نے انہیں سمجھانے ہوئے کہا۔

”لوگوں کی باتوں کا آپ اتنا اثر ہی نہ لیا کیجیے خالہ جان!“

اماں نے کہا۔

”میں خود بھی اپنے آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ مگر کیسے

کروں.....“

مہرین نے کہا۔

شادی بیاہ ساری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے، آنکھیں بند کر کے تو کسی کا بیاہ نہیں چاہا سکتا۔“

تم نے تو میری بہت بڑی پریشانی دور کر دی بیٹی۔“
اماں کا اشارہ چھوٹی آپا کے رشتے کی طرف تھا۔
مہرین نے کہا۔

اب عفت کے رشتے کے لئے آپ کو زیادہ پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔“
دوپٹے پر جال بندتے ہوئے اماں کے ہاتھ ایک دم رک گئے، وہ مارے ت اور تب سس کے مہرین کی طرف جھلک آئیں۔
سچ کو بیٹی! کیا کوئی رشتہ ہے تمہاری نظر میں؟“

عفت نے آنکھ کے اشارے سے مہرین کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی ن کوشش کی۔ مگر مہرین شاید اس وقت بڑے سنجیدہ موڈ میں تھی یا پھر ت شرارت کے موڈ میں تھی۔ اس نے عفت کی پرواہ کئے بغیر شہاب احمد کے لئے اصل واقعات کو نوٹ مڑ کر اماں کو یہ بتایا کہ۔

”مہرین کے دوستوں میں سے ہیں۔ ہمارے یہاں کی ایک تقریب میں انہوں نے ہفت کو دیکھ کر پسند کیا تھا، مجھ سے کافی کرید کرید کر پوچھ رہے تھے، بلکہ نے چھپے الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار بھی کر چکے ہیں، ان دنوں ملک سے باہر ہوتے ہیں واپس آجائیں تو پھر ان سے بارے میں مزید چچان بین کر کے مسئلہ نے بڑھایا جائے گا۔“

نہیں۔“

”سچ کہتی ہو؟“

”ہاں۔“

”میں نہیں مانتی۔“

”عفت خاموش رہی۔“

”مہرین نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔“

”ہی کی اس قدر محبت کے جواب میں تمہارے دل میں الفت کی ایک کرن

جلگانی ہو، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ایسا ہی ہوا ہے۔“

”میرادل یقین کرنے کو نہیں چاہتا۔“

”اب اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں میرے پاس“

”اگر آج کسی وقت تمہیں تنہائی ملے تو تم اپنے دل کو ٹوٹنا۔“

”اچھا، اس سے کیا ہوگا؟“

”بس! مجھے یقین ہے کہ شہاب احمد کے بارے میں سوچتے ہوئے تمہارا دل

”دھڑکنے لگا۔“

”میرادل تو ہر وقت ہی دھڑکتا رہتا ہے۔“

”اُس وقت دل کے دھڑکنے کا انداز ہی کچھ اور ہوگا۔“

”بڑی باتیں بنانی لگتی ہیں۔“

”جو چاہو کہہ لو۔“

”اماں کا چہرہ مارے خوشی کے گلاب کی طرح کھل اٹھا۔ عفت نے کھانے والی نگاہوں سے مہرین کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر دوپٹے میں بیل بنانے لگی۔ بعد میں اس نے مہرین کی اچھی طرح خبر لے ڈالی۔ مہرین کے اوپر عفت کی ناراضگی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔“

”اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔“

”میں نے جو کچھ کیا، بالکل ٹھیک کیا۔“

”میرا خیال ہے تم نے سراسر حماقت کی ہے۔“

”حماقت تو نہ کہتی رہی جواب تک۔“

”عفت منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہی اور مہرین بڑے مطمئن انداز سے مسکراتی رہی۔“

”چھوٹی آپا کے مانجھے والے روز مہرین نے عفت کو تباہ کر شہاب احمد والیں

آگئے ہیں۔“

”عفت نے ”اچھا“ کہہ کر بات ختم کر دی۔“

”مہرین نے کہا۔“

”یہ نہیں بچھو کی کب والیں آئے؟“

”میں کیوں پوچھوں؟“

”چاہتی ہو کہ تمہارے پورے بچے بغیر تباہ ہوں۔“

”قطعاً نہیں۔“

”تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ان سے؟“

عفت اس کی طرف دیکھ کر مسکھانے لگی۔

مہرین نے کہا۔

”ویسے شہاب احمد کو اتے ہوتے کافی دن ہو گئے ہیں“

”اچھا۔“

”تم نے تو ان بے چاروں پر ٹیلیفون ٹک کرنے کی پابندی عائد کر رکھی ہے

پھر وہ تمہیں اطلاع کیسے دیتے؟“

”میں چاہتی بھی نہیں تھی کہ وہ مجھے اطلاع دیتے۔“

”بس ارہنے دو، دل ہی دل میں دن گن رہی ہو گی ان کے آنے کے

عفت کو ہنسی آگئی۔

کافی رات تک عفت کو کمر ٹکانے کی فرصت نہیں ملی۔ کوئی نہ کوئی کام یاد آتا

تھا اور جب تنہائی کے چند لمحات اسے میسر آتے تو بند آنکھوں تلے شہاب احمد

عجسٹ سوال بنے اس کے سامنے آکھڑے ہوتے یوں — جیسے پوچھ رہے ہوں۔

آپ نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟

عفت خود اپنے آپ سے یہی سوال کر بیٹھی۔

اسے احساس ہوا —

اس کے دل کے دھڑکنے کا انداز ہی کچھ اور تھا۔

اس کی سوچیں آج اسے کسی اور ہی سمت لئے جارہی تھیں۔

اس کا جسم سارے دن کی تھکن سے چور چور تھا۔

لیکن آنکھیں پھر بھی بے خواب تھیں۔

اس نے آنکھیں میچ میچ کر سونے کی کوشش کی۔

مگر نیند نہیں آئی۔

شہاب احمد کے خیالوں سے اپنے ذہن کو آزاد کرنا چاہا۔

گھر وہ اپنی تمام تر متانت اور سنجیدگی سمیت چپکے ہی چپکے اس کے دل و

غ پر چھائے چلے جا رہے تھے۔

عفت نے اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کیا۔

وہ گھبرا کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

چلین پینتے ہوئے اس نے ساتھ والے بستر کی طرف دیکھا۔

بایوں کے پیلے کپڑوں میں چھوٹی آپا کا چہرہ پیلا پیلا سا لگ رہا تھا۔

ایک ہاتھ داپتے رخسار کے نیچے دبا تے وہ بے خبر سو رہی تھیں۔

ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

شاید اپنی بند پلکوں تلے وہ آنے والے دنوں کے سندر سپنے سجا رہے

تھے تھیں۔

عفت درپچے میں جھک کر باہر دیکھنے لگی۔

رات اپنی بانہیں پھیلائے کھوئی کھوئی سی کھڑی تھی۔

فاموش —

چپ چاپ

پردہ باندھے کے ستون سے لپٹی ہوئی لوگن ویلیا کی میل میں سرخ سرخ

لہجہ سے اجالے میں جھک رہے تھے۔

پتوں میں ہلکی ہلکی سسگوشیاں تھیں۔

چاند سرکہ بلند ہو گیا تھا۔

اور چاندنی کی نرم چہرہ دھیرے دھیرے زمین پر برس رہی تھی۔

عفت نے رات کے خاموش پرسکون ماحول میں کھوجانے کی کوشش کی۔

لیکن شہاب احمد کی شبیہ کبھی کسی طرح اس کے دل و دماغ سے دور جانے پر آمادہ ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ جھنجھاکر دوبارہ اپنے بستر پر اگتی اور آنکھیں بند کر کے سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

چھوٹی آپا کی شادی کے ہنگامے ختم ہو گئے، گھر میں پہلے سے زیادہ سناٹا بچا گیا۔ اماں اور بھائی میاں کے شانوں پر سے کچھ اور بوجھ کم ہو گیا۔ اماں کچھ ہلکی ہلکی سسی ہو کر پہلے سے زیادہ مزے کی نیند سونے لگیں۔ عفت نے آفس سے چند دنوں کی چھٹی لی تھی چھٹی ختم ہونے پر اس نے دوبارہ آفس جانا شروع کر دیا۔

کئی روز گزر گئے۔ تب ایک شام مہرین نے گاڑی بھیج کر عفت کو بلوا بھیجا۔ عفت گھر پر ٹیلیفون کر کے مہرین کے گھر چلی گئی۔ وہ گاڑی سے اتری تو ان میں ہی اسے مہرین مہروز اختر اور شہاب احمد نظر آئے۔ مہرین اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ عفت نے بہت برہمی سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”تم نے مجھے ان حضرات کے چہرے میں بلایا ہے“

مہرین مسکرا دی۔

”کم سے کم مہروز بھائی کا تو خیال کر لیا کرو، وہ کیا سوچیں گے؟“

”میں نے مہروز کو سب کچھ بتا دیا ہے۔“

دیا مجھے اس قابل بھی نہیں چھوڑا کہ میں مہروز بھائی کا سامنا کر سکوں“

اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے اور پھر مہروز تو بے حد خوش ہوئے ہیں یہ

کچھ سن کر،

عفت نے کچھ سوچتے ہوئے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

میں دونوں مردوں کے پاس قطعی نہیں بیٹھوں گی“

پھر کہاں بیٹھوں گی؟

الذہم تھمارے کمرے میں“

حفاظت کی باتیں مت کرو۔“

میری ہر بات تمہیں حفاظت نظر آتی ہے۔“

تمہاری یہ حرکت آؤٹ آف ایٹھ کیٹ ہوگی، سبھی“

عفت کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

مہرین نے اسے پھینکا۔

اماں کا ہنسا رہے پھرے سے بہت تھکن ظاہر ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود

بچہ پیاری لگ رہی ہو۔“

”بیکار باتیں نہ کرو۔“

”اچھا چلو، وہ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم جانے کیا میٹنگ کر رہے ہیں۔“

عفت مہرین کے ساتھ اس طرف بڑھ گئی جہاں درختوں کے سائے میں مہروز

اور شہاب احمد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

مہروز اختر نے کہا۔

”کیوں عفت بہن! کیا کافر نس ہو رہی تھی؟“

عفت بخل سی ہو کر بولی۔

”کوئی کافر نس نہیں ہو رہی تھی، بس! ویسے ہی مہربان نے باتوں میں لگایا

تھا۔“

مہروز اختر نے شہاب احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”شہاب صاحب سے تو آپ پہلے بھی مل چکی ہیں۔“

عفت کی نگاہیں ایک لحظہ کے لئے شہاب احمد کی طرف اٹھیں۔

”جی ہاں! آپ ہی کے پہل ان سے دو تین دفعہ ملاقات ہوئی ہے۔“

مہروز اختر نے کہا۔

”شہاب احمد حال ہی میں اپنے کاروباری دورے سے واپس آئے ہیں۔“

ظاہر ہے، عفت کے علم میں یہ بات تھی لیکن وہ مہروز اختر کے سامنے اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مہربان الف سے ہی تک انہیں ساری آقا

سنا چکی تھی۔ مہروز اختر کی بات سن کر وہ خاموش رہی۔

مہروز اختر کچھ دیر ان لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ

”مجھے ایک ضروری کام ہے، ایک صاحب کو ٹائم دے رکھا ہے، آپ لوگ

عسوس نہ کیجئے گا۔“

یاد تو انہیں سچ بچ ضروری کام تھا یا پھر انہوں نے محض مہذب بنایا تھا۔ مہربان

ملازم چائے کی بٹالی لے آیا تھا۔ چائے ختم ہوئی تو مہربان ایک دم یہ کہہ کر اٹھ گئے

”عفت! تم شہاب صاحب سے باتیں کرو، میں عصر کی نماز پڑھ کر اب بھی آئی

سے۔“

عفت کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کا دل تو یہ چاہا کہ وہ

جی اندر چلی جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر ٹھٹھی مڑی۔

پھر کئی لمحے گزر گئے۔ دونوں خاموش رہے۔ لیکن عفت کو اس بات کا احساس

ہو گیا تھا کہ شہاب احمد کرسی کی پشت سے سڑکائے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بدوہ منتظر تھے کہ عفت کچھ بولے گی مگر عفت نے ان کے وجود کو سرسبز نظر انداز

لھا تھا۔

شہاب احمد بے چین ہو کر عفت کی طرف قدرے جھکتے ہوئے بولے۔

”عفت!“

عفت نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”جی! فرمائیے۔“

”مجھے معلوم ہے کہ میرے اتنے عرصے باہر رہنے کو آپ نے ذرا بھی اہمیت

دی ہوگی۔“

”اچھا! پھر؟“

”اور نہ آپ کو مجھ سے ملنے کی کوئی خواہش ہوگی۔“

”لیکن ہے آپ کا خیال درست ہو۔“

”لیکن اب اگر اتفاق سے میری اور آپ کی ملاقات ہو ہی گئی ہے تو ان لحظوں کو

مراجم ضائع تو نہ کیجئے۔“

”لیکن؟ مجھے کیا کرنا چاہیئے اس وقت؟“

”کچھ باتیں کیجئے“

”فرض کیجئے میرا دل آپ سے باتیں کرنے کو نہ چاہ رہا ہو۔“

شہاب احمد نے ایک طویل سانس لے کر دوبارہ کرسی کی پشت سے سرٹکا دیا۔ چند سیکنڈ وہ شکایت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔

”مجھے احساس ہے عفت! میں ایک سرباب کے پیچھے بھاگ رہا ہوں، ایک ملنے کا تعاقب کر رہا ہوں۔“

عفت نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔

”آپ کو یہ مشورہ کس نے دیا تھا؟“

”معلوم نہیں“

پھر وہ کچھ رک کر بولے۔

”شاید کسی نے بھی یہ مشورہ نہیں دیا تھا مجھے“

”تو پھر آپ سے یہ حرکت کیوں سرزد ہوتے جا رہی ہے اور وہ بھی مسلسل؟“

عفت کے جملے پر وہ بے ساختہ مسکرا دیتے۔

عفت پلکیں جھپکاتے بنا ان کی طرف دیکھتی رہی۔

شہاب احمد نے کہا۔

”آپ اصل میں بہت ہی بے حس ہیں نا! اس لئے۔“

”آپ کا خیال بالکل غلط ہے، میں قطعی بے حس نہیں ہوں،“

”تو پھر آپ کے اوپر کسی بات کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟“

”یعنی کس بات کا؟“

”کسی کے جذبات و احساسات آپ کے اوپر ذرا بھی تو اثر انداز نہیں ہوتے؟“

”یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟“

”یہ میرا ذاتی خیال ہے۔“

”آپ کا خیال غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”نہیں، میرا خیال صحیح ہے“

شہاب احمد کا لہجہ خاصا درشت تھا۔

عفت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

شہاب احمد نے شکایت آمیز انداز سے کہا۔

”آپ نے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا؟“

عفت خاموش رہی۔

”آپ سوچ سکتی ہیں۔ میں نے کتنا انتظار کیا ہوگا؟“

عفت پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

”میں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں عفت!“

”میں کیا جواب دیتی؟“

”کیوں؟ کوئی جواب نہیں دے سکتی تھیں آپ؟“

”کس قسم کا جواب؟“

”افزار یا انکار، کوئی جواب تو دے سکتی تھیں آپ“

”کس بات کا انکار یا انکار؟“

”کیا مطلب؟ مجھے یقین ہے کہ آپ اتنی نا سمجھ نہیں ہیں“

شہاب احمد کی کٹا دہ پیشانی پر کئی سلوٹیں نمودار ہوئیں۔

عفت نے دانتوں تلے ہونٹ بھینچ کر بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ

کو ضبط کیا۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر شہاب احمد کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کچھ برہم سے نظر

آ رہے تھے۔

عفت نے کہا۔

”میرا مطلب نہیں سمجھ آپ؟“

”غالباً آپ نے سمجھانے کی کوشش ہی نہیں کی۔“

”میرا مطلب ہے آپ کی تحریروں اور سی سی تھی، جملے خاصے غیر واضح اور

بہم سے تھے۔“

شہاب احمد بڑے انداز سے مسکرائے اور بولے۔

”آپ تو افسانہ نگار ہیں، اور سی سی تحریروں کو مکمل کرنا آپ کے لئے کچھ مشکل

نہیں اور مبہم اور غیر واضح جملوں کا مطلب سمجھ لینا بھی آپ کے لئے دشوار

نہیں“

عفت کچھ برامان کر بولی۔

”آپ طنز کر رہے ہیں؟“

”جی نہیں، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“

عفت چپ چاپ بیٹھیں ان کی طرف دیکھتی رہی۔

شہاب احمد نے کہا۔

”آپ اگر مناسب سمجھیں تو میرے اس ادھورے خط کا جواب محض چند

رہیں ابھی دے دیں۔“

عفت نے پریشان نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

”معلوم نہیں کیوں آپ اپنے ساتھ میرا بھی ذہنی سکون تباہ کرنے پر تلے بیٹھے

ہے؟“

شہاب احمد اپنے مخصوص انداز سے مسکرا کر بولے۔

”شکریہ ہے خدا کا۔“

”جی؟“

”بات یہاں تک تو پہنچی۔“

”میں آپ کی بات بالکل نہیں سمجھی۔“

”آپ ابھی اپنا ذہنی سکون تباہ ہونے کی بات کر رہی تھیں“

عفت سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے بے حد قیمتی وقت میں چند لمحے میرے لئے

مخصوص ہیں۔“

عفت کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔

”چاہے آپ کسی انداز سے بھی میرے لئے سوچتی ہوں۔ لیکن بہر حال سوچتی ضرور

ہوں۔“

عفت سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ حقیقت آشکار ہو جانے پر وہ اپنے آپ کو

نروس ہونے سے نہ لوک سکی۔

شہاب احمد اس کی اس کیفیت سے پورا پورا فائدہ اٹھانے پر آمادہ تھے۔ انہوں نے بے پناہ چاہت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی طرف قدرے جھکے ہوئے تھے۔

”میں آپ سے ایک بات پوچھنے والا ہوں، مجھے یقین ہے۔ آپ بھوٹ نہیں بولیں گی۔“

عفت خاموش رہی۔

”وعدہ کیجئے آپ سچ سچ بتائیں گی۔“

عفت بھنجھا کر بولی۔

”آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے۔ پوچھئے، وعدے کے چکر میں نہ پڑیں۔“

”نہیں، پہلے آپ قسم کھائیے۔“

عفت نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور نیکیے انداز سے بولی۔

”آپ اس قدر زبردست بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔“

شہاب احمد خفیف سے ہو کر بولے۔

”نہیں، نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر وعدہ لینے اور قسم کھلانے پر اصرار کیوں ہے؟“

”اچھا چلیے یوں ہی بتا دیجئے۔“

”پوچھئے۔“

”میرا خط ملنے کے بعد سے آج تک آپ نے کتنی بار میرے بارے میں سوچا؟“

عفت چند سیکنڈ سر جھکا کر کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔

”دیکھئے شہاب صاحب۔“

”جی۔“

”چاہے آپ میرا جواب سن کر خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں لیکن.....“

”لیکن؟“

”میں بھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”یہی ہی چاہتا ہوں کہ آپ سچی بات مجھ سے نہ چھپائیں۔“

”تو پھر سنئے سچی بات۔“

”جی امیں سن رہا ہوں۔“

”میں نے آپ کے بارے میں بار بار سوچا ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ آپ کا خیال ایک ماٹے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہا ہے۔“

عفت نے محسوس کیا کہ شہاب احمد اس کی اس قدر صاف گوئی پر حیران ہونے لے ساتھ ساتھ بے پناہ خوش بھی تھے، ان کے دلی جذبات ان کے چہرے سے پال تھے۔ شاید اس کا جواب ان کی توقع کے خلاف تھا۔

شہاب احمد نے کہا۔

”تو پھر آپ نے میرے بارے میں کوئی فیصلہ بھی کیا ہوگا؟“

”جی نہیں، میں نے ابھی تک کوئی فیصلہ کیا۔“

”میں اس کی وجہ ضرور جانتا چاہوں گا۔“

”زندگی کا اس قدر اہم فیصلہ اتنی آسانی سے نہیں کیا جاسکتا۔“

”آپ کی بات درست ہے لیکن کیا ہم دونوں کو ملتے ہوئے ہمینوں نہیں گذر گئے؟“

”آپ ہمینوں کی بات کرتے ہیں جب کہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے سالوں کا عرصہ بھی غھوڑا ہوتا ہے،“

”تو پھر کب تک آزمانے کا ارادہ ہے مجھے؟“

”اس کا جواب میں آپ کو سوچ کر دوں گی“

”لیکن کب اور کہاں؟“

”عفت سوچ میں پڑ گئی۔“

”شہاب احمد نے کہا۔“

”ایک درخواست کروں؟“

”عفت نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔“

”آپ مجھے ٹیلیفون کرنے کی اجازت دے دیجئے۔“

”نہیں، یہ مناسب نہیں ہے۔“

”تو پھر مجھے اپنے آفس آنے کی اجازت دیجئے۔“

”عفت نے طنز پر لہجے میں کہا۔“

”جی ہاں، تاکہ میرے نیک نام ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔“

”شہاب احمد نرچ ہو کر بولے۔“

”تو پھر ملاقات کے لئے کوئی تیسری راہ بتا دیجئے۔“

”عفت نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔“

”تیسری کوئی راہ نہیں۔“

”تو پھر میں آپ کے آفس آؤں گا۔“

”عفت نے خشمگین نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔“

”میں یہ بات سخت ناپسند کرتی ہوں کہ کوئی شخص زبردستی میرے اوپر اپنی

مسط کرنے کی کوشش کرے۔“

”شہاب احمد نے الجھی الجھی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ اسی وقت مہربین

عفت نے ناراضگی سے کہا۔“

”ختم ہو گئی تمہاری نماز؟“

”مہربین نے مسکراتے ہوئے کہا۔“

”معاف کرنا، نماز کے بعد میں قرآن شریف پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔“

”اسی وقت پڑھنا ضروری تھا؟“

”صبح وقت نہیں مل سکا تھا۔“

”تو پھر مجھے کیوں بلوایا تھا؟“

”لے لے بے کئی دن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی نا۔“

”اسی طرح ملتے ہیں؟“

”ملاقات کا ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے۔“

”مہربین معنی خیز انداز سے مسکراتی۔“

”عفت سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔“

”اچھا! بس اب میں گھر جاؤں گی۔“

”ابھی کیسے جاؤ گی؟“

”کیوں؟“

”ابھی تو میں نے تم سے باتیں بھی نہیں کیں“

”پھر کسی دن آ جاؤں گی، اس وقت تو جانے دو۔“

ابھی ہر روز آتے ہوں گے، ہم دونوں تمہیں چھوڑ کر آئیں گے۔

”بہت دیر ہو جائے گی مہرین“

”فکر نہ کرو، سب کو معلوم ہے کہ تم میرے گھرائی ہو“

عفت خاموش ہو گئی۔ شہاب احمد کچھ دیر بعد چلے گئے تو مہرین عفت کے

پیچھے پڑ گئی۔

”بتاؤ کیا باتیں ہوتی تھیں؟“

عفت نے اپنی جان چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن پھر بتاتے ہی ہنپڑی

مہرین کے دیور کی دعوت ولیمہ کے موقع پر عفت اور شہاب احمد کی ملاقات
نہ بجائی میاں کی طبیعت اس روز خاصی خراب تھی اس لئے سوائے عفت
اور کوئی بھی نہیں آسکا تھا جو عفت بھی اس روز آنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن
اور بجائی میاں نے اصرار کر کے اسے بھیج دیا۔ اس نے فوزی کو ساتھ لے
کر کوشش کی لیکن فوزی اس قسم کی تقریبوں میں جانے سے بہت گھبراتی تھی۔
عفت کو تنہا ہی آنا پڑا۔

شہاب احمد اس سے پہلے ہی پہنچے ہوئے تھے۔ مہرین نے جان بوجھ کر عفت
ماب احمد کے پاس پہنچا دیا عفت اپنی باتوں میں لگن آگے بڑھتی رہی اور چونکی
اور وقت جب اس نے سامنے والی نشست پر شہاب احمد کو بیٹھے دیکھا۔
پسکندہ سی۔ وہاں سے آگے بڑھ جانا یا پیچھے پلٹ جانا ذرا بھی مناسب نہیں
اور مہرین اس کے لئے کمرے میں بھی کھسکا چکی تھی۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”واقعی؟“

”یقین کیوں نہیں آتا آپ کو؟“

”میں سمجھتا تھا شاید ابھی مجھے اور انتظار کرنا پڑے گا، طویل انتظار“
عفت چند سیکنڈ تک پلکیں جھپکاتے بغیر ان کی طرف دیکھتی رہی
بڑی سنجیدگی سے بولی۔

”آپ کا اسٹیشن، آپ کی بے پناہ دولت اور آپ کا ماحول ہماری راہ میں
ت بڑی رکاوٹیں ہیں“
شہاب احمد چونک کر بولے۔

”جی!۔“

”اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو شاید میں اب تک فیصلہ کر چکی ہوتی۔“
شہاب احمد حیران لگا ہوں سے اس طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید سوچ رہے
تھیں کہ کیا ان کو عموماً ایسے ہی اونچے خواب دیکھا کرتی ہیں مگر اس لمحے وہ یہ بات
بول گئے تھے کہ ہر لڑکی ایک ہی انداز سے نہیں سوچتی۔
عفت نے بڑے سکون سے کہا۔

”لیکن میں یہ بات واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں ان سب سے مرعوب
نہیں ہوں۔“

”اس کا اندازہ مجھے ابھی طرح ہے۔“

”در اصل میں خوف زدہ ہوں۔ بے حد خوف زدہ۔“

”آپ بلاوجہ ہی خوف زدہ ہیں۔“

مہربان اس سے دو تین باتیں کر کے دوسرے مہمانوں کے استقبال کے لئے پھاڑا
شہاب احمد کو شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان کے پاس مجبوراً بیٹھی ہے۔

وہ اس کی طرف دیکھ کر قدرے مسکراتے اور بولے۔

”شاید میری موجودگی آپ کو ناگوار گزر رہی ہے۔“

”جی نہیں! اپنی موجودگی یہاں ناگوار گزر رہی ہے“

”آپ کہیں اور بیٹھنا چاہتی ہیں؟“

”میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، اب تو یہاں بیٹھنا ہی جاسکتی ہیں“

”بیٹھانے والی نے بالکل صحیح جگہ بیٹھایا ہے آپ کو“

”اچھا!۔“ عفت کا انداز بے حد یکساں تھا۔

”جی“

”وہ کیسے؟“

”میں بڑی شدت سے آپ کا منتظر تھا“

”کیوں؟“

”آپ کا فیصلہ سننے کے لئے“

”اور اگر میں نے کوئی فیصلہ ہی نہ کیا ہو؟“

”آخر کب فیصلہ کریں گی آپ؟“

”یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم“

”میرا خیال ہے اب تو آپ کو کوئی فیصلہ کر ہی لینا چاہیے“

”ویسے میں بڑی سنجیدگی سے آج کل اس مسئلے پر غور کر رہی ہوں۔“

”اُپ سے بھی اچھے ہیں۔“

”اُپ کی صاف گوئی مجھے بے حد پسند آتی“

”اچھا! واقعی؟“ عفت کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔

”یقین کیجئے لیکن....“

”لیکن؟“

”اب اُپ اپنے اور میرے بارے میں کوئی فیصلہ کر ہی لیجئے۔“

”بہت دشوار ہے شہاب صاحب۔“

”کیوں؟“

”ان رکاوٹوں کو میں کیسے نظر انداز کر دوں؟“

”اُن باتوں کو اُپ بھول جاتیے“

”کیسے بھول جاؤں؟“

”بس! انہیں کوئی اہمیت نہ دیجئے“

”حقائق سے چشم پوشی کرنا مجھے نہیں آتا۔“

”پلیز میس شجاع! اس قدر ذہنی اذیت نہیں پہنچا یا کہ تے کسی کو۔“

”عفت نے بے اعتدالی سے ان کی طرف دیکھا۔“

”کیا سچ مح! اُپ کو ذہنی اذیت پہنچ رہی ہے؟“

”اُپ جھوٹ سمجھتی ہیں؟“

”عفت ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھیرے ان کی طرف دیکھتی رہی۔“

”شہاب احمد اس کی طرف قدرے جھکے ہوئے بولے۔“

”بلاوجہ تو نہیں کہہ سکتے اُپ“

”شہاب احمد نے کچھ جھجکے ہوئے کہا۔“

”ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھئے“

”مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی تو نہیں لیکن پھر بھی میں اگر اُپ سے

یہ پوچھوں کہ.....“

”وہ ایک سیکنڈ کے لئے رکے۔“

”عفت نے کہا۔“

”جی! کہئے، رک کیوں گئے؟“

”میں اُپ کو کیسا لگتا ہوں؟“

”اپنی تعریف سننے کے متمنی ہیں؟“

”قطعاً نہیں! میں صرف اُپ کے احساسات سے واقف ہونا چاہتا

ہوں۔“

”عفت مسکرائی۔“

”میرے احساسات؟ اپنے بارے میں؟“

”جی۔“

”رعادت کی بات کرتے ہیں تو محض چند ملاقاتوں میں ہم کسی شخص کو اس

کے خول سے باہر نہیں لاسکتے اور اگر شکل و صورت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔“

اپنی پرسنلٹی کا ذکر کرتے ہیں تو بے شمار لوگوں سے اُپ اچھے ہیں مگر بے شمار

”پھر؟ آپ کا جواب اقرار میں ہے نا؟“
عفت نے پرسکون انداز سے کہا۔

”میں تین چار روز میں آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گی۔“
”مگر کس طرح؟ آپ کہاں ملیں گی؟“

”بس! کسی بھی طرح۔“

”چلتے! کچھ تو اس بندہ ہاٹی آپ نے“

عفت نے ساختہ مسکرا دی مگر کسی کی پشت سے سرٹکاتے ہوئے اس نے
ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیا۔ ایک خاتون کو دیکھ کر اسے ان پچھوٹی آبا
کا گمان گزرا لیکن پھر اپنے خیال پر دل ہی دل میں مسکرا دی۔

پچھوٹی آبا کہاں سے آجائیں گی؟ ابھی پچھلے ہی ہفتے تو وہ ہنی مون منانے
مری، سوات وغیرہ گئی ہیں۔

اس نے شہاب احمد کی طرف دیکھا۔ اپنی آنکھوں سے جھانکتے ہوئے چاہت
کے جذبات کو چھپانے کی وہ ناکام کوشش کر رہے تھے۔
اس رات عفت بہت بے سکون رہی۔

جانے اس کی نیند کو کیا ہو گیا تھا۔

لمحے چپ چاپ وقت کے گزرے سمندر میں ڈوب رہے تھے۔

رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔

چاند مرکتے مرکتے بہت بلند ہو گیا تھا۔

جانے کتنے نثارے ڈوب گئے تھے۔

لے آسمان تلے آنگن میں اس کی، فوزی کی اور اماں کی چار پائیاں کچھی تھیں۔ اماں
ری بے خبر سو رہی تھیں عفت کے پلنگ کے قریب ہی دیوار کے ساتھ
ٹی لکیریوں میں گلاب، موتیا اور رات کی رانی میں ڈھیروں پھول کھلے
تھے۔

ہوا کی نرم و نازک بانہوں کے سہارے پھولوں کی البیلی سی خوشبو آنگن
باروں طرف بکھر رہی تھی۔

ادھ کھلی کلیوں کے ساتھ دھیرے دھیرے جھوم رہے تھے۔

اور ایسے میں شہاب احمد کا خیال کسی طرح اس کا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ
نہ تھا۔

کلی آنکھوں میں بھی انہی کی تصویر نظر آتی تھی۔

اور بند آنکھوں تلے تصویر کے نقش اور بھی زیادہ واضح نظر آتے تھے۔

جب دل اور دماغ نے متفق ہو کر شہاب احمد کے حق میں فیصلہ دے
دعفت کو مارمانی پڑی۔

صرف اُس رات — بلکہ اس کے بعد بھی تین روز تک یہی سلسلہ

ی رہا جیت شہاب احمد کی ہوئی۔ عفت نے ان کے آفس کا نمبر ملا یا۔ ان کی سیکرٹری
ہو لڑا ان کرنے کو کہا۔

چند سیکنڈ بعد شہاب احمد کی آواز سنائی دی۔

عفت کی آواز سن کر وہ اپنی بے پناہ مسرت کو چھپانہ سکے۔

”عفت! سچ بچ! یہ آپ ہی ہیں نا؟“

عفت نے بڑے سکون سے کہا۔

”جی۔“

”یقین نہیں آتا۔“

”اچھا! تو پہلے آپ یقین کر لیجئے۔“

شہاب احمد نے ایک طویل سانس لی۔

عفت نے پوچھا۔

”میں ٹیلیفون بند کر دوں؟“

”نہیں، قطعی نہیں۔“

”اچھا! اگر کچھ سننے کے موڈ میں ہیں تو پھر میں آگے کچھ کہوں۔“

”کہئے! لیکن خدا را کوئی اچھی بات کہئے گا۔“

”میں نے آپ سے کہا تھا نا! کہ میں تین چار روز میں آپ کو اپنا فیصلہ

سنا دوں گی؟“

”جی ہاں! ان چار دنوں میں ہر لمحے میں منتظر رہا۔“

”بہت وسوسے اور بڑے اندیشے ہوں گے۔ دل و دماغ میں؟“

”بس! کچھ نہ پوچھئے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کیا فیصلہ کیا ہوگا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ آپ بہر حال فیصلہ کرنے کے لئے آزاد تھیں۔“

”اچھا تو سنئے!“

”جی! فرمائیے۔“

میں نے بہت سوچا۔

اچھا۔

بہت غور کیا۔

مجھے معلوم ہے۔

میں سمجھی ہوں کہ بالکل ہی اجنبی اور انجان شخص کے حق میں فیصلہ کرنے

بہتر ہے کہ کسی ایسے شخص کے بارے میں فیصلہ کیا جائے جس سے زیادہ

پہچان ہی ملتا قائل ہوتی ہوں۔

شہاب احمد اس کی بات سن کر چند لمحوں تک کچھ بول ہی نہ سکے عفت

تھا کہ ان کی یہ کیفیت بے پناہ خوشی کے سبب ہے، شاید انہیں

اب کی توقع نہیں تھی۔

شہاب احمد کو خاموشی پا کر اس نے انہیں محض تنگ کرنے کے لئے کہا۔

معلوم ہوتا ہے آپ خوش نہیں ہوتے۔

ایک دم چونک پڑے۔

جی!! بخدا یہ بات نہیں۔

پھر؟

آپ کے فیصلے نے یہ جو بے اندازہ مسرت مجھے دے دی ہے، سمجھ میں

آتا اسے کس طرح سمیٹوں؟

کیا سچ مچ آپ اتنے ہی خوش ہیں؟

آپ اندازہ نہیں کر سکتیں عفت! آپ نے کبھی کسی کو چاہا جو نہیں،

”دل تو نہیں چاہتا لیکن پھر سوچتا ہوں کہیں آپ ناراض ہی نہ ہو جائیں“

”اچھا! خدا حافظ“

”خدا حافظ“

عفت نے ریسور رکھ کر ایک طویل سانس لی۔ اپنی زندگی کے بارے میں ابڑا اور اہم فیصلہ کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اگلے روز اس نے مہرین کو ٹیلیفون کیا۔

”مہرین بیگم! تمہیں یہ سن کر یقیناً خوشی ہو گی کہ تمہارے شہاب احمد جیت لے گئے ہیں۔“

مہرین نے چونک کر پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ میں نے ان کی بات مان لی ہے“

مہرین مارے حیرت اور خوشی کے چیخ پڑی۔

”سچ سچ عفت!!“

”ہاں“

”تم بڑی پیاری لڑکی ہو۔“

”خوب! تو گویا اگر میں شہاب احمد کے حق میں فیصلہ نہ کرتی تو پیاری لڑکی نہ ہوتی۔“

مہرین ہنس پڑی اور بولی۔

”تم نے یہ خوشخبری شہاب احمد کو بھی سنائی یا نہیں؟“

عفت خاموش رہی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”ہو سکتا ہے حقیقت یہی ہو“

”اب دیکھئے نا! یہاں بھی معاملہ یک طرفہ ہی سمجھتے۔“

”جی!!“

”آپ نے تو مجھے نہیں چاہا، میں نے آپ کو چاہا ہے“

”ٹھیک کہتے ہیں“

”آپ نے تو محض مجھ پر عنایت کی ہے“

”عنایت!!“

”جی ہاں! میں تو اسے عنایت ہی کہوں گا۔“

عفت خاموش رہی۔

”زندگی کے سفر میں کسی اور کے بجائے آپ نے میرے ساتھ چلنا پڑا“

کیا، میرے لئے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔“

”ہوئے۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ اس فیصلے میں آپ کی محبت اور چاہت کو کب دغا“

ہے یا نہیں؟“

”وقت آنے دیجئے نا اس کا جواب بھی مل جائے گا آپ کو۔“

”خیر! فی الحال تو آپ کی اتنی عنایت ہی میرے لئے بہت ہے۔“

”اچھا جناب! اب میں ٹیلیفون بند کر دوں؟“

”ہاں! کیوں نہیں“

”کب؟ کہاں؟“

”کل، ٹیلیفون پر“

”کیا گنہ دہی ان کے دل پر؟“

”میں ان کے دل میں گھسی ہوئی تو نہیں بیٹھی ہوں۔“

”یہ بات تو تم نے سراسر غلط کہی“

”وہ کیسے؟“

”ان کے دل میں سوائے تمہارے کوئی نہیں“

عفت سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

مہربن نے کہا۔

”کل رات ہی میں اور مہروز تمہارا ذکر کر رہے تھے“

”اچھا! کس سلسلے میں؟“

”انتہی شہاب احمد کے سلسلے میں۔“

”کیا کہہ رہے تھے مہروز بھائی؟“

”کہہ رہے تھے شہاب احمد کے بارے میں مزید چچان بین کر لوں تو سلسلہ

آگے بڑھایا جاتے۔“

عفت نے مسکرا کر کہا۔

”فیصلہ کن نامیرا کام تھا، وہ میں کر چکی، اب آگے جو تم لوگوں کا دل چاہے

کر تے رہو۔“

تحقیقات کرنا تو بہر حال ضروری ہے۔“

بے شک ضروری ہے لیکن یہ کام پہلے کرنا چاہیے تھا۔

تمہاری رضامندی کے بغیر آگے قدم بڑھانا بیکار تھا

بالکل الٹی بات کر رہی ہو۔

اچھا چلو، الٹی ہی سہی۔

عفت نے کچھ ناراض ہو کر کہا۔

”تم لوگوں کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں“

لوگ کون؟

”تم، سعید باجی“

مہربن چونک کر بولی۔

”اے! سعید باجی کو بھی بتایا یا نہیں؟“

ابھی نہیں“

”تو انہیں بھی بتا دو۔“

”گو اپیلے سے ڈھنڈورا پیٹ دوں“

”اصل مسئلہ تو تمہاری رضامندی کا تھا، وہ طے ہو گیا“

”اپنی ہی کہہ جانا“

”سوچ لو، سعید باجی ناراض ہو جائیں گی“

”بڑا خیال ہے ان کی ناراضگی کا۔“

”ہاں بھی! باجی جو بھڑیں اور پھر اس معاملے میں وہ میری ہم خیال بھی

”نہیں“

”تو پھر یہ کام ہمتی انجام دے لو۔“

”چلو، منظور“

حمری نے نہ صرف سعیدہ باجی کو بتایا بلکہ یہ بات اماں کے بھی گوش گزار کر دی کہ

”جس رشتے کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا اسے تقریباً طے ہی سمجھے

وہ صاحب تو بالکل رضامند تھے، عفت ہی انکار کئے جا رہی تھی۔

لیکن اب اس نے بھی حامی بھر لی ہے“

ظاہر ہے یہ خبر سن کر اماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اور سعیدہ باجی بھی بے حد مطمئن ہو گئیں۔

پھر — ایک روز — آفس میں ڈاک دیکھتے ہوئے عفت کی نظر سے

شہاب احمد کا دوسرا خط گزارا۔ اس نے آفس کی ڈاک سمیٹ کر ایک طرف

رکھ دی اور شہاب احمد کا خط پڑھنے لگی۔ ان کا یہ خط بھی پہلے ہی کی طرح بغیر

القاب و آداب کے تھا۔ عفت نے ایک دفعہ خط پڑھا، دوبارہ پڑھا اور

پھر بارہ پڑھنے لگی۔ خط پڑھتے ہوئے شہاب احمد کی شبیہ بجم التجا بنی

اس کے سامنے تھی۔

انہوں نے لکھا تھا —

مجھے احساس ہے کہ میں آپ تک بڑی مشکل سے پہنچا ہوں۔ آپ کے

جواب نے مجھے جو بے اندازہ مسرت بخشی ہے اسے سمیٹنا مجھے کس قدر دشوار لگتا

ہے یہ میں آپ کو کیسے بتاؤں؟

جب تک آپ نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ میں صرف یہ جانتے کے لئے

بے چین تھا کہ آپ میرے بارے میں کیا فیصلہ کر چکی ہیں اور اب.....

مجھے میں نہیں آتا کیسے کہوں؟ آپ کو کیسے بتاؤں؟ بتائے بغیر چارہ بھی نہیں

درا یہ بھی جانتا ہوں کہ اتنی بڑی بات کا انکشاف ہونے کے بعد آپ بہت

ری طرح برہم ہو جائیں گی اور سوچیں گی کہ جب میرے ساتھ یہ صورت حال تھی۔

ذمہ نے اتنی اونچی پرواز کی کوشش کیوں کی؟ میں جانتا ہوں عفت بہت

اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں نے سچ مچ بادلوں کو چھو لینے کی کوشش کی ہے۔

میں ستاروں کی رنگد رنگ پہنچ جانے کی تمنا کر بٹھا تھا۔ خود اپنے ہی حالات

سے کون واقف نہیں ہوتا؟

میری راہ میں مجبوری کی جو ایک دیوار حائل ہے اس پر سے ایک لمحے کے

لئے بھی تو میری نگاہیں نہیں ہٹیں لیکن پھر بھی یہ سب کچھ ہو گیا۔

میں اپنے جذبات و احساسات کے سامنے بالکل بے بس ہو کر رہ گیا۔

آپ نے کبھی کسی کو نہیں چاہا۔

اس لئے آپ شاید اس بات کو نہ سمجھ سکیں کہ —

دل کے جذبات راہ کی رکاوٹوں کے غلام نہیں ہوا کرتے۔

ہمارے احساسات کسی مجبوری کی دیوار کو ذرا بھی تو اہمیت نہیں دیتے۔

چاہت اور محبت کس قدر غیر اختیار سی جذبات ہیں۔

آپ کو اس کا اندازہ ہے؟

چلکے سے آپ کو اندر لے آئے۔

اور مجھے معلوم بھی ہوا تو اس وقت —
جب آپ کی واپسی کی ہر راہ بند ہو چکی تھی۔
آپ ہی کہئے۔

اور انصاف سے کہئے —

میں پھر بھی قصور دار ہوں؟
مجھے اعتراف ہے کہ آپ مجھے پہلے روز ہی ابھی لگیں —
بنے حد ابھی لگیں

ابھی چیزیں

ابھی بانیں

اور اچھے لوگ سبھی کو پسند آتے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا نا کہ —

ہم ہر اچھی چیز پر قبضہ کر کے بیٹھ جائیں۔

یا ہر اچھی ہستی کو اپنا بنالیں

زندگی میں بہت سے اچھے لوگ ہمیں ملتے ہیں۔

پسند آتے ہیں۔

لیکن ہم انہیں اپنا تو نہیں بنا لیتے؟

آپ کے لئے بھی میں نے یہ نہیں چاہا تھا کہ میں آپ کو اپنا بنالوں۔

لیکن یہ دل — اور اس کی ضدیں۔

ہم جان بوجھ کر کبھی کسی سے محبت نہیں کرتے۔

ہم یہ کبھی نہیں سوچے کہ یہ جو ہستی اچانک ہمارے سامنے آگئی ہے۔

اسے چاہنا چاہیئے۔

سیح کہئے —

کیا حقیقت یہ نہیں ہے؟

اگر حقیقت یہی ہے تو پھر —

یقین کیجئے عفت!

میرے قدم خود بخود آپ کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

کاش! آپ جان سکتیں کہ —

میں نے کتنا چاہا

کس قدر کوشش کی۔

کہ آپ کے خیالوں کو اپنے دماغ میں بالکل نہ بیٹھ دوں۔

اپنی سوچوں کو آپ کی خاطر پریشان نہ کروں۔

ہر وہ راستہ — جو آپ کو میرے دل تک پہنچا سکتا تھا۔

میں نے بڑی مضبوطی سے بند کر لیا۔

مگر —

یہ میں کے چور دروازے۔

جلانے کب؟

جانے کیسے؟

آپ کو کیسے بتاؤں؟

میں نے کس کس طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی؟

میں نے کس کس طرح اسے ہملانے کی کوشش کی؟

مگر پھر بھی میں شکست کھا گیا۔

اور اگر انا بھی نہیں چاہتا۔

مجھے اندازہ ہے کہ اس انکشاف کے بعد آپ کے دل و دماغ کی کیا
ت ہوگی مگر حقیقت پر پردہ ڈالے رکھنا مجھے منظور نہیں تھا۔ اب از سر نو
رکنا آپ کے اختیار میں ہے۔ میں منتظر ہوں گا۔

شہاب احمد۔

عفت نے شہاب احمد کے گزشتہ خط کی طرح اس خط کو پھاڑ کر
دیکھا تو کمری میں نہیں ڈالا۔ خط کو لفافے میں لکھ کر اس نے ہینڈ بیگ
ڈال دیا اور سامنے پڑے ہوئے پیپر پر آڑی نہ بھی لکھیں بناتے ہوئے
شہاب احمد کے بارے میں سوچنے لگی۔ ان کے بارے میں اس نے پہلے
بہت دفعہ سوچا تھا لیکن آج اس کی سوچوں کا انداز بالکل دوسرا تھا۔
اب احمد ایک نئے انداز سے اس کے سامنے آئے تھے۔

شہاب احمد کے خط نے اس کے پرسکون ذہن کو منتشر کر کے رکھ دیا تھا۔
اسے اپنے دماغ پر ہتھوڑے سے برستے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

دل منوں بوجھ تلے دیا ہوا غسوس ہو رہا تھا۔

شہاب احمد کے بارے میں از سر نو فیصلہ کرنا اسے بے حد دشوار معلوم
رہا تھا۔

اور اب۔۔۔ جب کہ آپ نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد زندگی کا یہ ٹیل
میرے ساتھ طے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں آپ سے یہ بات چھپانا کسی
طرح بھی مناسب نہیں سمجھتا کہ میرے پاس میری پہلی بیوی کی امیتیں بھی ہیں۔
منصور اور ثوبہ۔۔۔!

یہ دونوں بچے اپنی کسی پھوپھی، کسی خالہ یا نانی کے ساتھ بھی رہ سکتے ہیں۔
اور مجھے دوسری شادی کا مشورہ دینے والے اس بات پر اصرار بھی کرتے
ہیں۔ لیکن خود ذاتی طور پر مجھے یہ بات ناپسند ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ان کی ماں کو
خدا نے ان سے چھین لیا۔ وہاں میں بے بس تھا، کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن
باپ کی شفقت و محبت سے انہیں محروم نہیں ہونا چاہیے۔ میرے ساتھ رہنا
اور میری توجہ اور محبت حاصل کرنا ان کا حق ہے، انہیں ان کے حق سے کیوں
محروم کیا جلتے؟ عجب میں بہت سی خامیاں ہوں گی، ممکن ہے میں ایک اچھا
انسان نہ ہوں لیکن میں ایک اچھا باپ بننے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔

اب آپ سے مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ میں منصور اور ثوبہ کے ساتھ
آپ کے لئے قابل قبول ہوں یا نہیں؟

ہر انسان کے کچھ اصول ہوتے ہیں، کچھ فیصلے ہوتے ہیں۔ اولاد کے معاملے میں

جہلت و احساسات۔ سب کچھ اسی کے لئے وقف ہو کر رہ گئے۔
اپنے تو نجی ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں سے آگے بڑھنا تو مشکل
ہی۔

لیکن پیچھے پلٹ جانا اس سے بھی زیادہ دشوار مرحلہ ہے۔
آپ کو کیا معلوم؟

کس قدر وحشت ہو رہی ہے تجھے پیچھے پلٹ جانے کے خیال سے؟
مڑکے دیکھتی ہوں تو راستہ دھند لکوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔
لیکن اتنی سنگین دیوار کو اپنے سامنے دیکھ کر آگے قدم بڑھانے کا حوصلہ
نہیں ہوتا۔

کس قدر بے سکون کر دیا ہے آپ نے مجھے؟

مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکوں گی۔
عفت کے سامنے رکھا ہوا پلیپر دونوں طرف سے اڑی نہ تھی لکیروں سے
یہ اس نپے پلے کو مٹھی میں دبا کر موڑ دیا اور چند سیکنڈ تک اس کا کچھ مرنیاتی
پہرے سے باسکٹ میں ڈال کر کمرے کی پشت سے مڑکا دیا۔ انتہائی سبز آنکھوں
اس نے میز پر بکھری ہوئی ڈاک اور مضامین کے مسودوں کی طرف دیکھا۔
بڑا کام اس کی توجہ کے منتظر تھے لیکن اس کا ذرا بھی دل نہ چاہا کہ وہ کسی کام کو
لگائے۔ دماغ اس قدر بوجھل ہو رہا تھا کہ بے اختیار میز پر میٹریک کر آگئیں
برائے کو دل چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ دفتر تھا اس کا گھر نہیں تھا۔ اس نے گرم گرم
ننگو اکہ پی اور لپٹی دل محنت سے کام کرنے کی کوشش کی شام تک بڑی

ان کا خط پڑھ کر وہ بہم تو ذرا بھی نہیں ہوئی۔
لیکن اپنی سوچوں کو الجھنے سے بھی نہ روک سکی۔

اسے یہ خیال ضرور آیا کہ شہاب احمد یہ بات اسے پہلے بھی بتا سکتے
تھے۔

اس نے دل ہی دل میں کہا۔

شہاب احمد! یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا کہ پہلے تو ہر ممکن کوشش کر کے
میرے دل و دماغ پر اثر انداز ہو گئے۔

جب میرے دل و دماغ اس بات پر متفق ہو گئے کہ میں آپ کی
اور آپ میری منزل ہیں تو آپ نے نئے سرے سے فیصلہ کرنے کا حکم
صادر کر دیا۔

آپ کا اسٹیٹس، آپ کی بے پناہ دولت اور آپ کا ماحول تو پہلے ہی
ہماری راہ میں بہت بڑی رکاوٹیں بنے ہوئے تھے۔

اور اب یہ ایک اور دیوار

ایک اور رکاوٹ

میں کس کس رکاوٹ کو نظر انداز کئے جاؤں؟

میں بھی انسان ہوں شہاب احمد!

جیت تک کسی کو نہیں چاہا تو نہیں چاہا

لیکن جب بہت سوچنے سمجھنے کے بعد کسی کو اپنی منزل ہی تصور کر لیا

تو پھر

عفت خاموش رہی۔

”عفت پلیز! انکار نہ کیجئے گا، شہاب احمد کی آواز میں التجا تھی۔

عفت نے کچھ الجھے الجھے انداز سے کہا۔

”ٹھیک ہے، آجائے“

”ٹھینک یو! میں بس ابھی آ رہا ہوں“

عفت نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

پھر عفت کو بہت زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شہاب احمد آگئے۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے انہوں نے بھرپور ننگا ہوں سے عفت کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ ی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شہاب احمد اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر میز پر رہی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگے۔

پھر انہوں نے دوبارہ عفت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”میرا خط مل گیا آپ کو؟“

”جی ہاں!“

”کچھ ناراض معلوم ہوتی ہیں آپ“

”قطعاً نہیں“

”واقعی!؟“ انہوں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”یقیناً کیوں نہیں آتا آپ کو؟“

مشکل سے اس نے اپنا تھوڑا سا کام نمٹایا اور تھکے ہوئے دماغ کے ساتھ گھر چل دی۔ دو روز اسی طرح گزر گئے۔ وہ اپنے دل و دماغ کی کیفیت کو دوسروں سے چھپانے ہوئے اپنے کاموں میں لگی رہی۔ اپنے دل کا دکھڑا خود دوسروں کے سامنے رونا اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی ساری داستان سے سعدیہ باجی واقف تھیں یا نہ تھیں۔ ان دونوں سے اگر ملاقات ہوتی اور وہ خود پوچھتیں تو وہ بتا بھی دیتی۔

پھر تیسرے روز شہاب احمد نے اسے آفس میں ٹیلیفون کیا۔ وہ اس سے ملنا چاہتے تھے وہ خود بھی ان سے بات کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آتا تھا، وہ ان سے کہاں لے؟ اپنی ذہنی الجھن کو کم کرنے کی خاطر ان سے ملنا بھی ضروری تھا۔

اس نے سوچا۔

کیا وہ محض اپنی ذہنی الجھن کو دور کرنے کی خاطر اپنا ایک اصول توڑ دے؟

وہ شہاب احمد کو اپنے آفس میں بلا لے؟

وہ ریسورٹ محلے میں تھا۔ کھڑی تھی اور دوسری طرف شہاب احمد نے

شاید تیسری بار یہ جملہ کہا تھا۔

”عفت! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں“

وہ اپنا اصول توڑنے یا نہ توڑنے کا فیصلہ بھی نہ کر پاتی تھی کہ شہاب احمد

نے کہا۔

”اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کے آفس آ جاؤں؟“

شہاب احمد سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

چند منٹ تک دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے رہے۔

پھر عفت نے پوچھا۔

”آپ کس لئے چاتے منگوواؤں یا ٹنڈا؟“

”کچھ بھی مجی نہیں۔“

”کیوں؟“

”میں یہاں کچھ پینے کے لئے نہیں آیا۔“

”یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔“

”آپ سے باتیں کرنے آیا ہوں۔“

”تو باتیں کیجئے۔“

”آپ کچھ نہیں کہیں گی؟“

”کس سلسلے میں؟“

”سلسلہ — سلسلہ تو آپ بھی جانتی ہیں۔“

عفت نے کمر سی کی پشت سے سرٹکا کر ان کی طرف دیکھا اور مدغم آواز

میں بولی۔

”میں کیا کہوں شہاب صاحب؟“

”کچھ تو کہئے۔“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

شہاب احمد نے ایک طویل سانس لے کر اس کی طرف دیکھا اور بولے۔

”آپ نے اس مسئلے پر سوچا تو ہوگا؟“

”جیب سے آپ کا خط ملا ہے مسلسل سوچ رہی رہی ہوں۔“

”آپ کا دل کیا کہتا ہے؟“

”در اصل معاملہ اس قدر الجھ گیا ہے کہ دل اور دماغ دونوں ہی کوئی فیصلہ

نے ہونے لگے رہے ہیں۔“

”کوئی آواز تو آتی ہوگی آپ کے دل سے؟“

”جی ہاں! آواز تو بے شک آتی ہے۔“

”کیا؟“

”یہی کہ زندگی کے اتنے اہم فیصلے غصہ جذبات کی رو میں بہہ کر اور آنکھیں

لکے نہیں کئے جاسکتے۔“

شہاب احمد خاموش بیٹھے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

”حال کو مستقبل سے جدا نہیں کیا جاسکتا شہاب صاحب!“

”ہولے۔“

”جو قدم میں آج اٹھاؤں گی اس کا اثر مستقبل پر تو پڑے گا نا؟“

”جی! یقیناً۔“

”تو پھر آپ خود ہی سوچئے، اتنی دشوار گزار راہ کی طرف بڑھنے سے

میرے دل و دماغ میں کس قدر شدید جنگ جاری ہوگی۔“

شہاب احمد نے اس سے اجازت لے کر سگریٹ سلگایا اور گہری سوچ

پڑوب لگے۔

عفت نے دیکھا۔ شہاب احمد کے چہرے پر تاریک سادھواں اُمتد

عت نے چائے منگو آئی تو شہاب احمد نے کہا۔

”اس خاطر تو واضح ہو گیا فائدہ؟“

”کیوں؟“ عفت بے ساختہ ہنس پڑی۔

پائے کے دوران دونوں خاموش ہی رہے۔

پھر عفت نے پوچھا۔

”ایک بات بتائیں گے آپ؟“

”پوچھئے۔“

”جس حقیقت کا انکشاف آپ نے اب کیا ہے اس پر پہلے کیوں پردہ ڈالے

؟“

”آپ نے کوئی آس، کوئی اُمید تو بندھائی نہیں تھی۔“

”اچھا یہ تو ٹھیک ہے لیکن.....“

”جب کوئی آس ہی نہیں تھا تو پھر اپنے گھریلو حالات دوسرے شخص کو بتانا

”وہ تھا۔“

”آپ کی منطق میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”ثابت آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ اس معاملے میں، میں آپ کو تیار ہی میں رکھنا

”اچھا۔“

”نہیں۔“

عفت نے ہلکے سے ہنسنے کے ساتھ کہا۔

”اور پھر بقول آپ کے میرے دل میں تو چاہت اور محبت جیسے جذبات

”بھی نہیں۔“

”جی ہاں! شہاب احمد قدرے چونکے۔

”جی ہاں! اگر اس طرف بھی چاہت اور محبت والا معاملہ ہوتا تو شاید میں

بھی آنکھیں بند کر کے ہر صورت میں آپ کا ساتھ قبول کر لیتی۔“

شہاب احمد زیر لب مسکرائے اور بولے۔

”بقول میرے۔ آپ اپنی بات کیجئے اور سچ سچ بتائیے، آپ کے

دل میں میرے لئے اس قسم کے جذبات ہیں؟“

”میں نہ تو ارکروں گی نہ انکار۔“

”کیوں؟“

”میرا خیال ہے وقت ہی ہمارے جذبات و احساسات کی بہترین نگاش

”کہہ سکتا ہے۔“

”زبان سے کہہ دینے میں کیا حرج ہے؟“

”اب تو اظہار کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”صورت حال بالکل مختلف ہے، از سر نو فیصلہ کرنا ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”کیوں نہیں پڑتا؟ ممکن ہے اب میرا جواب، انکار میں ہو۔“

”اگر آپ کو تاریکی میں کھنا چاہتا تو اب بھی نہ بتاتا۔“

”کتنی عمر میں ہیں آپ کے بچوں کی؟“

”منصور یا پنج سال کا ہے اور ٹو بیہ تین سال کی“

”اور آپ کی بیگم صاحبہ کب فوت ہوتی تھیں؟“

”ڈھائی سال قبل۔“

”کوئی حادثہ ہوا تھا؟“

”نہیں“

”کچھ بیمار تھیں؟“

”جی“

”آپ کو شادی کا خیال اب کیوں آیا؟“

”جی!!“ شہاب احمد چونکے۔

”اب سے پہلے آپ کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔“

”شادی کرنے کا ارادہ ہی نہیں تھا میرا۔“

”کیوں؟“

”بس! دل ہی نہیں چاہا۔“

”تو اب بھی نہ کیجئے، بعض لوگ تو اپنی اولاد کی خاطر ساری عمر بیوی گزار دیا کرتے۔“

”ہیے۔“

شہاب احمد نے اس کی طرف بڑی گہری نگاہوں سے دیکھا۔

”مجھے یقین ہے آپ کے بچوں کی پرورش بہت مزے میں ہو رہی ہوگی۔“

”لیکن میں اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرتا ہوں۔“

”بچوں کی موجودگی میں بھی؟“

”جی ہاں“

”حیرت ہے“

”حیرت کی کیا بات ہے؟“

”اب دیکھئے نا۔۔۔۔۔“

”عفت صاحبہ! ہر شخص کی اپنی الگ حیثیت اور الگ مقام ہوتا ہے۔“

”جی؟“

”جی ہاں! بچے ہمدرد و غمگسار نہیں ہو سکتے اور پھرتے چھوٹے بچے؟“

عفت خاموش رہی۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی ہو جسے میں اپنے دل کی باتیں سنا سکوں۔“

”س کی سن سکوں۔“ شہاب احمد نے کہا۔

”ہوں، عفت پلکیں جھپکائے بغیر چند سیکنڈ تک ان کی طرف دیکھتی

ہی۔ پھر کچھ تنکھے لہجے میں بولی۔

”آپ کا حلقہ احباب تو یقیناً وسیع ہوگا۔“

”جی! اتفاق سے“

”خواتین کی کمی تو نہیں ہوگی ان میں“

”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

”میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ نظر انتخاب مجھ ہی پر کیوں پڑی؟“

”دل ہی تو ہے جسے چاہے پسند کر لے“

”اچھا چلیے، آپ کی بات ماننے لیتی ہوں۔“

”عنایت ہے آپ کی۔“

”آپ نے کبھی ان الجھنوں کے بارے میں بھی سوچا؟“

”کون سی الجھنوں کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟“

”جن سے آئندہ زندگی میں میرا اور آپ کا سابقہ پڑنے کا امکان ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”دیکھئے شہاب صاحب! آپ کے بچے ابھی چھوٹے اور نا سمجھ ہیں لیکن بڑے ہونے پر وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کریں گے کہ میں ان کے لئے کیا ہوں۔“

”میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوگا۔“

”محض آپ کے کہہ دینے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔“

شہاب احمد سوچ میں ڈوب گئے۔

عفت نے کہا۔

”بچوں کو ورغلائے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔“

”میں آپ کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا ہوں لیکن حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔“

”مجھ میں شاید یہ صلاحیت نہیں ہے۔“

شہاب احمد جانے کیا سوچ کر مسکرا دیئے۔

عفت تے پوچھا۔

”آپ کے ساتھ اور کون کون رہتا ہے؟“

”میری والدہ۔“

”بائی بہن بجاتی؟“

”سب اپنے اپنے گھروں کے ہیں، بھجائی بیرون ملک رہتے ہیں۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ عرصے انتظار کریں؟“

”کس بات کا انتظار؟“

”ممکن ہے اس دوران آپ کو کوئی اور لڑکی پسند آجائے۔“

شہاب احمد نے بہت گہری نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور بولے۔

”بولڈ کی پسند آئی تھی اچھکی۔“

”پسند بدل بھی تو سکتی ہے؟“

شہاب احمد اس کا جملہ سن کر چونکے پھر ایک دم سنبھل کر بولے۔

”آپ اپنا دامن بچانا چاہتی ہیں؟“

عفت نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

”جی ہاں! سچی بات یہی ہے کہ اس دشوار گزار راستے پر چلنا بڑی ہمت

آہے اور میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتی۔“

شہاب احمد نے ایک طویل سانس لی۔

عفت نے کہا۔

”یہ تو آپ مامیں گے نا! کہ اس راہ پر چلنے کے لئے محنت اور چاہت سے

فہم کہہ لیں۔ بہر حال انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

م سے کم میں تو انہیں نظر انداز نہیں کر سکتی، زندگی بڑی قیمتی شے ہے، ایک ملا کرتی ہے، اسے گزارنے کے لئے میں آنکھیں بند کر کے کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔“

شہاب احمد کچھ دیر خاموش بیٹھ کر رہے پھر ایک دم جانے کے لئے اٹھ گئے۔
 چھا! اب اجازت چاہوں گا!
 چھا! خدا حافظ،
 خدا حافظ،

شہاب احمد کو عفت کے آفس آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا عفت نہیں انکار میں جواب دے تو دیا تھا لیکن جانے کیا بات تھی وہ اپنے دل و پر بہت بوجھ محسوس کر رہی تھی۔

اس کا ذہن کسی وقت بھی سوچوں سے خالی نہیں رہتا تھا۔

اور پھر —

سوچیں بھی اتنی الجھی

استقدر پریشان

وہ پیچھے پلٹ کر دیکھتی تھی تو اسے احساس ہوتا تھا۔

زندگی میں ایسے لمحے اس پر کبھی نہیں آتے تھے۔

اس کے خیالوں کو اس طرح تو کسی نے بھی منتشر نہیں کیا تھا۔

مگر وہ ایک شخص —

قطع نظر انبار اور خلوص کے جذبات کی بھی ضرورت ہے؟“
 شہاب احمد نے آہستہ سے سر ہلایا۔

”بس تو پھر یہ سمجھ لیجئے کہ میرے پاس ان جذبات کی کمی ہے“
 ”میں نہیں مانتا یہ بات“

”اپنی ذات کی خوبیوں اور خامیوں کو میں آپ سے بہتر سمجھی ہوں۔“
 شہاب احمد شنایا لا جواب ہو کر رہ گئے تھے۔ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگے۔
 عفت نے کہا۔

”زبان سے کچھ کہہ دینا بڑا آسان ہوتا ہے لیکن اس پر عمل کرنا بہت دشوار۔“

شہاب احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”میں اگر ابھی ہر اس بات کی حافی بھریوں جس سے آپ غوش ہو سکتے ہیں لیکن

بعد میں میرا عمل اس کے بالکل برعکس ہو پھرے...؟“

شہاب احمد نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں نہ آپ کے ساتھ انصاف کر سکوں نہ آپ کے بچوں کے ساتھ اور

باقی ماندہ ساری عمر ایک گناہگار کی طرح گزار دوں تو اس سے کیا فائدہ؟“

شہاب احمد پھر بھی خاموش رہے۔ وہ کہہ بھی کیا سکتے تھے؟ عفت کی

ہر بات حقیقت سے قریب تھی۔

عفت نے کہا۔

”آپ چاہیں تو انہیں مستقبل کے اندیشے کہہ لیں یا آنے والی زندگی کے

کیوں؟“

”تم انہیں جواب دے تو چکی ہو،“

”کیا تجھے یہ جواب نہیں دینا چاہیے تھا؟“

”تم نے انہیں بالکل صحیح جواب دیا،“

پھر سعیدہ باجی نے پوچھا۔

”تم اپنے جواب سے مطمئن نہیں ہو؟“

عفت نے سوچوں میں ڈوب کر کہا۔

”بڑی عجیب سی بات ہے سعیدہ باجی“

”کیا عجیب بات ہے؟“

”جب میں نے انہیں جواب اثبات میں دیا تھا تو میں اپنے آپ کو بالکل

بلکا غسوس کر رہی تھی۔“

”اور اب؟“

”اب جانے کیوں دل و دماغ پر بہت بوچھ غسوس کر رہی ہوں۔“

”بوچھ غسوس کرنے کی کیا بات ہے؟“

”بس! ہے نا!“

”بھئی میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتی“

عفت خاموش رہی۔

”ایک طرف تو تم یہ کہتی ہو کہ زندگی بڑی قیمتی شے ہے، اسے گزارنے کے

”انکھیں بند کر کے کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔“

شہاب احمد—

کس طرح اس کے اوپر نثر انداز ہو گیا تھا۔

”انکھوں میں اسی کی شبیہ صبح کے روشن ستارے کی مانند جھلکتی

رہتی تھی۔“

دل میں اس کی یاد روشن کرنے کی مانند چمکتی رہتی تھی۔

اس نے بہت چاہا—

شہاب احمد کی تصویر کے نقش اس کی نگاہوں میں نہ سمایا—

ان کی یاد کی پرچھائیں اپنے دل پر پڑنے دے۔

ان کی باتوں کی گونج سے اپنے دماغ کو آواز دکر لے

لیکن یہ سب کچھ اس کے اختیار سے باہر ہو چکا تھا۔

پھر ایک روز سعیدہ باجی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ سعیدہ باجی جب بھی اس

سے ملتی تھیں شہاب احمد کو ضرور موضوع بحث بناتی تھیں۔

اس دفعہ بھی ان کا ذکر آیا تو عفت نے سعیدہ باجی کو ساری روداد سنائی

سعیدہ باجی کے چہرے پر بے پناہ حیرت تھی۔

اور انکھوں میں بڑی گہری سوچیں اُمنڈ آئی تھیں۔

عفت نے ان کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”اب آپ مجھے کیا مشورہ دیں گی؟“

سعیدہ باجی بولیں۔

”اب تمہیں کوئی مشورہ دینے کی کیا ضرورت ہے؟“

”چلو، خود غرضی ہی سہی! لیکن تم اب شہاب احمد کو بھول جاؤ۔“

”بھول جاؤں؟“ عفت بڑے عجیب انداز سے مسکراتی۔

”ہاں بالکل، تمہارے لئے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے چانک آسمان سے برس پڑے ہیں رشتے۔“

”یہی سمجھ لو، آخر تم میں کس بات کی کمی ہے؟“

عفت ایک دم ہنس پڑی۔

”منسنے کی کیا بات ہے؟ میں کوئی غلط بات کہہ رہی ہوں؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔“

”اور کیا! تم تعلیم یافتہ ہو، ادیبہ ہو، اگر خوبصورت نہیں تو پرکشش تو ضرور

در۔“

”آپ کی بہن ہوں نا! آپ کو مجھ میں کوئی خامی کیسے نظر آسکتی ہے؟“

”اپنی اور پرانی بہن کی بات نہیں ہے، میں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔“

”اچھا ان رشتوں کے بارے میں بھی تو بتاتے جو میرے لئے آسمان سے

سے ہیں۔“

”تم مذاق سمجھ رہی ہو؟ دور رشتے تو اشفاق نے بتاتے ہیں، ان میں سے

ب تو بالکل طے ہی سمجھو۔“

”اور؟“

”ایک رشتے کا ذکر بڑی آپا کر رہی تھیں۔“

”وہ کون ذات شریف ہیں؟“

”ہاں۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے جذبات کی رو میں بہہ کر فیصلہ نہیں کیا اور حقائق کو

نظر انداز نہیں کیا۔“

”پتہ نہیں کیا بات ہے باجی! ایک آواز ہے جو مجھے پریشان کہتی رہتی ہے۔“

”کیسی آواز؟“

”شاید میرے اندک کی آواز۔“

”سعدیہ باجی پلکیں سچے کاتے بغیر اس کی طرف دیکھتی رہیں۔“

”مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ.....“

”ہاں، ہاں، اکو۔“

”کیا ہم صرف اپنے لئے جیتے ہیں؟ ہمارا وجود صرف اپنے لئے ہے؟“

”حماقت کی باتیں نہ کرو۔“

”نہیں سعدیہ باجی! ذرا دیر کو اگر ہم خود غرض بن کر نہ سوچیں تو.....“

”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔“

”کمال ہے پہلے تو آپ کہتی تھیں کہ شہاب احمد کے بارے میں سوچو،

اتنا اچھا رشتہ ہے اور.....“

”ٹھیک ہے، میں نے یہ سب کچھ کہا تھا لیکن اس وقت ہمیں ان کے بارے

میں یہ تمام باتیں نہیں معلوم تھیں۔“

”یہی تو میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ صرف اپنی خوشیوں

کو دیکھ کر کوئی فیصلہ نہ ناسر اسر خود غرضی ہے۔“

”ان کی سسرال میں سے ہی ہیں کوئی“

”کیا کہتے ہیں؟“

”کسی ننگ میں بیخبر ہیں“

”اور وہ صاحب جن سے بقول آپ کے میرا رشتہ تقریباً طے ہی ہو چکا ہے“

”وہ کیا کہتے ہیں؟“

”وہ آدمی میں ہیں بیخبر ہیں“

”ہوں،“ عفت ایک طویل سانس لے کر جانے کیا سوچنے لگی۔

”سعدیہ باجی نے پوچھا۔

”کیا سوچنے لگیں تم؟“

”کوئی خاص بات نہیں“

”سب کچھ سوچنا، بس اب شہاب احمد کے بارے میں نہ سوچنا“

”اچھا،“ عفت نے ہنس کر کہا۔

”اور سعدیہ باجی نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

”سعدیہ باجی سے ملاقات کے دوسرے ہی روز شہاب احمد نے پھر اسے

ٹیلیفون کیا۔ ان کی آواز سن کر عفت کے دل کی دھڑکن جلنے کیوں ایک دم تیز ہو گئی۔

”شہاب احمد بے حد انایت سے پوچھ رہے تھے۔

”ہیلو عفت! کیسی ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں“

”ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھئے“

”ہمدردی آخری ملاقات کے بعد سے اب تک آپ نے میرے بارے میں

”بار بھی نہیں سوچا؟“

”کیوں نہیں؟ بار بار سوچا،“

”بھید؟“

”میرا جواب اب بھی وہی ہے جو میں آپ کو اس دن دے چکی ہوں۔“

”کسی رد و بدل کی گنجائش نہیں؟“

”میرا خیال ہے نہیں“

”اچھا! جیسی آپ کی مرضی“

”شہاب احمد کی آواز کی شکستگی عفت سے پھپی نہ رہ سکی۔ اس نے کچھ اور کہنا

”نامناسب نہ سمجھا، چپ چاپ ٹیلیفون بند کر دیا۔

”پھر ایک روز مرین نے گاڑھی بھیج کر اسے بلوایا عفت نے غصہ کیا کہ وہ

”می سنجیدہ اور الجھی ہوتی سی تھی۔

”عفت نے پوچھا۔

”غیر مت تو ہے مہیں کیا پریشانی لاحق ہو گئی؟“

”بس! کچھ نہ پوچھو“

”پھر بھی پتہ تو چلے۔“

”اس پریشانی کا سلسلہ ہماری ہی ذات سے جاکر ملتا ہے“ مرین قدرے

”اچھا! کچھ تفصیل بھی تو بتاؤ“

”تفصیل یہ ہے کہ شہاب احمد کے بارے میں جو رپورٹ ملی ہے وہ بڑی

پریشان کن ہے“

”عفت اس کی پریشانی سے غفلت ہو کر بولی۔

”اچھا!۔“

”ہاں! مہروز نے معلومات کیں تو پتہ چلا کہ وہ تو دو عدد پچھلے کے باپ ہیں“

”واقعی!۔“ عفت نے مزید حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں! ان کی بیگم صاحبہ فوت ہو چکی ہیں“

”عفت اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکی۔

”مہرین نے پوچھا۔

”تم مسکرا کیوں رہی ہو؟“

”اس لئے کہ ان ساری تفصیلات کا علم مجھے ہو چکا ہے“

”مہرین نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کب؟“

”کافی دن ہو گئے“

”تمہیں کس نے بتائیں یہ ساری باتیں؟“

”خود شہاب احمد نے“

”تو پھر تم نے ذکر کیوں نہیں کیا؟“

”تم سے ملاقات ہی نہیں ہوئی“

”تم مجھے ٹیلیفون کر سکتی تھیں، میرے پاس آ سکتی تھیں یا مجھے بلا سکتی تھیں“

”ہاں! مگر میں نے سوچا۔۔۔ اپنی پریشانی میں دوسرے کو شریک نہ کرنے

”مادرہ؟“

”کیا مطلب؟“

”میرا خیال یہ ہے کہ اپنی خوشیوں میں تو دوسروں کو بے شک شریک

بنا چاہتے ہیں لیکن اپنی الجھنوں اور پریشانیوں میں نہیں۔“

”مہرین نے ایک لمحے کو کچھ حیران نکا ہوں سے عفت کی طرف دیکھا اور

”کیا تم سچ مچ پریشان ہو؟“

”تمہارا کیا خیال ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“

”لیکن کیوں؟“

”کیوں کا کیا سوال ہے؟“

”میرا مطلب ہے تمہیں تو شہاب احمد سے ذرا سی بھی انسیت نہیں تھی۔“

”میرا خیال ہے تم اور سعید باجی میرے بارے میں بہت غلط انداز سے

”پتی ہو۔“

”مہرین سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”عفت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں بھی انسان ہوں، میرے سینے میں بھی دل ہے پتھر کا ٹکڑا نہیں“

” اچھا پھر؟“

” پھر یہ کہ پہلے تو تم اور سعدیہ باجی میرے پیچھے پڑی رہتی تھیں کہ شہاب احمد کے بارے میں سوچو، غور کرو، جب اچھی طرح ان کا خیال میرے دل و دماغ میں بیٹھا دیا تو اب سعدیہ باجی کا مشورہ ہے کہ ان کا نام بھی نہ لو۔“

” بالکل ٹھیک مشورہ دیا ہے انہوں نے“

” مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ تمہارا مشورہ ان کے مشورے سے مختلف نہیں ہوگا۔“

مہرین نے بے تابی سے کہا۔

” پہلے تو تم مجھے وہ ساری باتیں بتاؤ جو تمہارے اور شہاب احمد کے درمیان

ہوئیں“

” اچھا“

” ہاں! ذرا پتہ تو پہلے تم دونوں نے کہاں ملاقات کر لی اور کیا کیا باتیں کر

ڈالیں؟“

عفت چند سیکنڈ تک سوچتی رہی پھر اس نے مہرین کو تفصیل سے سب کچھ سنا دیا۔ وہ بڑی دلچسپی اور کچھ حیرانی سے یہ سب کچھ سنتی رہی۔ عفت خاموشی ہوئی تو مہرین نے کہا۔

” تم نے بالکل ٹھیک کیا عفت۔“

” میں نے ٹھیک کیا؟“

” ہاں! ایسے معاملوں میں جذباتی بن کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔“

” خوب“ عفت قدرے مسکراتی۔

” دیکھو نا! شہاب احمد میں سینکڑوں غویاں ہوں لیکن یہ ایک بات ایسی کہ وہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتے۔“

عفت صوفے کی پشت سے سر اٹکاتے چپ چاپ مہرین کی طرف دیکھتی ہی۔

مہرین نے کہا۔

” اگر معاملہ کچھ اس طرح ہوتا کہ وہ شادی شدہ ہوتے، بیوی فوت ہو گئی ہوتی لیکن بچے نہ ہوتے تب تو تھوڑی بہت سوچنے کی گنجائش باقی بھی رہتی“

عفت نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

” میں نے تقریباً ہر پہلو سے سوچ کر ہی انہیں یہ جواب دیا ہے۔“

” بس! تو پھر تم پریشان اور الجھی ہوئی کیوں ہو؟“

” مجھے خود نہیں معلوم“

” معلوم ہوتا ہے شہاب احمد کی محبت تمہارے دل و دماغ پر بہت زیادہ

ثر انداز ہو چکی ہے“

” لیکن اس کے باوجود میں نے جذباتی بن کر فیصلہ کرنے کی کوشش نہیں کی“

” تم نے بڑی عقلمندی کی ہے“

عفت خاموش رہی۔

” بس! اب تم شہاب احمد کو بھول جاؤ، تمہیں ایک سے ایک اچھا رشتہ

مل سکتا ہے“

عفت سر جھکاتے مسکراتی رہی۔

عفت مہرین کے گھر سے واپس آئی تو بڑی آیا اور توصیف بھائی آتے ہوئے تھے۔ اماں باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ فوزی بڑی آپا کے بیٹے کو ہلانے کے چکر میں خود بھی پتھر بن گئی تھی۔ توصیف بھائی، بھائی میاں کے ساتھ بیٹھے حالات حاضرہ پر تبصرہ کر رہے تھے۔ بڑی آیا اور فرخ بھائی آنگن میں بیٹھے جانے کس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ انداز کچھ لوک جھونک کا سا تھا۔

عفت کو دیکھ کر بڑی آپا نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں عفت؟ تمہیں ہمارے گھر آنے کی توفیق نہیں ہوتی“

فرخ بھائی عفت کی حمایت میں بولے۔

”کام کرتی ہے آپ کی طرح بیکار تو بیٹھی نہیں رہتی کہ جب دل چاہے، منہ اٹھا کر چل دے“

بڑی آپا چڑ کر بولیں۔

”اچھا! میں بیکار تو بیٹھی رہتی ہوں؟“

”اور کیا“

”کالچ میں دماغ کھانے میری بجائے تم جاتے ہو؟“

فرخ بھائی انہیں مزید جلانے کے لئے بولے۔

”کالچ جانا کون ساخت کا کام ہے“

”اگر تمہیں پڑھانا پڑتا تو معلوم ہوتا“

”یہی معلوم ہوتا نا اگر اس نوکری میں سوا کے عیش کے اور کچھ نہیں؟“

بڑی آپا چل کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ فرخ بھائی بولے۔

”اٹھ بچے جاتی ہیں، بارہ بچے واپس آجاتی ہیں۔ یہ عیش نہیں تو اور کیا ہے؟“

”میں سے کس نے کہہ دیا کہ بارہ بچے آتی ہوں؟“

فرخ بھائی سنی ان سنی کہتے ہوئے بولے۔

”ایک عفت بے چاری ہے، صبح کی گئی ہوئی شام کو گھر میں گھنٹی ہے“

بڑی آپا نے پھر کچھ کہنا چاہا تو فرخ بھائی بولے۔

”دماغ سوزی تو اس بے چاری کو کرنی پڑتی ہے“

بڑی آپا کمرے سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

”اچھا بابا! کرو اپنی چہیتی بہن کی حمایت“

فرخ بھائی مسکرا کر بولے۔

”میرے لئے تو آپ سبھی چہیتی بہنیں ہیں“

بڑی آپا باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے بولیں۔

”بس ابھی تو تم بخش ہی دو۔“

فرخ بھائی نے مخصوص انداز سے قہقہہ لگایا اور اندر چلے گئے۔ عفت اماں

ی آپا کے پاس باورچی خانے میں چلی آئی۔ رات کے کھانے کے بعد بڑی

وصیف بھائی چلے گئے۔ تو عفت آنگن میں بھی ہوتی بان کی کھڑی چار پائی

کی تھکن کے مارے اس کا برا حال تھا۔ اماں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی مہرین

نیریت پوچھتی رہیں پھر اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ مٹی وی پر شاید کوئی بڑا اچھا

تھا۔ سب بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ عفت نے قریب پڑی کرسی پر

ش اٹھا کر سرٹو نے رکھ لیا اور آسمان پر چمکتے ہوئے چاند پر نگاہیں جمائے ہوئے

ایک بہت پرانا گیت گنگنا نے لگی۔ ہوا کی لہروں پہ ڈولتی ہوئی اس کی مدھم آواز کبھی اونچی اور کبھی نیچی ہوتی رہی نیم کی شاخوں کے عقب سے جھانکتا ہوا۔ پیلا، گول، بڑا سا چاند سیاہی مائل نیلگوں آسمان پر چپکے جا رہا تھا۔ پورے چاند کی روشنی کے سامنے ستاروں کی روشنی ماند سی پڑ گئی تھی۔

چاند سے متعلق بچوں کے کئی کانوں کے بول اس کے دماغ کے پردوں سے ٹکرائے لگے۔

ہوا توں کے سنگ سنگ اڑتے ہوئے بادلوں کے سفید و سرمئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی نگاہوں کے سامنے دو چھوٹے چھوٹے بچے آ گئے۔ ان دیکھے بچے۔

جو شہاب احمد کے تھے۔

اور اس راہ میں ایک رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔

جو اسے شہاب احمد تک پہنچاتی تھی۔

اس نے سوچا۔

مزل تک جا کر ملپٹ آنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔

کتنی مشکلوں کے بعد میں نے اپنے دل و دماغ کو شہاب احمد کے ساتھ وابستہ کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

سوچوں کی کتنی طویل رگنڈ پر چلنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ۔

مجھے شہاب احمد کو اپنی منزل مان ہی لینا چاہیے۔

لیکن منزل جب دو، چار قدم کے فاصلے پر رہ گئی تو۔
یہ بچے راہ کی رکاوٹ بن گئے۔

وہ اپنی سوچوں پر پشیمان سی ہو گئی۔

اے! یہ میری ذہنیت کو کیا ہوا؟

وہ معصوم بچے۔

ماں کی مٹا اور پیار کو ترسے ہوئے نا سمجھ بچے۔

ان کے ننھے سے دلوں سے پھوٹے ہوئے محبت کے چہنچول کا رخ جس سمت درمزدور

ان معصوم ہستیوں کا وجود میرے فیصلے پر انداز ہو گیا؟

ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں درو کہہ کی ایک ایسی ٹیس ابھی جس کی

تس سے وہ پہلے کبھی آشنا نہیں ہوتی تھی۔

لیکن پھر۔۔۔ وہ بہت سی دشواریاں پہنکا رتے ہوئے ناگو کی مانند اس

نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔

زندگی کے وہ سارے حقائق بے حد تلخ انداز سے اس کے دماغ کو کھٹو کر

الکرائے بڑھ گئے۔

مستقبل میں جن کا سامنا کرنے کے امکانات بہت قوی تھے۔

مگر جانے کیا بات تھی؟

دل کے ایک گوشے سے رہ رہ کر ایک آواز ابھرتی تھی۔

اور اس کے دماغ کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی تھی۔

منا ہوتی تھیں، عفت اپنے بال سلجھاتی ہوتی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ کنگھا
میں پھنسا کر اس نے رسیور اٹھایا۔ دوسری طرف شہاب احمد تھے عفت
نازدہ سی رہ گئی۔ دو ایک سیکنڈ تک وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ شہاب احمد
نے وہ ناراض ہو گئی ہے۔

”مجھے معلوم ہے عفت! آپ ٹیلیفون کرنے پر ناراض ہو گئی ہیں“

انہوں نے پشیمان لہجے میں کہا۔

عفت پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”میں معافی چاہتا ہوں۔“

”معافی! عفت! ہم آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔“

”کبھی کبھی انسان کو اپنے جذبات پر ذرا بھی اختیار نہیں ہوتا!“

”ہولے“

”بس! اس وقت آپ مجھے بے حد یاد آرہی تھیں“

”اچھا! مگر اس یاد کا فائدہ؟“

”جاننا ہوں کوئی فائدہ نہیں“ وہ شکست خوردہ انداز میں بولے۔

”پھر؟“

”پھر؟ کچھ نہیں“

”اب تو آپ کو کچھ نہیں کہنا، میں ٹیلیفون بند کر دوں؟“

”کہنا ہے۔“

کیا ہم اپنے لئے جیتے ہیں؟

صرف اپنے لئے جیتے ہیں؟

زندگی صرف اپنی ہی ذات سے وابستہ خوشیوں کا نام ہے؟

یہ تو شاید زندگی کا صرف ایک ہی رخ ہے۔

ہم لوگ زندگی کے دوسرے رخ کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟

اپنی خوشیاں، اپنی مستنیں اور اپنا آرام ہمیں اس قدر عزیز کیوں ہے؟

اپنے خیالوں کی اونچی نیچی لہروں پر جیتی ہوئی وہ چپ چاپ آگے بڑھ

رہی تھی۔ تبھی فوزی نے آکر اسے چونکا دیا۔

”سو گئیں عفت! آج!“

”نہیں“ وہ ایک دم چونک گئی۔

فوزی نے کچھ شوخ ہو کر کہا۔

”اچھا! تو اختر شماری ہو رہی ہے“

عفت نے سوچا۔

”بہت چل نکلی ہے یہ لڑکی“

اس نے چار پائی سے اٹھتے ہوئے فوزی کی پشت پر ایک دھپ جمائی

اور کسٹن اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اگلے روز وہ آفس جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

گھر میں اس کے اور اماں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اماں باورچی خانے میں مڑن

تھیں۔ ویسے بھی اماں صرف اسی وقت ٹیلیفون رسیور کرتی تھیں۔ جب وہ گھر

”تو پھر کیئے“

”بات بہت بڑی ہے، سوچنا ہوں کہیں آپ برم نہ ہو جائیں۔“

”آپ کہتے، میں برم نہ ہونے کی کوشش کروں گی۔“

”سوچ لیجے، بہت بڑی بات کی توقع کر بیٹھا ہوں۔“

”میں آپ کی بات سننے کی منتظر ہوں“

”عفت!“

”جی“

”اپنے لئے تو سبھی زندہ رہتے ہیں، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ.....“

عفت ان کی ادھوری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن محض

ان کی زبان سے پوری بات سننے کی خاطر بولی۔

”آپ رک کیوں گئے؟ اپنی بات پوری تو کیجئے“

”مجھے معلوم ہے عفت! میری یہ خواہش سراسر خود غرضی پر مبنی ہے۔“

لیکن پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ اپنی زندگی میرے لئے.....“

شہاب احمد پھر ادھوری بات کہہ کر چپ ہو گئے۔

عفت نے پرسکون انداز سے کہا۔

”آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا کہ میں مستقبل میں پیش آنے والی دشواریوں

اور ان تمام مصیبتوں کے باوجود جن کا سامنا کرنے کے امکانات بے حد قوی ہیں

اپنی آئندہ زندگی کے تمام لمحات آپ کے نام کر دوں؟“

شہاب احمد خاموش رہے۔

عفت نے پوچھا۔

”میں صحیح سمجھی ہوں نا؟“

جی! آپ صحیح سمجھی ہیں لیکن یہ دشواریاں اور تلخیاں نہ ہونے کے برابر

ہیں۔“

آپ تو جذباتی بن کر سوچ رہے ہیں شہاب صاحب!،

نہیں عفت!“

آپ مان کر نہ دیں وہ الگ بات ہے ورنہ حقیقت یہی ہے“

میں تو اپنی خواہش کا رد عمل جاننا چاہتا ہوں، بتائیے، آپ کا جواب

ہے؟“

اس وقت تو مجھے دیر ہو رہی ہے، میں آفس جانے کی تیاری کر رہی تھی“

اگر اجازت ہو تو میں آپ کے آفس آجاؤں؟“

لب؟ آج؟“

”جی“

عفت دو ایک سیکنڈ کچے سوچتی رہی پھر بولی۔

”اگر روز آپ کا آفس آنا مناسب نہیں ہے“

”آج میں دوسری بار آؤں گا اور شاید آخری بار بھی“

عفت انہیں کوئی جواب نہ دے پائی۔ اس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ باورچی

کے سے اتار اسے پکار رہی تھیں۔

لو پھر کو شہاب احمد اس کے آفس چلے آئے۔ عفت نے انہیں اپنے سامنے

کھڑے دیکھا تو چند سیکنڈ تک وہ ان کے چہرے سے نگاہیں نہ ہٹا سکی۔
 بغیر اجازت چلے آنے پر پشیمان تھے۔ انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن
 ان کا چہرہ ان کے دلی جذبات کی تصویر بنا ہوا تھا۔ عفت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ
 بکھر گئی۔

عفت کو مسکراتے دیکھ کر انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہیٹھا جاؤں؟“

”اور اگر میں کہوں کہ واپس چلے جاتیے تو.....؟“

”میں واپس چلا جاؤں گا۔“

”کچھ کہے بغیر ہی؟“

”میں تو سب کچھ کہ چکا۔“

”پھر آنے کا سبب؟“

”جو کچھ کہ چکا اس کا جواب سننے کی خاطر“

”اچھا! ہیٹھا،“

”شکریہ“

”آپ چاہتے ہیں یا پسند کریں گے یا ٹھنڈا؟“

شہاب احمد کچھ برائیاں کہہ کر لوہے۔

”میں کچھ پینے نہیں آیا۔“

”مجھے معلوم ہے“

”آپ سے باتیں کرنے آیا ہوں“

”باتیں بھی ہوتی رہیں گی،“

عفت نے دوبارہ منگوائے۔

عفت ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اور اصل مقصد جس کی خاطر شہاب احمد

ہا کے پاس آئے تھے اس سے دامن بچاتی رہی۔ شہاب احمد نے تیسری دفعہ

دہائی کہہ دیا تو عفت ان سے نگاہیں ملائے بغیر بولی۔

”معلوم نہیں آپ یقین کریں گے یا نہیں؟“

”کس بات کا؟“

”جی ہاں کہ جو کچھ آپ نے آج کہا ہے، میں گزشتہ کئی دنوں سے اس بات پر

رک رہی تھی“

شہاب احمد کسی کی پشت سے سر ٹکاتے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

عفت نے بڑی متانت سے کہا۔

”دل کے کسی گوشے سے ابھرتی ہوتی یہ آواز رہ رہ کر مجھے اکساتی رہی ہے“

”میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کروں“

شہاب احمد کا چہرہ ایک دم چمک اٹھا۔

جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے۔

”عفت!،“

”جی ہاں! شہاب صاحب! آپ کو کیا خبر؟ کہ دل کی یہ آواز کس کس انداز

سے برائے نقاب کہہ رہی ہے؟“

شہاب احمد کے چہرے پر حیرانی اور مسرت کا بڑا عجیب امتزاج تھا۔

عفت نے کاغذ پر آؤسی تریجی لکیریں کھینچے ہوئے کہہ
”سچ تو ہے، ہر شخص صرف اپنے ہی بارے میں کیوں سوچتا ہے؟“

شہاب احمد نے کہا۔

”ہر ایک کا صرف اتنا بلند نہیں ہوتا۔“

”جب سے میں نے آپ کے سامنے انکار کیا ہے ان جملوں کی بازگشت میرا بچا
نہیں بھڑکتی کہ اپنے لئے تو سبھی جیتے ہیں۔ دوسروں کی خاطر بھی تو جی کر دیکھنا
چاہیے۔“

شہاب احمد والہانہ انداز سے اس کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

عفت کے چہرے پر کئی رنگ اکٹھے گزر گئے۔

کاغذ پر کھینچی ہوئی لکیروں کو اس نے مزید گرا کر تے ہوئے کہا۔

”تاہم آپ مجھے دو، ایک روز اور سوچنے دیجئے۔“

شہاب احمد نے زیر لب کہا۔

”دو، ایک روز اور؟“

”جی ہاں!“

”جانتا ہوں کہ انتظار کا یہ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن کر گزرے گا۔“

اور پھر یہ بھی دھڑکار ہے گا کہ انتظار ختم ہونے کے بعد کہیں مایوسی کا سا منانہ
کہنا پڑے۔“

پھر کچھ رک کر بولے۔

”لیکن ہر حال مجھے آپ کی بات منظور ہے۔“

عفت قدرے مسکرا کر بولی۔

”آپ ریکویں نہیں سوچتے کہ زندگی صرف ایک بار ہی ملتی ہے اسے داؤ پر
نے کے لئے بڑی محنت کی ضرورت ہے۔“

”آپ سچ کہتی ہیں“

چند منٹ تک دونوں اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے بیٹھے رہے پھر شہاب احمد
کہا۔

”اچھا اب میں اجازت چاہوں گا،“

”اچھی بات ہے، خدا حافظ“

”میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں گا“

عفت نے آہستہ سے سر ہلایا۔ شہاب احمد اس پر الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے
رہے گئے۔

اس رات اماں کے منع کرنے کے باوجود عفت کھلے آسمان کے نیچے تاروں کی

اؤں کے نیچے سوئی۔ گزشتہ راتوں کی طرح اس رات بھی اسے بہت دیر میں

راتی لیکن آنگن کی خاموش تنہائیوں میں چاند کو ڈھلتے ہوئے دیکھتے رہنا اسے

تا اچھا لگا، ایک کے بعد ایک جانے کتنے ستارے ڈوب گئے۔

دوسری رات بھی ایسا ہی ہوا۔

چاند کی نرم، ٹھنڈی کرنیں نیم کے گھنے پتوں سے پھن چکن کہ آنگن کے صاف

رے فرش پر بکھرتی رہیں۔

یہاں ہی مائل نیلگوں آسمان پر ستاروں کا قافلہ چپ چاپ آگے بڑھتا رہا۔

کھلی اور ادھ کھلی کلبوں کی البیلی سی ہمک ہواؤں کے سہارے ادھر سے ادھر
جھٹکتی رہی۔

اچھا تو سنئے،
لئے،

اور پھولوں کے سائے رات کے گزرنے کی مہم مدہم چا پ سنئے رہے۔
بنا آہٹ کے گرتی ہوئی شبنم میں عفت کا ستر بھیکتا رہا۔
صبح وہ سوکر اٹھی تو اماں اور بھائی میاں نے آنگن میں سونے پر اسے بہت
ڈانٹا۔ اماں نے وارننگ دے دی کہ آج رات اگر وہ آنگن میں سوئی تو اچھا نہ ہوگا۔
عفت سر جھکاتے سب کچھ سنتی رہی۔

لیوں؟

اسی شام — موقع پا کر اس نے شہاب احمد کو ٹیلیفون کیا ان کی بے تابی
ان کی آواز سے عیاں تھی۔

شہاب احمد نے کہا۔

”آپ کا جواب سننے سے پہلے ہی یہ دل دھڑک دھڑک کر بے قابو ہوا جا رہا
ہے۔“

عفت ان کی بات سن کر چند سیکنڈ کے لئے خاموش رہی۔

شہاب احمد نے بے چین ہو کر کہا۔

”ہیلو عفت! آپ میری آواز نہیں سن رہیں؟“

”سن رہی ہوں“

”تو پھر؟ آپ کچھ نہیں کہیں گی؟“

”ضرور کہوں گی“

”اب انتظار کی تاب نہیں کہہ دیجئے جو بھی کہتا ہے“

لے اور آگے بڑھنے کی اجازت ہے؟“

”جی“

پتا تو پھر میری اتنی آئیں گی کسی دن“

عفت نے اچھا کہہ کر فون بند کر دیا۔

دو تین روز بعد مہربان نے اس سے اس رشتے کے

یہ تو آنے والے وقت میں میرا طرز عمل ظاہر کرے گا کہ میں اچھی اور مہربان
نہیں۔“

یر لول کہتا ہے آپ ہمیشہ اتنی ہی مہربان رہیں گی“

پ بھی دعا کیجئے گا میں بھی دعا کرتی رہوں گی“

ب تو ہماری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے نا،

میں“

اور شہاب احمد کی اتنی بہت ساری راتوں کو بے خواب کمرتی؟ اپنے خیالوں
میں قدر نشتر کمرتی؟

ان لوگوں کو کیا معلوم کہ میں نے اپنی پچھلی تمام زندگی میں، کسی بھی معاملے کے
میں اتنا نہیں سوچا۔

سمجھا یا تو اسے جاتا ہے جس نے آنکھیں بند کر کے کوئی فیصلہ کیا ہو۔

میں — جو زندگی کے ہر معاملے میں اس قدر محتاط رہی ہوں۔

میرے بارے میں یہ لوگ اس انداز سے کیوں سوچ رہے ہیں۔

اپنی زندگی کے اہم ترین معاملے پر بغیر سوچے سمجھے کسی کو زبان کیسے دے
سکتی ہوں؟

گھر کا ہر فرد اپنی بساط بھرا سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہرین اور سعید
جہ نے تو اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر اب عفت کو لعنت ملا مت کہنا شروع

کر دیا تھا۔ فرح بھاتی الگ اس سے ناراض تھے۔ سب اس کی کم عقلی پر ماتم کر رہے
تھے۔ اس کے لئے اتنے اچھے اچھے رشتے موجود تھے اور وہ اپنی زندگی کے باقی

سارے لمحے شہاب احمد اور ان کے بچوں کے نام کر دینے کا تہیہ کئے بیٹھی تھی۔
یہ ٹھیک ہے کہ وہ باقی تینوں امیدوار شہاب احمد کی طرح دولت مند نہیں تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ تصویر کے دوسرے رخ کو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا
تھا۔ ان کے ساتھ شہاب احمد کی طرح کے جھگڑے کبھی نہیں تھے لیکن

کوئی بات بھی عفت کو اس کا فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکی۔
اس کی سہیلیوں میں سے شہلا اکثر آتی رہتی تھی۔ رخصت شدہ شادی کے بعد

بارے میں پوچھا جس کا ذکر اس نے عفت کے لئے کیا تھا۔ جب مہرین نے انہیں
اصل صورت حال بتائی تو اماں نے خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اچھا ہوا پہلے سے سلمیٰ تفصیل
معلوم ہو گئی۔ اماں تو اس بات پر بھی خوش تھیں کہ عفت نے شہاب احمد کے
لئے ہمیشہ انکار ہی کیا تھا، لیکن اس بات کی خبر نہ اماں کو تھی اور نہ سعید باجی اور
جہرین کو کہ عفت اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کر کے شہاب احمد کو اس سے آگاہ
بھی کر چکی تھی۔ سعید باجی اور جہرین یہ سوچ کر مطمئن تھیں کہ ان دونوں کے سمجھانے
کا اثر مہرین کے اوپر ضرور ہوا ہوگا لیکن جب شہاب احمد کی طرف سے بات آگے
بڑھی اور عفت نے سب کی توقع کے برعکس ان سے شادی کرنے پر رضامند
کا اظہار کیا تو چند لمحوں کے لئے مارے حیرت کے سب سوچ میں ڈوب گئے کسی
کو اس کی دماغی حالت درست نہ ہونے کا شبہ ہوا کسی کو یہ خیال ہوا کہ اس نے
محض جذبات کی رو میں بہہ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔

اماں اور بھاتی میاں حیران پریشان سوچ رہے تھے کہ ان کی ذہین، معاملہ
اور زمانے کے نشیب و فراز کو سمجھنے والی بیٹی نے یہ کیسا فیصلہ کیا ہے؟

پھر ہر شخص اسے سمجھانے پر کمر بستہ ہو گیا۔ اٹھتے بیٹھتے اس کے دل و دماغ
یہ بات مسلط کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ اسی نے سراسر احمقانہ فیصلہ
ہے، اس فیصلے سے اسے زندگی بھر کی پریشانیوں اور دشواریوں کے سوا اور
نہیں ملے گا۔ زندگی کے اتنے اہم فیصلے جذبات کی رو میں بہہ کر نہیں کئے جاتے۔

اس نے حیران ہو کر سوچا —

اے ایہ لوگ تجھے ایسا سمجھتے ہیں؟ تجھے اگر جذباتی بن کر فیصلہ کرنا ہوتا تو

سے معروف ہو گئی تھی، بہت کم آتی تھی، ویسے بھی وہ ان دنوں انگلینڈ جانے کے چکر میں لگی ہوئی تھی، رختندہ کے شو پر کادل وطن میں نہیں لگتا تھا وہ اسے ساتھ لے کر واپس انگلینڈ جانا چاہتا تھا۔ عرفانہ اور پروین سے بھی شاذ و نادر ہی ملاقات ہوتی تھی۔

انہی دنوں جب شہاب احمد کے ساتھ عفت کے رشتے کے سلسلے میں گھر کی فضا خاصی مکدر سی تھی۔ شہلا اور رختندہ اس سے ملنے آئیں۔ اماں عفت کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں کے سامنے اپنا دکھڑا رونے بیٹھ گئیں۔ انہیں شہاب احمد کے بارے میں بتا کر اماں نے کہا کہ وہی دونوں اپنی سہیلی کو نکالیں شہلا اور رختندہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بات خاصی پرانی ہو چکی تھی، اور اس قدر آگے بڑھ چکی تھی اس دوران کم سے کم دو تین دفعہ عفت سے ان لوگوں کی ملاقات بھی ہوئی تھی لیکن عفت نے انشائناً بھی ان لوگوں سے تذکرہ نہیں کیا تھا۔ عفت غسل کر کے آئی تو ان دونوں نے اچھی طرح اس کے لباس پر ہر کے اس کو صلو ا میں سنائیں۔ جس قدر لعن طعن کر سکتی تھیں کیا بات بات میں وہ ذہینان کا حوالہ دیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ آخر تم نے اس غریب کو کیوں ٹھکرایا؟ اس کا دل کیوں توڑا؟

پھر ان دونوں نے بڑی سنجیدگی اور خلوص سے عفت کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ شہاب احمد سے شادی کر کے اسے زندگی میں سوائے کچھ نیا تو اس کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ شہلا اور رختندہ شام تک عفت کے پاس رہیں چلتے چلتے انہوں نے عفت سے اس کا عندیہ معلوم کرنے کی

ش کی لیکن عفت کے ارادے میں ذرا سی بھی لچک پیدا نہیں ہوتی تھی۔ شہلا نے کہا۔

عفت! تم اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر رہی ہو، رختندہ نے جل کر شہاب احمد کو کوس ڈالا۔ جو خواہ مخواہ بیچ میں کو بیٹھے اس کی عزیز سہیلی کو چپکے چپکے روغلا کر اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو گئے۔

جب ہر شخص کی کوششیں رائیگاں گئیں تو اماں اور بھائی میاں کو اس کے فیصلے سے سر جھکاتے ہی بن پڑی۔

لیکن اماں مارے غصے کے یہ کہے بغیر نہ رہ سکیں کہ —

جب تمہاری سمجھ میں کسی کی بات نہیں آتی تو نہ سہی، کل کلاں کوئی افتاد تو خود ہی بھگتنا، ہمارے پاس دکھڑا رونے کے لئے نہ آنا، عفت سر جھکائے سنتی رہی۔

بھائی میاں نے ایک بار پھر اپنی کہی ہوئی بات دہرائی۔

شادی بیاہ اپنے برابر کے لوگوں میں کرنا ہی اچھا ہوتا ہے، شہاب احمد لوگوں کے یہاں مسائل بھی بہت الجھے ہوتے ہوتے ہیں“ عفت کا جھکا ہوا سر اوپر نہ اٹھ سکا۔

اماں نے کہا۔

اور ساری باتوں کو تو پھر بھی نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن وہ دو بچے تو اس کا عذاب بن کر رہ جائیں گے، مگر اس کی عقل میں کوئی بات ہی نہیں آتی“

عفت نے حیران ہو کر سوچا۔

”اے اماں یہ آپ ہیں؟ اتنی تنگ نظری کی توقع نہیں تھی مجھے آپ سے“

لیکن اس وقت عفت کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اولاد کے معاملے میں ماں باپ بے حد حساس اور جذباتی ہوتے ہیں۔

عفت کی شادی کی تاریخ طے ہوئی۔ رشتہ داروں کے کانوں تک بھی یہ خبر پہنچی۔ سب حیران تھے کہ اچھے بھلے رشتوں کو چھوڑ کر اس کی نظر انتخاب کہاں جا کر پھڑکی ہے، جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں بنائی جا رہی تھیں۔ کسی نے جل بھن کر کہا۔

”ہنہ خواہ مخواہ ہی ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے، سوائے اس رشتے کے اور کوئی رشتہ آیا ہی نہیں ہوگا“

کوئی ماں بے حسد کے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

”دولت دیکھ کر مر مٹی ہے لڑکی“

کسی نے کہا۔

”صاحبزادی کی اڑان بہت اونچی ہے، کہیں منہ سے بل ہی نہ گریں“

کسی کی زبان سے یہ سننے میں آیا۔

”بہت آزادی دے رکھی ہے۔ اماں باوا نے، جو کچھ بھی نہ ہو معذور ہے“

عفت نے سوچا۔

بھٹیک ہے، کہنے والے اپنے دل کی بھڑاس نکال دیں۔ اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں

شہاب احمد کی دولت پر کچھ گئی ہوں۔ تو یہی سہی، میرا دل اور ضمیر مطمئن ہے۔

ابھی کافی ہے، حقیقت کیا ہے، یہ میں دوسروں کو سمجھانا ضروری نہیں سمجھتی۔

نواس وقت بھی باتیں بناتے جب میں ذیشان سے شادی کر لیتی پھر یہ کہا

کہ۔

میں تو پہلے ہی معلوم تھا کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلے گا، اپنا بر تلاش کرنے کے ہی تو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا۔

مدیہ باجی کی شادیوں کے وقت نظر آیا تھا۔ خود بڑی آپا، چھوٹی آپا، سعدیہ اور مریم بھی کچھ کچھ بھیجی تھیں، ان کے ہتھکڑی تھے، ہنسی کچھ بے جاں فی اور سکرابٹیں بھیجی تھیں رشتے دار تھے وہ چہ میگوئیاں کرنے اور طنز کرنے، باز نہیں آ رہے تھے۔ شادی کے ہنگامے تو ایسے ہی تھے کا دینے والے ہوتے۔ اوپر سے یہ ساری باتیں، الجھنیں اور ذہنی کوفت — ان سب سے معرفت شہاب احمد تک پہنچی۔

وہ اس کی شب زفاف تھی۔ جملہ عروسی کو بے حد خوبصورتی سے آراستہ تھا۔ بھولوں اور خوشبوؤں کے عیون میں وہ تنہا بیٹھی شہاب احمد کی منتظر اس کا ذہن سوچوں کی رہگزدہ چلتے چلتے تنک گیا تھا۔ آرسی مصحف کے ن عزیز رشتہ دار عورتیں اور لڑکیاں شہاب احمد کو دیکھنے کے لئے ٹوڑی ہی تھیں گھونگھٹ اور سہرے کے پیچھے سے عفت کی نگاہیں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔

عفت نے سوچا —

دلہا کو دیکھنے کے لئے عورتیں اور لڑکیاں عموماً اسی قسم کے مظاہرے کیا کرتی ہیں ان لوگوں کی بے چینی کا ایک سبب اور بھی تھا۔ سبھی کو معلوم تھا۔ کہ اب احمد کی یہ پہلی شادی نہیں ہے اور وہ دو عہد بچپن کے باب ہیں شاید یہ جاننا چاہتی تھیں کہ بے پناہ دولت مند ہونے کے علاوہ شہاب احمد الٰہ کون سی خوبی ہے جس کی بنا پر عفت نے دو بچوں کا ہونے کے باوجود اب احمد کو قبول کر لیا۔

شہاب احمد سے شادی ہو جانے کے بعد عفت کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ شہاب احمد کی یہ پہلی شادی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی ان کے گھر والوں نے بڑے ارمانوں سے ان کی شادی کی اور خود شہاب احمد بے پناہ مسرور تھے بری کے کپڑے اور چڑھاوے کے زیور انہوں نے بڑی چاہت اور محبت سے خریدے تھے۔ شادی کی ساری رسمیں پوری کی گئیں۔ رخصتی کے وقت عفت کی نگاہ گھر والوں کے چہروں کی طرف جب بھی اٹھی اسے وہاں انجانے اندیشوں اور دوسوؤں کے سائے کا نینتہ کرز تے نظر آتے۔ اماں اور بھائی میاں ایک طرف اگر یہ سوچ کر مطمئن تھے کہ ایک اور بیٹی کو عفت کے ساتھ رخصت کیا تو دوسری طرف اس کے مستقبل کی طرف سے فکر مند بھی تھے عفت کو شادی کے تمام ہنگاموں کے دوران اماں، بھائی میاں اور فرخ بھائی کے چہروں پر وہ مسرت، وہ خوشی اور اطمینان نظر نہیں آیا جو بڑی آپا، چھوٹی آپا

گھونگھٹ اور سہرے کے ساتھ لہجے تو بے شک ہوتی ہے لیکن ایک فائدہ ہوتا ہے کہ اس کی ہوا سے اپنے سامنے آنے والے شخص کا جان نہ بڑی اچھی طرح لیا جاسکتا ہے آرسی مصحف کے وقت شہاب احمد پہلے سے ایسیج پر موجود تھے۔ عفت کی ہی تیاری میں کچھ زیادہ دیر ہو گئی تھی اس کا بناؤ سنگھار کرنے سے بعد میوٹیشن جب بھی تنقیدی نگاہ سے اس کا جائزہ لیتی اسے کوئی نہ کوئی کمی ضرور نظر آتی اس کا کام ختم ہوا تو کمرے میں موجود دو تین خواتین کو چند ضروری رسموں کا خیال آگیا۔ خدا خدا کر کے ان رسموں سے نجات ملی تو عفت کو ایسیج پر لے جایا گیا شہاب احمد سامنے ہی اپنی اُمّی اور بہنوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ عفت نے دیکھا وہ بے پناہ پرکشش اور پروتار لگ رہے تھے سچ تو یہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب و لگ رہے تھے۔ کم سے کم عفت کا یہی خیال تھا ان لمحوں میں بھی عفت کے ذہن میں یہ خیال آئے بغیر نہ رہ سکا۔

ارے! شہاب احمد! آپ کیا سوچ کر مجھے پسند کر بیٹھے ہیں؟

کہیں ایسا نہ ہو بعد میں آپ کو پچھنا نا پڑے! اور اس وقت بھی جملہ عروسی میں بیٹھی وہ مستقل سوچے جا رہی تھی۔ ہر آہٹ پر وہ چونک پڑتی تھی۔ خیالات منتشر ہو کر رہ جاتے تھے۔

شہاب احمد تھے کہ کسی طرح آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

اس نے ایک طویل جمائی لے کر وال کلاک کی طرف دیکھا اور تکیوں کے سہارے نیم دلائے ہونے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور شہاب احمد

لگے عفت سنبھل کر بیٹھ گئی۔ خوبصورت قیمتی قالین پر بے آواز قدموں سے پلے ہوئے وہ اس کے قریب آگئے۔ بانے کتنے لمحے چپ چاپ گزر گئے۔ لونی آواز نہیں آئی۔

لغت منظر محنتی —

شہاب احمد اس کے سامنے بیٹھیں گے۔

لجھ اپنی کہیں گے

لجھ اس کی سنیں گے۔

وہ جو — اس کی چاہت میں بقول خدا ان کے اپنے آپ کو بھی لے ہوتے تھے۔

یوں گم صم کھڑے تھے۔

آخر وہ کیا سوچ رہے تھے۔

عفت نے گھبرا کر آہستہ سے پلکیں اوپر اٹھائیں۔

لیکن اگلے ہی لمحے اس کی پلکیں جھپک گئیں۔

شہاب احمد کی نگاہوں کا انداز اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اپنی بے ترتیب سانسوں کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ہانے سوچا۔

اس نے اپنے ذہن پر بہت زور دیا۔

مگر اسے یاد نہ آسکا کہ شہاب احمد کا نگاہوں میں کبھی اتنا والمانہ پن بھی اس

اس نے دیکھا ہو۔

شہاب احمد کو شاید اس کی کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

وہ اس کے سامنے بیٹھ کر تو نہیں لیکن اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے
تھامتے ہوئے اور اس کی طرف قدرے جھکتے ہوئے بولے۔

”کیوں عفت بیگم؟ کیا کیفیت ہے آپ کے دل کی؟“

شہاب احمد کے ہاتھوں کا لمس عفت کی زندگی کا پہلا، اٹوٹا اور

تجربہ تھا۔

ایک ایسی کیفیت اس پر طاری ہو گئی — جو ناقابل بیان تھی۔

کوئی اگر اس سے کہتا کہ ان لمحوں کے جذبات کو الفاظ کا سہارا دے دے،

تو وہ ناکام رہتی —

یقیناً ناکام رہتی۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شہاب احمد کو اپنے قریب پاکر اس پر

بیت جاتے گی جس کے اظہار کے لئے الفاظ کا خزانہ بھی بالکل بے وقعت
ثابت ہوگا۔

عفت کے بولوں کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی تو شہاب احمد نے کہا۔

”کچھ تو بولنے عفت!“

عفت کی بند پلکیں آہستگی سے کھلیں۔

شہاب احمد کے ہونٹوں پر کھیری ہوئی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی

عفت پلکیں جھپکاتے بنا ان کی طرف دیکھتی رہی۔

شہاب احمد نے کہا۔

”آپ کچھ نہیں کہیں گی؟“

عفت ان کے دل نشیں چہرے سے نگاہیں ہٹاتے بغیر بولی۔

”کیا کہوں؟“

”کہئے کو کچھ بھی باقی نہیں رہا؟“

”شاید نہیں،“

”سننا تو پسند کریں گی نا؟“

عفت نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو پھر سنئے،“

”کہئے“

”آج میں بے حد خوش ہوں عفت! کیونکہ میں حبیبت گیا ہوں۔“

”اچھا،“

”آپ شاید تصور بھی نہ کر سکیں کہ میں ایک محسوس کر رہا ہوں۔“

عفت خاموش رہی۔

شہاب احمد نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں عفت! میں آپ کے قابل نہیں ہوں، خدا نے مجھے میسری

جینیت سے بڑھ کر ایک چیز دے دی ہے،“

عفت نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔

شہاب احمد نے اس کے خاتی ہاتھوں کی خوشبو سونگھتے ہوئے کہا۔

”آپ کو نہیں معلوم، آج شام تک ایک عجیب بے یقینی سی ہفتی میرے دل میں۔“

عفت نے پوچھا۔

”کیسی بے یقینی؟“

”یہی کہ معلوم نہیں آپ میرے گھر کے آنگن کا چاند ہیں بھی یا نہیں؟“

عفت اس تمام عرصے میں پہلی بار مسکرائی اور بولی۔

”پھر اب تو یقین آگیا آپ کو؟“

”ہاں! یہ ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہیں، یہ چہرہ میرے چہرے کے اس قدر

قریب ہے، میں کتنی آسانی سے آپ کی سانسوں کی آواز سن سیکتا ہوں، اب

بھی یقین نہ کروں؟“

عفت کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

شہاب احمد نے اس کی پیشانی پر چمکتے ہوئے ٹیکے کو درست کرتے ہوئے

کہا۔

”آپ اپنی بھی تو کہتے“

”کیا کہوں؟“

”آپ بھی خوش ہیں یا نہیں؟“

”آپ بتائیے، خوش نظر آتی ہوں یا نہیں؟“

”میں نہیں بتا سکتا“

”کیوں؟“

”آپ بہت گہری ہیں“

”ان گہریوں میں جھانکنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے آپ؟“

شہاب احمد مسکرا کر بولے۔

”اب تو اپنی ہی چیز ہیں آپ، جب چاہوں گا یہ کوشش کر دکھیوں گا۔“

عفت ان کے بے ساختہ انداز پر مسکرا دی۔

”کیوں؟ کیا غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”نہیں“

”اگر غلط نہیں کہہ رہا ہوں تو مجھے یقین دلانے کے لئے کوئی تو ایسی حرکت سرزد

ہونی چاہیے آپ سے“

عفت نے حیران ہو کر پوچھا۔

”جی! کیسی حرکت؟“

شہاب احمد کچھ نہیں بولے، چپ چاپ اس کی طرف دیکھتے رہے، عفت

بھی انہی کی طرف دیکھتی رہی، شہاب احمد کی نگاہوں کا والہانہ پن کچھ اور بڑھ گیا

نہا۔ وہ اس کے خائی ہاتھوں کو اپنے لبوں سے لگاتے ہوئے بے خود سے نیٹھے

تھے، عفت نے آہستہ سے ان کے شانے پر ٹرکا دیا۔

اور اس سے یہ حرکت بالکل عین ارادی طور پر سرزد ہوتی تھی۔

شہاب احمد کی نگاہوں میں بسا ہوا پیار کا جہاں۔

ان کی آنکھوں میں لہریں مارتی ہوئی چاہت و محبت کی وہ گنگنا عفت

کو غور کر رہی تھی کہ وہ ستر یا اس میں ڈوب جائے۔

یوں — جیسے پھول کی نیکھڑی کو شبنم کے نرم و نازک قطروں نے
ڈیر لیا ہو۔

عفت کے کانوں نے ان کی دل نشیں آواز کو سنا۔
”تہیں مجھ سے محبت ہے یا نہیں، تم مجھے کتنا چاہتی ہی اور کتنا نہیں، یہ سب
اپنی اب بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں عفت!“
عفت نے آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا۔
شہاب احمد اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر بولے —
”بس! میں تمہیں چاہتا ہوں، یہ کافی نہیں؟“

عفت مسکرا دی،
شہاب احمد نے لان کی سمت والی کھڑکی کے پردے کھینچ کر کھڑکی کھولتے
بولے کہا۔

”یہاں آ کر دیکھو تو سہی! کتنی خوب صورت رات ہے؟“
عفت نیچے اترنے لگی تو شہاب احمد نے اس کا بھاری آنچل اس کے سر پر
ٹالے ہوئے اسے سہارا دیا۔
شہاب احمد کے بازوؤں کے حصار میں کھڑے ہو کر عفت نے کھڑکی سے
باہر دیکھا —

رات اپنے جوبن پر غرق
تاروں بھرا سیاہی بائل نیلگوں آسمان
چمکتا ہوا پورا چاند

شہاب احمد کے ہاتھوں کی گرفت اس کے ہاتھوں پر مضبوط ہو گئی۔
خوشبوؤں سے غمگنت ہوئی۔

اور پھولوں سے سچی ہوتی خواب گاہ۔
سیج پر بکھری ہوئی گلاب، موتیا اور چنبیلی کی کھلی اور ادھ کھلی کلیاں۔
گنہ رتے ہونے لمحوں کا دامن تھا مگر۔
سرکتے ہوئے خاموشی کے لمحات۔

اور شہاب احمد کا قرب
اتنے قریب تھے وہ کہ عفت کی سالیں ان کی سانسوں سے الجھ کر رہ
گئی تھیں۔

جانے کتنے لمحے اسی طرح گزر گئے۔

پھر شہاب احمد نے کہا۔

”عفت! زندگی میں اب کسی چیز کی کمی نہیں محسوس ہوتی مجھے“

کس قدر دھیمے اور سرگوشیاں سالجہ تھا ان کا!
عفت کا سنہری زرتار آنچل اس کے سر سے ڈھلک گیا تھا۔
اس کا چہرہ شہاب احمد کے مضبوط ہاتھوں کے ہالے میں تھا۔

آنکھیں بند تھیں۔

اور پلکیں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔

پھر شہاب احمد کے گرم گرم لبوں نے بڑی آہستگی سے اس کی بند کھوں
کو چھوا —

ہواؤں کا دامن تنہا کھاڑتے ہوئے بادلوں کے پھوٹے پھوٹے ٹکڑے
باؤنڈری والی پر بھومتے ہوئے درختوں کے سائے۔

پتوں کی دھیمی دھیمی سرگوشیاں
پھولوں کی البیلی خوشبوئیں

اور منہ بند کلیوں کے نرم نرم سلسے
فضائیں ہلکی سی مٹی اور خشکی تھتی۔

وہ دونوں بے خودی اور سرشاری کے عالم میں کھڑے رات کے قدموں کا
دھیمی دھیمی چاپ سن رہے تھے اور گاہے گاہے ایک دوسرے کی طرف دیکھ
کر مسکرا دیتے تھے۔

پھر عفت نے کہا۔

”میں نے مفسور اور ثوبیہ کو نہیں دیکھا“

”ہاں! امی جان نے انہیں ان کی خالہ کے گھر بھیج دیا تھا۔“

”اچھا! کب تک رہیں گے وہ لوگ وہاں؟“

”پانچ چھ دن میں آجائیں گے۔“

پھر ان کے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں لیکن انہوں نے بچوں کو موزوں
گفتگو نہیں بنایا۔

عفت اور شہاب احمد کی زندگی کی وہ پہلی رات گزر گئی۔ اس کے بعد ادب
بہت سی تقریبات گزر گئیں۔ ولیمہ، چوتھی، چالے کی دعوتیں۔ ایک سلسلہ
جو بڑی مشکل سے ختم ہوا۔

ہر آنے والی صبح عفت کو یہ احساس دلاتی تھی کہ شہاب احمد اس کے دیوانے
ہیں۔

ہر آنے والی شام عفت کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھی کہ شہاب احمد اسے
بے پناہ چاہتے ہیں۔

شہاب احمد کی چاہتوں کی کبھرتی ہوتی کلیاں۔

ان کی محبت کی برستی ہوتی دھیمی دھیمی ہزم پھوار

کبھی کبھی عفت کو عسوس ہوتا کہ اس کا وجود یہ سب کچھ سہا نہیں سکے گا۔
اس سارے خزانے کو سیٹھنے کے لئے اسے اپنا دامن بہت تنگ عسوس ہوتا تھا
بعض اوقات تو وہ خوف زدہ ہو جاتی۔

اور سہم کہہ سوجتی۔

محبت کے خزانے کو اتنی افراط لگانے کا انجام کہیں عبرت ناک نہ ہو۔

وہ گہری سوچوں میں ڈوب جاتی۔

وہ ذرا سا بھی خاموش ہوتی، گہری سوچوں میں ڈوبتی یا پریشان ہوتی۔ تو
شہاب احمد اصرار کر کے اسے اظہار جذبات کے لئے مجبور کر دیتے۔

عفت کا جواب سن کر وہ اپنے مخصوص انداز میں منہس دیتے اور کہتے۔

”یہ خزانہ کبھی خالی نہیں ہوگا عفت! تم ناحق خوف زدہ ہوتی ہو،“

اور رنجناہر معلوم بھی یہی ہوتا تھا کہ زندگی بڑے سکون سے گزرے گی۔

شہاب احمد کی محبت بے اندازہ تھی، اس کی ساس ہر وقت واری صدقہ ہوتی
تھیں، تندیں اگرچہ اپنے اپنے گھروں کی بھیتیں لیکن حبیب بھی آتی تھیں یا عفت

ان سے ملنے جاتی تھی وہ بڑی چاہت اور اپنائیت سے ملتی تھیں۔ اس کے میکے والوں کی بھی سب لوگ عزت کرتے تھے یہ الگ بات تھی کہ اماں اور بھائی میاں وغیرہ عفت کے گھر پر اتنے نام ہی آتے تھے۔ شہاب احمد کے بچوں سے عفت کا برائے نام ہی واسطہ تھا۔ منصور اور ثوبہ کے لئے شہاب احمد نے گورنس رکھی ہوئی تھی شہاب احمد سے وابستہ ہونے کے بعد عفت دونوں بچوں کو اپنی ذمہ داری سمجھتی تھی وہ چاہتی تھی کہ بچے اس سے مانوس ہوں، اس کے ساتھ اپنے وقت کا بیشتر نہ سہی غھوڑا سا حصہ تو گزاریں۔ لیکن دونوں بچے خصوصاً ثوبہ اس سے بہت دور بھاگتی تھی۔ ان بچوں کی گورنس ایک جرمن خاتون تھی۔ وہ اپنے طریقے سے ان کی تربیت کر رہی تھی جہاں تک وقت اور اصول کے مطابق کام کرنے کا تعلق تھا۔ عفت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا، اس کے نزدیک بھی یقیناً یہ اچھی بات تھی لیکن اس گورنس کے زیر تربیت جا کر بچے چند ایسی باتیں بھی سیکھ رہے تھے جو یقیناً عفت کے لئے تشویشناک تھیں۔ اس نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔ شہاب احمد اور اپنی ساس سے ان کا تذکرہ بھی نہیں کیا لیکن وہ دل سے چاہتی تھی کہ بچے ان مادوں اور ان باتوں سے دور رہیں۔ اس نے چند بار دبی زبان سے شہاب احمد سے یہ کہا کہ اس کی خواہش ہے کہ بچے اس سے مانوس ہو جائیں۔

شہاب احمد نے ہر دفعہ یہ کہہ کر ٹال دیا۔

”عقو! تم بچوں کے چکر میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے۔“

”مگر میں ان بچوں کو اپنی ذمہ داری سمجھتی ہوں۔“

”یہ تمہاری نیک نیتی اور خلوص ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ منصور اور ثوبہ اپنی

کی زیر تربیت بالکل صحیح سمت جا رہے ہیں۔“

اور یہاں اگر عفت بے زبان ہو جاتی تھی۔ جب شہاب احمد کی سوچوں کا یہ تھا تو عفت کیا کر سکتی تھی۔

ہوائے اس ایک بات کے عفت کو شہاب احمد سے نہ کوئی گلہ تھا نہ

اور عفت کو نہ ان کی توجہ میں کوئی کمی محسوس ہوتی تھی نہ ان کی غبت میں۔ ان

بالا کہ اس نے اندرون ملک اور بیرون ملک اتنی سیر اور تفریح کی تھی جس کا

زور خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اور پھر وہ ساری خریداری۔ جو شہاب احمد

مالکوں ملکوں اس کے ساتھ گھومتے ہوئے اس کے لئے کی تھی، عفت کی توقع سے

بہ زیادہ تھی وہ حیران ہو کر سوچتی۔

آفران ساری چیزوں، ان تمام کپڑوں کا میں کیا کروں گی، کہاں تک استعمال

ان کی یہ چیزیں باور کھانا تک پہنچوں گی ان کپڑوں اور ان زیورات کو؟

زندگی میں اتنا سکون ملا۔

اپنی غبت اور چاہت ملی۔

اور اتنی توجہ میسر آئی۔

تو عفت سرتاپا بدل کر رہ گئی۔

اس کا رنگ و روپ جیسے ایک دم نکھر آیا

سب اسے دیکھتے اور حیران رہ جاتے۔

خوش ہونے والے خوش ہوتے۔

اور حسد کرنے والوں کے حسد میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔

آٹاں، بھائی میاں اور فرخ بھائی کی پیشانیوں پر نظر کرنے والی غور و فکر سلوٹوں میں کسی حد تک کمی آگئی۔

بڑی آپا، چھوٹی آپا اور مرہن کے چہروں پر اطمینان بھلکے لگا۔

وہ جب بھی اپنے میکے جاتی مٹا کی ماری آٹاں کہہ دیکر اس سے پوچھتے کہ بچوں کے معاملے میں اسے کسی پریشانی کا سامنا تو نہیں کرنا پڑ رہا ہے؟ بھائی میاں روختے، عورتوں والی کہہ دیکر عادت ان میں نہیں بھتی۔ وہ نکاہوں ہی نکاہوں میں اس سے بہت کچھ پوچھ جاتے تھے۔ عقّت نے کئی بار محسوس کیا کہ بھائی میاں کی جہانزیدہ نظریں اس کے دل کے اندر تک کا حال معلوم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ بڑی آپا بھی دے دے لفظوں میں اکثر اس سے پوچھ لیا کرتی تھیں۔ رہ گئیں۔ معذرت باجی! وہ تو اس کی دوست ہی تھیں۔ مرہن کی طرح کھلم کھلا وہ اس سے ہر وہ بات پوچھ لیا کرتی تھیں جو وہ پوچھنا چاہتی تھیں۔ ساتھ میں یہ نصیحت بھی کرتی تھیں کہ کوئی معمولی سی پریشانی بھی ہو اس کا ذکر ہم سے ضرور کرنا۔

عقّت سوچتی —

اول تو خدا کا شکریہ ہے کہ مجھے کوئی پریشانی نہیں، شہاب احمد نے مجھے اتنا آرام، اتنی محبت، اتنا سکون اور اس قدر توجہ دی ہے جس کا میں تصور ہی نہیں کر سکتی تھی۔

اور اگر زندگی میں کبھی مجھے پریشانی، کوئی دکھ ہوا بھی تو یہ لوگ مجھ سے یہ توقع کیوں رکھتے ہیں کہ میں اپنے دکھڑے ان لوگوں کے سامنے روؤں گی۔ اور پھر اس صورت میں — جب کہ اماں مارے غصے کے ایک روز اس سے

کہ بھی چکی تھیں کہ

”کل کلاں تم پر کوئی افتاد لٹوٹے تو ہمارے پاس نہ آنا اپنے دکھڑے رونے کے لئے۔“

وہ خدا سے یہی دعا کرتی تھی کہ اس کی زندگی پُر سکون گزرے۔

شادی سے پہلے ہی اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ شہاب احمد کی خواہش تھی۔ وہ جو اپنی محبت کا تمام تر خزانہ اس پر کھچا ور کر رہے تھے۔ وہ ان کی اتنی سی خواہش بھی پوری نہ کرتی اور پھر — بقول شہاب احمد اسے ملازمت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے پاس کسی چیز کی کمی تھی؟ شاید یہ بات ان کی شان کے بھی خلاف تھی کہ اتنے امیر و کبیر آدمی کی بیگم ہزار روپے ماہوار کی ملازمت کرتی پھرے، صبح سے شام تک مسودے پڑھ پڑھ کر کہ اپنا دماغ کھپاتے۔ عقّت نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔

اس نے یہ بھی سوچا —

موجودہ حالات، کے تحت میں اس ملازمت کی مستحق بھی نہیں ہوں، اچھا ہے کسی ضرورت مند لڑکی کا تقرر دہاں ہو جائے۔

صناعت کے پیشے سے اسے جتنی محبت تھی اور اپنے کام سے اسے جتنا لگاؤ تھا اس کا اندازہ کسی دوسرے شخص کو نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس نے وقت اور حالات کے تقاضے کو پورا کیا۔ وقت گزاری کے لئے اس نے گھر کے کاموں میں دلچسپی یعنی شروع کر دی حالانکہ نوکروں کی فوج کے ہوتے ہوئے

اسے اس کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

شہاب احمد کے پاس بہت اچھا ذخیرہ کتب تھا۔ شہاب احمد نے ایک روز اپنی لائبریری کی چابی عفت کے حوالے کرتے ہوئے بڑی محنت سے کد

”میں نے یہ ساری کتابیں بڑی چاہت اور لگن سے جمع کی ہیں، جانے کہاں کہاں سے لے کر آیا ہوں“
پھر قدرے مسکرا کر بولے۔

”صرف جمع ہی نہیں کی ہیں بلکہ انہیں پڑھا بھی ہے“
عفت نے کہا۔

”جی! اس کا اندازہ مجھے شادی کے دو تین ماہ بعد ہی ہو چکا تھا۔“
شہاب احمد نے کہا۔

”لیکن اب یہ تمام کتابیں تمہاری تھیں“
عفت سر جھکاتے خاموش کھڑی رہی۔

شہاب احمد نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا
”جب کتابوں کا مالک ہی تمہارا ہو چکا تو پھر.....“

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر، قدرے آگے جھیک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

عفت کی کانپتی لہر تکی ملیں بند ہو گئیں۔

شہاب احمد نے اس کا سر ہلاتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

”کیوں؟ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

عفت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شہاب احمد نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”میری بات کا جواب ضرور دینا پڑے گا۔ عفت بیگم! اور نہ آپ کو سزا بھی مل سکتی ہے۔“

عفت نے پوچھا۔

”کس بات کا جواب؟“

”یہی کہ ان کتابوں کا مالک آپ کا ہو چکا یا نہیں؟“ شہاب احمد نے اس کے تٹانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔
عفت نے کہا۔

”میں اور آپ جس انداز سے کھڑے ہیں اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں“

شہاب احمد نے بڑی آہستگی سے اس کے بالوں کو چومادیا اور ایک بے خودی کے انداز میں بولے

”بس! تمہاری ایسی ہی باتوں نے تو میں تمہارا دیوانہ بنا دیا۔“

عفت سر جھکاتے سوچوں میں ڈوبی کھڑی رہی۔

شہاب احمد نے کہا۔

”اب آپ جی بھر کے ان کتابوں کا مطالعہ کریں، آرٹیکل لکھیں، افسانے لکھیں اور ناول لکھیں۔“

عفت نے مسکاکر پوچھا۔

”اور میری فضولیات کو سچا پے لگاؤں؟“

”فضولیات!؟“

”جی! اور کیا؟“

”نہیں عفت بیگم! اس قدر مطالعے کے بعد آپ جو کچھ لکھیں گی وہ یقیناً

معرکے کی چیز ہوگی۔“

عفت نے دل ہی دل میں ان کی بات کو سراہا۔

عفت کی کلاس فیلو خشنودہ اپنے شوہر کے ساتھ باہر جا چکی تھی۔ وقتاً

وقتاً اس کے خط آتے رہتے تھے۔ وہ وہاں بہت خوش بھی۔ شملہ کی تادی

اس وقت تک نہیں ہوتی تھی۔ وہ بڑی لگن سے پی ایچ۔ ڈی کمرہ ہی تھی عرفانہ

اور پروین کی خیر خبر بھی کبھی مل جاتی تھی۔ ایک ملاقات میں شملہ نے ہی اسے

بتایا تھا کہ ذیشان سی۔ اے کمرہ نے کینیڈا گیا ہوا ہے۔

مہرین کے یہاں پہلے بچے کی پیدائش ہوئی تھی۔ بڑا خوبصورت اور تندرست

بچہ تھا۔ مہرزا خضر اپنے بیٹے کو پاکر خوشی سے جھولے نہیں سمارہے تھے۔ اور

مہرین انہیں پہلے سے بھی زیادہ عزیز ہو گئی تھی، عفت، شہاب احمد کے ساتھ

مہرین کے بیٹے کو دیکھنے گئی تو مہرین نے مرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے یہاں بیٹی ہونی چاہیے۔“

”کیوں؟“

”کیوں کہ مجھے ایک بہو کی ضرورت ہے۔“

عفت ہنس پڑی۔

آل کو سعید باجی کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی تھی، ان کے چمن میں اس

تک کوئی پھول نہیں کھلا تھا۔ جب کہ بڑی آپا کا پاؤں دوبارہ بھاری

لایا تھا اور چھوٹی آپا کی ساس بھی ان کے امبد سے ہونے کی خوشخبری سنا

نہیں۔

مہرین نے تو اب یہ دستور ہی بنالیا تھا کہ عفت سے اس کی ملاقات

ب بھی ہوتی تھی۔ وہ بڑے پر تشویش لہجے میں پوچھتی تھی۔

”کیوں بھی؟ شہاب احمد کا رویہ ٹھیک تو ہے تمہارے ساتھ؟“

ان کی طرف سے اطمینان ہوتا تو اسے بچوں کے سلوک کی نگرہ پڑ جاتی۔

ڈل کے نغیال والوں کی طرف سے اندیشے لاحق ہو جاتے۔ سب کو یہی ڈر

ہے کہ انہیں تو یہ اور منصور کے نغیال والے انہیں پٹی پڑھا کہ عفت کی طرف

بدظن نہ کمر دیں۔

عفت ایسی باتوں پر منہس پڑتی تھی۔

اتنے چھوٹے بچے کسی کے سکھانے پڑھانے میں بھلا کیا آئیں گے؟ منصور

بڑبڑھتا بھی قدرے سمجھ دار تھا۔ لیکن تو یہ تو بالکل متی گرد یا سی تھی بشری لوگوں

پر نگاہ بھی تھی کہ کہیں بچوں کے معاملے میں شہاب احمد اتنے جذباتی نہ ہو جائیں

فت کے ساتھ ان کے سلوک میں فرق آجائے۔

بچوں کے معاملے میں شہاب احمد بے شک بہت جذباتی تھے۔ تو یہ اور

شور سے انہیں بہت پیار تھا۔ لیکن عفت کے لئے ان کے پیار بھرے جذبات

میں ذرا بھی کمی نہیں آتی تھی۔ بلکہ ہرگز نہ والاد عفت کے لئے ان کے والہا:۔
 بن میں کچھ اور اضافہ کر رہا تھا۔ کم از کم عفت کو تو یہی محسوس ہوتا تھا۔
 ہستی مون منانے کے لئے تو وہ عفت کو ساتھ لے ہی گئے تھے اور اسے
 جانے کہاں کہاں کی سیر کر ڈالی تھی۔ لیکن اپنے کاروباری دوروں پر جاتے ہوئے
 بھی وہ عفت کو ساتھ لے جاتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے عفت کے
 بغیر انہیں ایک پل چین نہیں ملتا تھا۔ ایسے ہی ایک کاروباری دورے پر
 عفت شتاب احمد کے ساتھ گئی ہوئی تھی۔ دورہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا
 واپسی پر عفت کو معلوم ہوا کہ اماں فرخ بھائی کے لئے نہ صرف لڑکی پسند کر
 آئی ہیں۔ بلکہ بات بھی طے کر آئی ہیں، بڑی آپا، چھوٹی آپا، سعدیہ باجی اور فوزی
 سبھی نے لڑکی کو دیکھ لیا ہے اور اسے پسند کر لیا ہے۔ فرخ بھائی اس معاملے
 میں بڑے فرمانبردار اور تابعدار قسم کے فرزند ارجمند ثابت ہوئے انہوں نے لڑکی
 تو درکنار اس کی تصویر تک دیکھنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ اس معاملے میں انہیں اپنی
 اماں اور بہنوں پر مکمل اعتماد تھا۔ بلکہ حد تو یہ تھی کہ اماں وغیرہ لڑکی کی تصویر
 انہیں دکھانے کی عرض سے لے کر آتی تھیں۔ فرخ بھائی نے اسے دیکھیں
 بھی ڈیڑھپس کا اظہار نہیں کیا۔ بڑی آپا جب تصویر لے کر ان کے پاس گئیں تو
 انہوں نے کہا۔

”آپ لوگوں نے ناحق ہی ان لوگوں کے اہم سے ایک تصویر کم کر دی“
 بڑی آپا نے کہا۔

”بھئی لڑکی ہمیں دیکھ سکے، کم از کم تصویر ہی دیکھ لو۔“

”میں تو اس کی ضرورت قطعی نہیں محسوس کرتا۔“
 ”آپ کیوں؟“

”آپ لوگوں نے لڑکی دیکھ لی، بس کافی ہے۔“
 ”جس کو زندگی گزارنی ہے اس کا دیکھنا بھی تو ضروری ہے“
 ”مجھے یقین ہے میری اماں اور بہنوں نے میرے لئے بہتر سے بہتر چیز ہی
 تلاش کی ہوگی۔“

”ظاہر ہے، ہمارے بھائی میں بھی تو کسی بات کی کمی نہیں ہے“
 فرخ بھائی کا ذکر بڑے پیار اور غر بھر سے لہجے میں کرتے ہوئے بڑی
 آپا نے ساری باتیں عفت کو بتائی تھیں۔
 عفت نے پوچھا۔

”پھر فرخ بھائی نے تصویر دیکھی بھی یا نہیں؟“
 ”ہاں! جب میں نے تصویر ہاتھ میں تھا، می دی تب بھی نہ دیکھتا؟“
 ”کیا بولے؟“

بڑی آپا نے ہنس کر کہا۔

”کنے لگا۔۔۔ یہ تو کوئی بڑی خوبصورت لڑکی ہے کیوں اس بے پیاری
 کی قیمت چھوڑ رہی ہیں میرے ساتھ اس کا رشتہ طے کر کے؟“
 عفت نے کہا۔

”سچ! ہمارے فرخ بھائی بڑے اچھے ہیں ورنہ آج کل کے لڑکوں کے
 ٹو بڑے دماغ ہوتے ہیں اس معاملے میں“

بڑی آپا کاٹوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اسے بابا! پوچھو، ایسی ایسی شرطیں لگانے ہیں کہ اماں بہنوں کے ہوتے گھس جاتے ہیں لڑکی ڈھونڈتے ڈھونڈتے“

عفت نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور بولی۔

”ججھے بھی تو وہ تصویر دکھائیے۔“

”اماں کے پاس ہے تصویر، انہی کے پاس جا کر دیکھ لو“

عفت کو اپنی ہونے والی بھابھی کی تصویر دیکھنے کی بڑی بے چینی تھی۔ وہ

اسی وقت اماں کے کمرے میں جا پہنچی۔

اماں جلنے کس جگہ تصویر رکھ کر بھول گئی تھیں کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئیں۔ مگر تصویر کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ آخر کار طے یہ پایا کہ ایک دن عفت اماں کے ساتھ جا کر لڑکی کو یہی دیکھ آئے۔

تقریباً چار، پانچ روز بعد فوزی نے عفت کو ٹیلیفون کیا کہ

”اُن لوگوں کو ٹیلیفون پر اطلاع دے دی ہے۔ اماں کل شام کو جاتیں گی،

آپ آجائیے گا۔“

”اُن لوگوں“ سے فوزی کی مراد یقیناً فرخ بھائی کے سسرال والوں سے تھی۔

اس نے فوزی سے کہہ دیا۔

”ٹھیک ہے میں کل آ جاؤں گی“

بعد میں اسے خیال آیا کہ کل تو وہ اور شہاب احمد ایک دوست کی شادی کی سالگرہ میں مدعو ہیں اور وقت بھی وہی تھا جو اس نے فوزی سے طے کیا تھا وہ

پریشان ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہہ ہے؟ فوزی کو ٹیلیفون کر کے اس سے پروگرام کینسل کرنے کے لئے کہے یا شہاب احمد سے کہہ کہ وہ اپنے دوست کے یہاں تنہا ہو آئیں۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ کہیں شہاب احمد برا نہ مان جائیں۔ اس سے پہلے بھی وہ شہاب احمد کے ایک دوست کے گھر تقریب میں اس لئے نہیں جاسکی تھی کہ اس شام فوزی نے امتحان میں اپنی کامیابی کی خوشی میں اپنی سہیلیوں کو پارٹی دی تھی اور ساری بہنوں اور بہنوئیوں کو بھی بلایا تھا۔

فوزی سے بات کرنے کے بعد سے عفت تذبذب کا شکار تھی اور الجھی الجھی سی بیٹھی تھی۔ اسی وقت شہاب احمد آگئے، عفت در پیچے میں جھکی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دیر فالین پر بے آواز قدموں سے چپتے ہوئے شہاب احمد اس کے بالکل قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ عفت ایک دم چونک گئی۔ اس نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ شہاب احمد کی آنکھوں میں حیرانی تھی اور چہرہ کچھ کچھ پریشان سا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ وقت عفت کے باہر لان میں بیٹھنے کا تھا۔ وہ باہر ہی بیٹھی شہاب احمد کا انتظار کرتی تھی۔ آج ایک بات خلاف توقع ہوئی تھی۔ وہ حیران اور پریشان نہ ہوتے تو کیا کرتے؟

عفت نے مسکرا کر کہا

”ارے آپ آگئے۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوتی“

شہاب احمد نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بات ہے عفت؟“

عفت نے حیران ہو کر کہا۔

”جی! کچھ نہیں۔“

”پھر خلافتِ توقعِ شام کے وقت تم کمرے میں کیوں نظر کر رہی ہو؟“

”بس! میں ابھی باہر جانے ہی والی تھی“

شہاب احمد نے دونوں شانوں سے بکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے آج دن بھر تم نے مجھے بھلائے رکھا“

عفت نے پریشان ہو کر کہا۔

”نہیں، مندر! ایسی کوئی بات نہ کیجئے“

”کیوں؟“ شہاب احمد نے مسکرا کر اپنی شفاف پیشانی اس کی چپٹی ہوئی پیشانی سے ٹکادی۔

”اس لئے کہ اس میں ذرا سی بھی حقیقت نہیں ہے“

شہاب احمد بے ساختہ منہس دیتے اور بولے۔

”ارے! تم اس قدر سیریس کیوں ہو گئیں؟ میں تو مذاق کر رہا تھا۔“

عفت نے اپنے شانوں پر رکھے ہوئے شہاب احمد کے مضبوط ہاتھوں پر اس کے

سے اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

”کیا بات ہے؟ تم کچھ چپ چاپ سی ہو یا مجھے ہی ایسا محسوس ہو رہا ہے؟“

عفت نے ایک لمحے کے لئے شہاب احمد کے تھکے ہوئے چہرے کی طرف

دیکھا اور سوچا۔

مجھے ابھی ان سے کچھ نہیں کہنا چاہیے، شوہر کے گھر میں داخل ہوتے ہی

لے مسائل لئے کہ بیٹھ جانا قطعاً نامناسب ہے اور پھر سچ تو یہ ہے کہ کوئی اتنا
باسکولہ بھی نہیں ہے۔

شہاب احمد نے اسے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر کہا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”جی! بالکل ٹھیک ہے۔“

”تو پھر تم مجھے روزانہ سے مختلف کیوں نظر آ رہی ہو؟“

”آپ کو وہم ہو گیا ہے شہاب صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے“

”میں نہیں مان سکتا۔“

”اچھا فرض کیجئے کوئی بات ہے بھی تو ظاہر ہے آپ سے چچاؤں گی تو نہیں“

شہاب احمد اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے شاکی نگاہوں سے اس کی طرف

دیکھتے رہے۔

عفت نے ان کی پیشانی پر جھکے ہوئے بالوں کو پیچھے سمیٹتے ہوئے کہا۔

”آپ پہلے کپڑے بدلے، منہ ہاتھ دھوئیے پھر باہر بیٹھ کر باتیں کریں گے“

”نہیں! ابھی بتاؤ ورنہ میرا ذہن الجھا رہے گا۔“

”افوہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے لے آپ اتنا پریشان ہوئے ہیں“

”کیسی ہی معمولی بات کیوں نہ ہو۔ مجھے ابھی بتاؤ“

عفت مسکرا کر بولی۔

”آپ تو بچوں کی طرح خند کر رہے ہیں“

”جب تم میری اتنی ناز برداریاں کرو گی تو مجبوراً میں اپنے آپ کو سچ ہی

محسوس کروں گا۔

”یہ تو آپ بالکل الٹی بات کہہ رہے ہیں۔“

”الٹی بات کیوں؟“

”ناز برداریاں تو آپ کہتے ہیں میری۔“

”سچ!!؟“

”اور کیا، اور وہ بھی اتنی جن کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔“

شہاب احمد نے اسے اپنے شانے سے لگاتے ہوئے محبت سے کہا۔

”تم ہو ہی ایسی۔“

”کیسی؟“

”تمہاری جتنی بھی ناز برداریاں اٹھانی جائیں کم ہے۔“

عفت خاموش رہی۔

شہاب احمد نے کہا۔

”تم لے مجھے اپنا کمرہ بہت بڑا احسان کیا ہے میرے اوپر ورنہ...“

”ورنہ؟“

”جانے کیا ہو جاتا عفت! جانے کیا ہو جاتا؟“

عفت نے چونک کر پوچھا۔

”کیا ہو جاتا؟“

”شاید میں یہ نہ ہوتا جواب ہوں۔“

”جانے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“

”تم ان باتوں کو نہ ہی سمجھو تو بہتر ہے۔“

عفت پریشان لگا ہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

شہاب احمد نے ایک طویل سانس لے کر عفت کے کپڑوں سے اٹھتی ہوئی

ہلک کو اپنی سانسوں میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

”تم اپنی بات بتاؤ، آج تمہیں کیا پریشانی لاحق ہو گئی؟“

”بہت بے چینی ہے آپ کی فطرت میں، عفت مسکراتی۔“

”تم کچھ بھی کہو لیکن میں پوچھے بغیر نہیں مانوں گا اور وہ بھی ابھی۔“

شہاب احمد کا اصرار جب اس حد تک بڑھا تو عفت کو اپنی الجھن کا ذکر کرتے

ہی بن پڑی۔

عفت کی بات سن کر شہاب احمد پہلے تو بے ساختہ ہنس دیئے پھر مصنوعی

ناراضگی سے بولے۔

”عفت بیگم! آج ہم آپ کو سزا دیتے بغیر نہیں مانیں گے۔“

”سزا؟“

”ہاں۔“

”وہ کس بات پر؟“

”اتنی معمولی سی بات سے پیچھے آپ نے آج ہمیں اپنی پیار بھری مسکراہٹ اور

استقبال سے محروم کر دیا،

عفت نے کہا۔

”میں بس باہر جانے ہی والی تھی۔“

”کوئی بہانہ نہیں چلے گا، سزا ضرور ملے گی“

عفت نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”اگر میں قابل سزا ہوں تو ضرور سزا دے دیجئے“

چند لمحے گزر گئے، عفت اسی طرح کھڑی رہی۔ شہاب احمد بھی خاموش تھے۔

عفت نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

اٹ خدا یا!

ان کی نگاہیں اسی پزخمی ہوئی تھیں۔

لیکن نگاہوں سے جھانکتی ہوئی پیار کی برکھارت۔

عفت کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

جب عفت کے ہوش و حواس نے اسے کچھ کہنے کے قابل کیا تو عفت نے

مدھم لہجے میں کہا۔

”اس طرح نہ دیکھا کبھی شہاب صاحب!“

”کیوں؟“

”مجھے خوف آتا ہے“

”کس بات سے خوف آتا ہے“

”مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا، بڑی جلدی ختم ہو جائے گا“

”اس قدر وہم نہیں کرتے عفت!“

شہاب احمد کی ہانپیں حلقہ بن گئیں۔

عفت کی نگاہیں سوچوں میں ڈوب گئیں۔

شہاب احمد نے کہا۔

”اچھا بھئی! تمہاری اس بیکار کی لہجوں کا مل تو یہ ہے کہ تم کل اپنی ہوسنے والی بھابھی کو

بے ضرور جاؤ، پارٹی میں، میں تنہا چلا جاؤں گا۔“

عفت پھر بھی چپ چپ سی کھڑی رہی۔

”اب کیا پریشانی ہے؟“ شہاب احمد مسکرائے۔

”ایک مرتبہ پہلے بھی ایسا ہی اتفاق ہو چکا ہے۔“

”ہمنے دو، اتفاقات تو ہوا ہی کرتے ہیں“

”ڈرتی ہوں کہیں آپ کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ.....“

شہاب احمد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میرے دل میں کوئی خیال نہیں آئے گا، تم بالکل بے فکر ہو کر اطمینان سے جاؤ،“

عفت نے بڑی گہری نظروں سے شہاب احمد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ لیکن

کے چہرے پر اسے ناراضگی کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نظر نہیں آئی۔ ان کی آنکھیں عمدتہ

درج جاہلیت کے خزانے لٹا رہی تھیں۔ عفت پلکیں بھی کھلے بنا ان کی طرف

لہجہ بازی۔

اگلی شام وہ آٹاں کے ساتھ اپنی ہوسنے والی بھابھی کو دیکھنے جا رہی تھی۔ فوزی

بھائی اس نے زیر دستی ساتھ لے لیا تھا۔ راستے پھر عفت آٹاں سے ادھر اُدھر کی باتیں

لا رہی۔ فوزی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ ڈرائیور کو راستہ سمجھا دے گا ڈی کن کن

ستوں سے ہوتی ہوئی گزری عفت نے دھیان ہی نہیں دیا۔ وہ تو جب گاڑی

کو عفت چونک کر رہ گئی۔ اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر کئی دفعہ اس گھر کو دیکھا

جو اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

پھر اس نے فوزی سے پوچھا۔

”فوزی! یہی گھر ہے؟“

”ہاں باجی!، فوزی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

عفت نے پلٹ کر اماں کی طرف دیکھا اور اس سے بھی یہی سوال کیا۔

اماں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”ہاں! ہاں! اور کیا،“

فوزی نے مسکرا کر پوچھا۔

”آپ اس فلاحی رت زدہ کمپنوں میں ہیں؟“

”ہوں،“ عفت سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

ڈرا بوند گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ فوزی انہی نو عفت نے بھی اپنا پر

سنبھالا اور سوچوں میں ڈوبی ہوئی گاڑی سے باہر آگئی۔ ان لوگوں کے استقبال کے

لئے دامن کی چھوٹی بین اور اس کی اچھی گھٹی پر آگئی تھیں۔ مسکراہٹوں کے تبادلے

ہوئے چند رسمی سے جملے ادا کئے گئے اور سب ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ فوزی

نے عفت کا تعارف ان لوگوں سے کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد مزہب (فرخ بھائی کی

ہونے والی دامن) بھی آگئی۔

فوزی نے آہستہ سے عفت سے کہا۔

”باجی! یہی ہیں ہماری ہونے والی بھابھی“

”اچھا۔“

”پسند آئیں آپ کو؟“

”ہاں! بہت“

چائے کے ساتھ ان لوگوں نے خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ عفت نے مزہب اور اس

ماں سے بہت ساری باتیں کیں۔ پڑھائی اور لکھنے دکھانے کے موضوع پر بھی بہت

ماری باتیں ہوئیں۔ لیکن عفت کا ذہن سارے وقت الجھا الجھا سا رہا۔

واپسی پر اماں نے عفت سے پوچھا۔

”کیوں عفت؟ پسند آئی تمہیں مزہب؟“

”جی! بہت اچھی ہے“

اماں نے کہا۔

”مجھے تو سب گھر والے بھی معقول لگتے ہیں“

”ہوں!،“ عفت کھوٹی کھوٹی سی آوازیں بولی۔

عفت نے کوشش تو بہت کی کہ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اماں اور فوزی

کو نہ ہو سکے۔ اماں کا دھیان تو واقعی اس طرف نہیں گیا کہ مزہب کا گھر دیکھتے ہی عفت

مگمگ سی ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن فوزی کی نگاہیں شاید اماں سے زیادہ تیز تھیں اور اس

کی زبان بھی دل کی بات کہے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

اس نے عفت سے پوچھا۔

”کیا بات ہے عفت! باجی! آپ کچھ کم صم سی ہو کر رہ گئی ہیں؟“

عفت نے کہا۔

”نہیں تو، میں بھلا کیوں کم صم سی ہونے لگی؟“

”معلوم ہوتا ہے آپ کو نہ بہت پسند نہیں آئیں“

عفت کچھ گھبرا کر کہہ لہی۔

”نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے“

”یا پھر یہ بات ہوگی کہ آپ نے فرخ بھائی کے لئے کوئی اور لڑکی پسند کر لی ہوگی۔“

عفت کا دل چاہا۔ کہہ دے کہ ہاں! اور صبح پر فرخ بھائی کے لئے کوئی لڑکی پسند کر کے تنہا بھی دے سکے یہاں ”شرلیفلور کی زبان کا مسئلہ“ راہ کی رکاوٹ بن جاتا تھا۔ کتنی اوجھی اور عامیانہ سی حرکت ہوتی یہ۔

فوزی نے پھر اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ یہی بات ہے نا! باجی؟“

عفت نے کہا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر آپ ایک دم اتنی چپ سی کیوں ہو گئیں؟“

فوزی کی اس کھینچنے والی فطرت نے عفت کو اور پریشان کر دیا۔ وہ تو اماں نے

فوزی کو یہ کہہ کر چپ کرایا کہ —

”تم تو ایک بات کے پیچھے پڑ جاتی ہو، کہاں گم مم اور چپ چپ ہے وہ“

عفت نے بھی کہا۔

”ہاں اماں! معلوم نہیں کیوں اس کو وہم ہو گیا ہے۔ میں نے تو ان لوگوں سے بھی

ڈھیسلائی باتیں کی تھیں۔“

فوزی ہنس کر کہہ لہی۔

”اچھا بھئی! چلے مجھے ہی غلط فہمی ہو گئی تھی، بس! اب تو آپ لوگ خوش ہیں؟“

عفت کا ارادہ تو یہی تھا کہ اماں اور فوزی کو چھوڑ کر پانچ، دس منٹ بھائی میاں

سے باتیں کرے گی اور پھر گھر واپس چلی جائے گی۔ اندر پہنچی تو معلوم ہوا کہ سعید باجی

اور اشفاق بھائی بھی آئے بیٹھے ہیں۔ وہ بھی سب کے ساتھ بیٹھے کہ باتوں میں لگ

لی وقت گزرتے گزرتے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اور جب وہ سب سے رخصت ہو کر

اڑی میں بیٹھی تو —

سوچوں کی آندھی پھر ذہن کے رنگہزار میں بھٹکنے لگی۔

وقت نے بالکل اچانک —

ایک نئے انداز سے کہہ دیا تھا۔

ایک ایسی بات بالکل اچانک ہو گئی تھی —

جس کے متعلق اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ ایک شخص —

جو بالکل حادثاتی اور اتفاقی طور پر اس کے قریب چلا آیا تھا۔

جس سے دور جانے کے لئے اس نے خود اپنے ہی ہاتھوں ایک دیوار بن

دی تھی۔

یہ سوچ کر کہ دیوار کے اس پار کھڑے ہوتے شخص کے ہاتھ اس کے آنکھوں کو

بچھو سکیں۔

اس کے دامن سے نہ ٹکرا سکیں۔

دیوار کے دوسری طرف کھڑے ہوئے شخص کی آنکھیں اسے دیکھنے کی کوشش بھی کریں تو ناکام ہو جائیں۔

اس کے جذبے چاہے جتنے بھی صادق ہوں وہ اس تک پہنچ نہ پاتے۔

اس کی نگاہوں میں اس کی (عفت کی) شبیہ چاہے کتنی بھی روشن اور واضح ہو ایک دن وہ دھندلا جائے۔

وہ مذہم بڑھ جاتے۔

اس کی یاد کی پرچھائیں بھی کبھی اس کے دل کو بے قرار نہ کر سکے۔

مگر —

یہ آتے جاتے لمحوں کا خاموش کارواں

یہ وقت کی اڑتی ہوئی دھول کے عقب میں چپ چاپ جنم لینے والی

کس نبیاں۔

عفت نے سوچا —

سچ ہے — اگلے لمحے کی خبر کسی کو نہیں ہوتی

جو کبھی نہیں سوچا تھا وہ کس طرح زندگی کی ایک حقیقت بن کر نگاہوں کے

سامنے آنے والا ہے۔

ایک شخص —

جسے میں نے خود اپنے آپ سے دور کر دیا تھا۔

رشتوں ناطوں کے بندھن میں بندھا ہوا پھر میرے سامنے اکھڑا ہوا ہے

وہ شہاب احمد سے پہلے ہی گھر پہنچ گئی۔ اس کی بڑی سدا آتی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی

ال اور سند کے پاس بیٹھی ان سے باتیں کرتی رہی۔ اس کی ساس کو معلوم تھا کہ وہ

بہ ہونے والی بھانج کو دیکھنے لگی تھی۔ وہ اس سے تفصیلات پوچھتی رہیں۔ اس

ماتہ بیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دو تین بار اس کی تعریف کر چکی تھیں

ت ابھی انہی کی بات پر بشر مندہ اور بھیلپنی ہوئی سی بیٹھی تھی کہ اس کی ساس نے

مزید شرمندہ کر دیا۔

میں تو اس سے کہتی ہوں کہ کہیں جانے سے پہلے اپنی نظر ضرور اتار دیا کرو مگر

نئی ہی نہیں ہے۔

عفت کی نند نے کہا۔

”آپ خود ہی یہ کام کیا کریں نا امی جان!“

”مجھے کبھی خیال رہتا ہے کبھی نہیں۔“

عفت خجل سی ہو کر کہ بولی۔

”اؤہ! آپ لوگ بھی کمال کرتی ہیں، میرا ابا رنگ و روپ بھلا کہاں ہے؟“

عفت کی نند نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”یہ تو تم بہارے بھائی کے دل سے پوچھو۔“

عفت کی اس وقت عجیب پوزیشن تھی نہ وہاں بیٹھے بن پڑتی تھی نہ وہاں

بے جا ناہمی مناسب معلوم ہوتا تھا۔ وہ تو اس وقت منظور اور توبہ وہاں آگئے۔

پونچھی اور داوی دونوں ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ دوسری طرف ملازم بھی

نہاں احمد کا پیغام لے کر آگیا۔

”صاحب آگئے ہیں، آپ کو بلا رہے ہیں“

عفت اپنی ساس اور منہ سے کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے عفت دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اسے اتنی چاہنے والی ساس اور مندی ملی ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو شہاب اہلہ پہ آڑے ترچھے لیٹے ہوئے سگرٹ کے مرغوبہ اُڑا رہے تھے۔ انہوں نے نہ کپڑے بدلے تھے نہ جوتے اتارے تھے۔ البتہ کوٹ اتار کر بے ترتیبی سے بستر پہ ایک لٹ بھینک دیا تھا۔ یوں بے ترتیبی سے لیٹے ہوئے کچھ سوچے ہوئے وہ عفت کو بہت اچھے لگے۔ وہ دروازے کا پردہ تھلے چپ چاپ کھڑی پیار بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی شہاب احمد نے ایک دم گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے۔

”کیا دیکھ رہی ہے ہماری حقورانی؟“

عفت ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرے ان کے قریب آگئی۔

”کیوں جناب؟ کیا سوچ رہے تھے آپ؟“

”آپ ہی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔“

”بھوٹ“

”بالکل سچ۔“

”اچھا چلے مان لیا۔“

شہاب احمد نے سچا ہوا سگرٹ اس کے ہاتھ میں بٹھائے ہوئے کہا۔

”اسے ایش ٹرے میں ڈال دو۔“

عفت نے سگرٹ ایش ٹرے میں ڈالنے ہوئے کہا۔

”اور کچھ“

”اور یہ بتاؤ کہ دیکھ آئیں اپنی بھابھی کو؟“

”جی۔“

”کیسی ہیں؟“

”بہت اچھی ہیں۔“

”تم سے زیادہ اچھی ہیں؟“

عفت منہ سے کہہ بولی۔

”میں بھلا کیا چیز ہوں؟“

”یہ تو ہمارے دل سے پوچھو۔“

”ابھی فلاپر پہلے ہی بات آچا بھی کہہ رہی تھیں۔“

”اچھا!“

”جی۔“

پھر عفت نے ایک دم پوچھا۔

”آپ آپ سے ملنے نہیں گئے؟“

”میری ان سے شام کی سی ملاقات ہو گئی تھی۔“

”اچھا!“

”ہاں! ہمارے جلنے کے پانچ، دس منٹ بعد ہی تو آئی تھیں وہ۔“

پھر عفت، شہاب احمد سے پارٹی کی تفصیلات پوچھنے لگی۔ ادھر ادھر کی باتوں میں

لڑکھٹ کا ذہن مصروف ہو گیا۔ شام کو وہ جس ذہنی الجھن سے دوچار تھی۔ اس سے

نجات مل گئی۔ رات گئے تک وہ اور شہاب احمد لال میں بھروسے ہوئے درختوں کے نیچے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ دوسری بہت سی باتوں کے دوران منصور اور ثویب کے مستقبل کا موضوع بھی زیر بحث آیا لیکن شہاب احمد نے ہمیشہ کی طرح اس موضوع کو ٹال دیا۔ اور عفت ہمیشہ کی طرح حیرت زدہ رہ گئی اور سوچنے لگی۔ آخر شہاب احمد دونوں بچوں کے بارے میں مجھ سے بات کرتے ہوئے کیوں کتراتے ہیں؟

کیا اپنے بچوں کے معاملے میں انہیں میری ذات پر بھروسہ نہیں۔

لیکن اس کا دل اس بات کو ماننے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔

اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے شادی ہی نہ کرتے۔

عفت جب سونے کے لئے بستر پر لیٹی تو اس کے دل و دماغ پر بہت بوجھ تھا۔

شہاب احمد اسی کی طرف کروٹ لئے بے خبر سو رہے تھے۔

لیکن عفت کی آنکھوں میں غینہ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

وہ دانتا ہوا تھوڑا سا کسے نیچے رکھے شہاب احمد کی طرف دیکھتی رہی۔

اول بے خبر سوتے ہوئے وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔

عفت نے سوچا

یہ شخص

جو حامل سے آنے والی ہواؤں کی خوشبو کی مانند میری زندگی میں آیا۔

جس کی آنکھوں سے امنڈتی ہوئی پیلہ کی برکھارت بڑی خاموشی سے میرے

ہوش و حواس پر اثر انداز ہوتی رہی۔

میں نے جانتے بوجھتے ہوئے اسے اپنے دل میں نہیں بسایا۔

اس کی گفتگو کا دھیما پن

اس کی شخصیت کا سمجھ

اُتر کے قلمروں کی مانند حیرے دھیرے میرے دل کے نہاں خانوں میں ٹپکتا رہا
یہ سب کچھ بالکل غیر احتیاری طے پر ہوا۔

حقیقت کا انکشاف اس وقت ہوا جب میرے قدم بہت دور تک جا چکے تھے۔

شہاب احمد!

اب تک میں نے آپ کے جتنے بھی روپ دیکھے ہیں۔

سب مجھے پسند ہیں

بے حد پسند ہیں۔

میرا دل کبھی کسی کو دیکھ کر اس انداز سے نہیں دھڑکا۔

جس طرح آپ کو دیکھ کر دھڑکا اور دھڑکتا ہے۔

کیا محبت یہی نہیں ہے؟

کیا چاہت یہی نہیں ہے؟

الفاظ ہی سب کچھ نہیں ہوا کرتے شہاب احمد!

دل کے جذبات ہمیشہ ہی تو اظہار بیان کے محتاج نہیں ہوا کرتے۔

آپ میری زبان سے یہ سننے کے متمنی کیوں تھے۔

کر مجھے آپ سے محبت ہے یا نہیں؟

میں نے کہا تھا نا! کہ وقت ہی ہمارے جذبات و احساسات کی بہترین عکاسی

کر سکتا ہے۔

میں آج بھی یہی کہتی ہوں۔

معلوم نہیں! اتنے عرصے میں آپ میرے جذبہ دل کو پوری طرح سمجھ بھی

سکے یا نہیں؟

مگر۔۔۔

یقین کیجئے شباب احمد!

خدا کے بعد اگر کسی کے سامنے محبت و عقیدت سے سر جھکانے کو جی چاہتا

ہے تو۔۔۔

وہ آپ ہیں

صرف آپ ہیں

لیکن یہ باتیں زبان سے کہنے کی نہیں شباب احمد!

ہمارا عمل ہی سب کچھ کہ جانا ہے۔

آپ سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہیں۔

وہ بے اختیار ہو کر شباب احمد کی طرف قدرے جھک آئی اور ان کے دونوں

ہاتھ آہستہ سے تھام کر آنکھوں سے لگا لئے۔

پھر اس کے گرم گرم لبوں نے بے اختیار شباب احمد کے دونوں ہاتھوں کو

چوم لیا۔

جانے کتنے لمحے گزر گئے۔

وہ اسی طرح جھکی رہی۔

شباب احمد اس کے جذباتوں سے بے خبر گری، پر سکون بندھ سوراہے تھے۔

عفت نے دوبارہ اپنے شکستے پر سر رکھا تو استغاثی اور مزہوم سی الجھنیں پھر اس کے

ذہن میں آئیں۔

اس نے حیران ہو کر سوچا۔۔۔

اے! یہ کیسی الجھنیں ہیں؟

میرے من میں کوئی چور نہیں

میرادل اور میرا ضمیر سب صاف ہیں۔

پھر اس حقیقت کے انکشاف پر میں کیوں پریشان ہو گئی کہ نہ بہت ذیشان کی

ہن ہے۔

ذیشان کو اگر مجھ سے محبت تھی تو اس میں میرا کیا قصور؟

میرے قدم تو کبھی بھی ذیشان کی طرف نہیں بڑھے۔

ذیشان نے مجھے چاہا تھا۔

میں نے تو ذیشان کو نہیں چاہا۔

ہم کسی کے جذبات کے آگے بند کس طرح باندھ سکتے ہیں؟

ہم کسی دوسرے شخص کو محبت کرنے سے کیسے باز رکھ سکتے ہیں؟

جب کہ کسی کو دیا جاتا یا نہ چاہتا۔۔۔

کسی سے محبت کرنا یا نہ کرنا خود اس شخص کے اختیار میں بھی نہیں ہوتا۔

پھر اس نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو سمجھایا کہ۔۔۔

شاید اس ساری الجھن اور پریشانی کا سبب صرف یہ ہے کہ اگر ذیشان کے

دل میں اب بھی میرا خیال ہے تو زندگی میں کسی موقع پر نادانستگی میں ہی اس کی نگاہیں اس راز کو افشا نہ کر دیں۔

اور جب رازِ دل سینے کی گہرائیوں سے نکل کر نگاہوں تک آجائے تو کبھی کبھی اتنا بڑا طوفان آجاتا ہے کہ۔

زندگی کی ساری خوشیاں

ساری مترتیں

اور تمام سکون اس کی نذر ہو جاتا ہے۔

دل سے نگاہوں تک آنے والے راز بعض اوقات ایسی تند و تیز آندھی بن کر

چھا جاتے ہیں کہ۔

ہر سمت اندھیل چھا جاتا ہے۔

اڑتے ہوئے گولوں کی دھند میں کچھ نظر نہیں آتا۔

ور جب آندھی ٹھنٹی ہے تو صوب کچھ تہہ و بالا ہو چکا ہوتا ہے۔

طوفان

آندھیاں

اور سیلاب۔

سوائے تباہی و بربادی کے زندگی میں کچھ اور بھلا کب دے کر جاتے ہیں؟

شاید یہی اندیشے تھے جو عفت کے ذہن کو الجھاتے ہوئے تھے۔

اسے اپنے آپ پر بھروسہ تھا۔

اپنی ذات پر اعتماد تھا۔

لیکن دیشان۔

مستقبل کی دھند سے اس کی نگاہیں جب بھی بھاٹکتیں۔

عفت کو ان نگاہوں سے خوف آتا تھا۔

اس نے سوچا۔

علائکہ یہ بھی ممکن ہے کہ۔

میرے سارے اندیشے

میرے تمام دوسرے

بالکل بے بنیاد ثابت ہوں۔

جو کچھ میں سوچ رہی ہوں۔

ایسا نہ ہو، بالکل نہ ہو

زندگی کی یونہی سکون اور اطمینان سے گزر جائے۔

لیکن یہ دل اور اس کی بے ترتیب دھڑکنیں

انہیں کنٹرول کرنا عجیب اس قدر دشوار کیوں لگ رہا ہے؟

یہ کیسی صدا تیں ہیں جنہوں نے شام سے میرا دامن تھام رکھا ہے؟

خداوند! تو میرے دل و دماغ کو سکون دے۔

اس نے شباب احمد کا ہاتھ تھام کر اپنے رخسار کے نیچے رکھا اور سونے کی

راشش کرنے لگی۔

اور پھر۔۔۔ فرخ بھائی کی شادی ہو گئی۔ نہ بہت دامن بن کر گھر میں آگئی شادی

باز دیشان کی شرکت کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ کینیڈا میں تھا اور کینیڈا کوئی میل،

دوبل پرتو تھا نہیں جو دیشان بہن کو دہن بنا ہوا دیکھنے کے لئے آجاتا۔ البتہ دیشان کے بڑے بھائی عمران جرمی سے آگئے تھے۔ انہیں دیکھ کر حقت کو احساس ہوا کہ دونوں بھائیوں کی شکل و صورت خاصی ملتی ہوتی تھی۔ جب کہ چھوٹے بھائی کی شکل مختلف تھی، نرہ۔ تہ کی شکل تینوں بہنوں میں پیاری تھی۔ ثروت۔ دیشان کی وہ بہن جو ایک حادثے میں فوت ہو گئی تھی اس کی شکل سب بہن بھائیوں سے مختلف تھی۔ شادی سکون و اطمینان سے ہو گئی۔ دیشان نے اپنے خط میں بہن کو ڈھیروں پیارا اور دعائیں لکھ بھیجی تھیں۔ ماں، باپ اور بھائیوں، بہنوں کو دیشان کی کمی بہت محسوس ہو رہی تھی ہر موقع پر اس کا ذکر ضرور ہوتا تھا۔

اماں اور بھائی میاں ہو سکے گھر میں آ جانے سے بہت خوش تھے۔ بچے بعد دیکھ کر چار بیٹیوں کو یہاں سے بعد سے انہیں اپنا گھر سونا سونا لگنے لگا تھا۔ عفت جب بھی جیکے جاتی تھی۔ اماں گھر کے سناٹے اور دیرانی کا لونہ اونے بیٹھ جاتی تھیں، بھائی میاں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے خرم اور فوزی فرخ بھائی کے پیچھے پڑ جاتے کہ اب آپ شادی کے لئے ہاں کر دیجئے، اب تو گھر میں بھیا بھی آ ہی جانی چاہیئے گھر میں بھیا بھی کیا آئیں گھر کا نقشہ اور ماحول ہی بدل گیا۔ جسے دیکھ کر کلا پڑتا تھا عفت دل ہی دل میں دعا کرتی۔

خدا یا! ہمارے گھر کی خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔

میرے بابل کے آگن میں یونہی سکون و اطمینان بھرے فتنے کو بچے تریں۔

بابل کے آگن میں سکون و اطمینان بھرے فتنوں کے کو بچنے کی دعا کرتے ہوئے

عفت سے فہن نے اپنے سسرال کو ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کیا اس کا

نشین ثواب وہی تھا۔ اس کی خوشیاں ثواب اسی گھر سے وابستہ تھیں اس کے دل کے سکون و چین کا تعلق ثواب شباب احمد کی ذات سے وابستہ تھا۔ وہی اس کا زندگی تھے۔ دعائیں تو وہ اپنی اور شہاب احمد کی زندگی پر سکون انداز سے گزرنے کی کہانتی تھی۔ لیکن۔

جانے کیا ہوا؟

جانے کس کی نظر لگ گئی؟

سمندر کی پرسکون سطح پر ایک کنگرہ گرا

لہروں میں اضطراب پیدا ہو گیا

ایک بلبل سی مچ گئی

اس روز شہاب احمد ایک ڈنر میں مدعو تھے۔ جانا تو عفت کو بھی تھا لیکن اس

کی طبیعت اس روز صبح ہی سے بہت کسمند تھی۔ شہاب احمد شام کو اس سے اصرار

بھی کرتے رہے کہ حمت کر کے تم بھی چلی چلو۔ طبیعت ہل جائے گی۔ گھر میں بیڑے

پڑے اور گھر اوڑھ لیکن عفت کی حمت ہی نہ ہو سکی۔ شہاب احمد اسے آرام کرنے کی

ہدایت کر کے اور دو اتیں وقت پر کھانے کی تنبیہ کر کے تنہا ہی چلے گئے۔

رات کو شہاب احمد کی واپسی بہت دیر میں ہوتی۔ سارا گھر سو گیا لیکن

شہاب احمد تھے کو کسی طرح آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ عفت کو کسی پل

چین نہیں پڑ رہا تھا۔ کبھی اٹھ کر در پیچے میں کھڑی ہو جاتی کبھی باہر راہداری میں زنگ

آتی، دل زیادہ گھبراہٹ اور راہداری کی سیڑھیاں اُتر کر لان تک پہنچ جاتی۔ آخر کار تھک ہار کر

وہ راہداری کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ وہیں بے مدد تھنڈی تھی۔ نومبر کی آخری راتوں کی شکل

و خطا کی باہنوں میں سما گئی تھی۔ عفت نے شال کو اپنے گرد ٹھیک سے پلٹا اور دل ہی دل میں ٹیلیفون والوں کو برا بھلا کہنے لگی۔ جو دو روز سے ٹیلیفون ٹھیک کرنے نہیں آئے تھے ورنہ وہ شہاب احمد کو ٹیلیفون کر کے ہی اتنی ناخبر کا سبب معلوم کر لیتی۔ ٹھنڈی زمین اسے سخت تکلیف دے عسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ شہاب احمد کی گاڑی آکر پورچ میں رکی عفت نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور بے قرار ہو کر کھڑکی پر ہوتی۔ گاڑی بند کر کے شہاب احمد اس سمت آئے جہاں عفت ان کی منتظر تھی۔ شہاب احمد اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکے اور پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ راپداری میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی میں عفت نے دیکھا۔ شہاب احمد کے چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے۔ ایسے تاثرات — جو عفت نے اس سے پہلے کبھی ان کے چہرے پر نہیں دیکھے تھے۔

ایک الجھن، ایک نلکہ۔

کچھ پشیمانی اور ندامت

عفت کی طرف ان کے بڑھتے قدم جانے کیوں رک گئے تھے؟

عفت کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ حیران پریشان کھڑی سمجھنے اور سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پھر وہ کسے بغیر نہ سکی۔

”آئے نابار کیوں گئے؟“

عفت اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے پلٹی تو شہاب احمد بھی اس کے

پیچھے چل دیئے۔

عفت نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بڑی دیر کر دی آپ، نے“

”اے! بس کچھ دیر ہو ہی گئی۔“

شہاب احمد نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ وہ اس سے خاصے فاصلے پر کھڑے تھے۔

کوٹ اتار کر انہوں نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی۔ جوتے، موزے اتارے۔ لیکن یہ

بارے کام انہوں نے عفت سے دور بیٹھ کر ہی کیے۔ عفت کھلے یہ سب

دراں قدر غیر متوقع تھا کہ وہ آگے کچھ کہہ نہ سکی۔ حیران حیران سی بیٹھی ان کی

زن دیکھتی رہی اور شہاب احمد کا حال یہ تھا کہ وہ اس سے نگاہیں نہک نہیں مارتے

تھے پھر ڈریسنگ روم کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”تم ابھی تک سوئیں نہیں۔“

ان کا یہ جملہ عفت کو مزید حیران کر گیا۔

اس نے سوچا۔

آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں شہاب صاحب؟

آپ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ آپ آئے کھڑے واپس آنے سے پہلے میں نہیں

رکتی تھی۔

شہاب احمد اسے حیران اور سوچوں میں غم چھوڑ کر ڈریسنگ روم میں چلے

یہ وہ واپس آئے تو عفت اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بستر سے خاصے

درتھے کے پیٹ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ کمرے میں بڑی مجبوری خاموشی

چھپائی ہوئی تھی۔

شہاب احمد نے کہا۔

”میرا خیال تھا تم سو گئی ہو گی۔“

”میں آپ کی منتظر تھی، کیسے سو جاتی؟“

”تم یہ بات جانتی ہو نا! ان دنوں تمہیں آرام کی کتنی سخت ضرورت ہے؟“

عفت خاموش رہی۔

”تمہیں کم سے کم آٹھ گھنٹے ضرور سونا چاہیے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

”تو پھر تم نے اپنے ساتھ یہ یاد دہانی کیوں کی؟“

”مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔“

”لیکن تم سے تو ڈاکٹر نے کہہ رکھا ہے، اگر نیند نہ آئے تو بلا ناٹل خواب آؤ۔“

گولی کھالیا کرو۔“

عفت اقبالین پر نگاہیں جمائے سوچوں میں ڈوبی بیٹھی رہی۔

شہاب احمد نے وہیں کھڑے کھڑے بے حد پیار سے کہا۔

”چلو، اب سو جاؤ، شاباش!“

عفت نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اور آپ؟“

”ہاں! ظاہر ہے میں بھی سوؤں گا۔“

”تو پھر انتظار کس بات کا ہے؟“

”نہ ایک سگریٹ اور پی لوں“

عفت ایک دبی ہوئی سانس لے کر پھر سوچوں میں ڈوب گئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

شہاب احمد! اگر شہ پندرہ منٹ سے آپ جس رویے کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس سے کیا سمجھوں؟

آپ گھر آتے ہیں تو آپ اب بھی انداز ہوتا ہے؟

نہ ہونٹوں پر بکھری ہوئی وہ مخصوص مسکراہٹ

نہ آنکھوں سے چمکتی ہوئی وہ پیار کی اسرت

نہ میری طرف بڑھتے ہوئے بے تاب قدم

نہ میرے وجود کو اپنی بائیں سیٹ لینے کی بے قراری۔

ہماری شادی کو تقریباً سال بھر ہونے والا ہے۔

یہ آج جیسا انداز تو میں نے ایک دن بھی نہیں دیکھا۔

یہ کیسا فاصلہ قائم کئے کھڑے ہیں آپ میرے اور اپنے درمیان؟

آپ کے بٹھرے ہوئے قدم میری سمت بڑھتے کیوں نہیں؟

آپ کی گرم گرم سانسیں میرے چہرے سے ٹکراتی کیوں نہیں۔

میرے شانوں کو آپ کے مضبوط ہاتھوں کے دباؤ کی عادت پڑ گئی ہے

شہاب احمد!

میں منتظر ہوں شہاب احمد!

میں منتظر ہوں۔

میری محبت تو اسی پرانے انداز کی خواہاں ہے۔

اور آپ کا یہ حال ہے کہ نکاہیں ملا کر بات بھی نہیں کرتے۔

پر کیسا امتحان ہے؟

خدا را کچھ تو بتائیے

کچھ تو کہئے۔

عفت نے ایک دفعہ پھر شہاب احمد کی طرف دیکھا اور آہستہ قدموں

سے چلتی ہوئی ان کے قریب آگئی۔

چند سیکنڈ ان کی طرف دیکھتی رہی پھر پوچھے بغیر نہ سکی۔

”مجھ سے کیا خطا ہوئی ہے شہاب احمد؟“

شہاب احمد نے تڑپ کر اسے اپنے سینے سے لگایا۔

”تم سے کوئی خطا نہیں ہوئی عفتو! میری عفتو!“

لیکن جس تڑپ اور تیزی سے شہاب احمد نے اسے اپنے سینے سے لگایا تھا

اس سے کہیں زیادہ تیزی سے عفت نے ان سے الگ ہو گئی۔

اس کے شانوں پر پڑی ہوئی شال ڈھلک کر قالین پر گر پڑی لیکن عفت کو

اسے اٹھا لینے کا خیال نہ آیا۔

وہ سمی ہوئی لگا ہوں سے شہاب احمد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شہاب احمد کے پرے پر اڑتا ہوا اندامت کا دھواں اسے صاف نظر

رہا تھا۔

عفت نے دل ہی دل میں کہا۔

اچھا تو دیر سے آنے کا سبب یہ تھا شہاب احمد!

لگا ہیں نہ ملا کر بات کرنے کا سبب بھی یہی تھا؟

پیر سے اور اپنے درمیان اتنا فاصلہ قائم رکھنے کی وجہ یہ تھی۔

پر کیا کہہ بیٹھے ہیں آپ؟

اور کیوں کہہ بیٹھے ہیں؟

آپ سے پوچھوں؟

یا نہ پوچھوں؟

آپ نے تو میرے دماغ کو کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔

میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ میں کیا محسوس کر رہی ہوں؟

یوں۔۔۔ جیسے ایک قیامت سی آگئی ہو

یوں۔۔۔ جیسے میں بالکل بے جان ہو کر رہ گئی ہوں۔

مٹی کا ایک ڈبیر۔

بے سکوت و بے آواز

وہ شہاب احمد کی طرف اور شہاب احمد اس کی طرف دیکھے جا رہے

تھے۔ پھر عفت نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور بہت متانت

سے پوچھا۔

”کیا یہ حرکت پہلی دفعہ سرزد ہوئی ہے آپ سے؟“

شہاب احمد خاموش رہے۔

عفت نے کہا۔

”اگر آپ سچ بولیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔“

شہاب احمد نے انکار میں سر ہلایا۔

”خوب! تو بے شغل کتنے عرصے سے جاری ہے؟“

شہاب احمد کچھ نہیں بولے۔

عفت نے کہا۔

”غالباً شادی سے پہلے سے شوق فرماتے رہے ہیں آپ“

شہاب احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔

عفت نے تکیہ جتوں سے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

”اور مجھے لاعلم رکھا آپ نے۔“

”دل تو چاہتا تھا کہ تمہیں بتا دوں“

”پھر دل کی بات زبان تک کیوں نہیں آتی؟“

”میں تمہارے دل کو کوئی تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔“

”اور آج میرے دل پر کیا کچھ گزرتی اور گزرتی رہی ہے، اس کا اندازہ ہے

آپ کو؟“

”میں نے ارادہ کیا تھا عفت! کہ اگر تم میری ہو گئیں تو میں اس چیز کو ہاتھ

بھی نہیں لگاؤں گا۔“

عفت خاموشی رہی۔

”تم مجھے بتاؤ، آج سے پہلے تمہیں مجھ سے یہ شکایت ہوئی؟“

عفت بھر بھی چپ رہی۔

”دراصل تم اتنی اچھی لڑکی ہو عفت کہ میں.....“

وہ ایک لمحے کے لئے رکے۔

”میں چاہتا تھا کہ میں اس عادت کو خاموشی سے ترک کر دوں اور تمہیں پتہ بھی نہ

ہو سکے۔“

”کیا نہ پتہ چل سکے؟“

”یہی کہ میں کبھی اس قبیح عادت میں بھی گرفتار رہ چکا ہوں۔“

”ہوں۔“ عفت کھوٹی کھوٹی سی آواز میں بولی۔

شہاب احمد نے جبکہ کہ اس کی مثال کندھوں کے گرد لپیٹے ہوئے کہا۔

”میری مدامت کا ذرا بھی اندازہ نہیں نہیں؟“

عفت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”میرا خیال تھا تم سوچیں گی ہوگی لیکن جب میں نے تمہیں جاگتے دیکھا تو میرے قدموں

میں اتنی سکت نہیں تھی کہ تمہاری طرف بڑھ سکیں۔“

”جی! یہ تو میں نے دیکھ ہی لیا تھا۔“

”دوسری طرف مجھے یہ بھی خیال تھا کہ میرا یہ انداز تمہارے لئے حیران کن بھی

ہوگا اور تکلیف دہ بھی“

”کوئی بات اچانک اور توقع کے بالکل برعکس ہو تو حیرانی تو ہوتی ہی ہے۔“

شہاب احمد نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

”ناراض ہو؟“

”مجھے یقین ہے میری ناراضگی میری پریشانی کا حل ثابت نہیں ہوگی مگر“

”تو بچ ایک دفعہ سکڑا ہی دو۔“

عفت نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”بہر حال! آئندہ سے میں آپ کا پروگرام ضرور جاننا چاہوں گا۔“

”تم جو حکم دو۔“

”حکم — اور میں دوں؟“

”ہاں!“

”مجھے نہیں معلوم وہ کون سی بیویاں ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں کو حکم دیا کرتی

ہیں۔“

شہاب احمد کی آنکھوں میں حیرانی سی سمٹ آئی۔

”میں تو صرف آپ سے درخواست کر سکتی ہوں کہ آپ آئندہ یہ کبھی نہ کریں۔“

جو آج کیا ہے۔“

شہاب احمد جانے کن سوچوں میں ڈوب گئے۔

عفت نے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم میرے الفاظ میں کتنا اثر ہے، مجھے دوسری عورتوں کی

طرح لڑائی جھگڑا کرنے کی بھی عادت نہیں۔“

شہاب احمد جس انداز سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا

تھا کہ انہیں اس کی باتوں سے اتفاق ہے۔

عفت نے شمال اتار کر بیستر پر بھی اور کپڑے بدلنے چلی گئی۔ کپڑے بدل کر آئی

تو شہاب احمد آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ عفت نے یثوب لائٹ بجھا کر مدغم

بلوں روشنی والا بلب جلایا اور سونے کے لئے لیٹ گئی۔

لیکن —

اس کی نیند جانے کن ویرانوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔

ان گنت سوچیں تھیں جو ذہن پر پے در پے ہتھوڑے برس رہی تھیں۔

دل پر اتنا بوجھ تھا جیسے ایک سنگ گراں آٹھا ہو۔

جب شہاب احمد سے پنانے کے خواہاں تھے تو یہ بات اس نے قطعی فراموش

میں کی تھی کہ —

شہاب احمد کا ماحول اس ماحول سے بالکل مختلف ہے جس میں خود اس نے

دھکولی تھی۔

شہاب احمد کے ماحول میں پرورش پانے والے لوگوں میں جو ”خوبیاں“ ہوتی

ہیں ان کا بھی عفت کو اندازہ تھا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ شہاب احمد کے ماحول اور ان کے شیش کو رکاوٹ

لگے ہوتے اس نے ان کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اتنی بھی

بال نہیں تھی جو اس بات سے بے خبر رہتی کہ شہاب احمد کے ماحول اور سماجی

ماہی ہونے والے بیشتر لوگ اس عادت میں مبتلا ہوتے ہیں جس کی تصویر آج

اب احمد نے دکھائی تھی۔

لیکن پھر بھی جانے کیوں؟

وہ آج ریزہ ریزہ ہو کر کبھی گئی تھی۔

اپنی ہی ذات کے چہنچہے ہوئے ریزوں سے اس کا وجود ہولناں ہو جاوے۔

اسے یہ سوچ کہ حیرت ہو رہی تھی کہ اسے شہاب احمد کی ذات پر اس قدر زبردست اعتماد کیوں تھا؟

یہ سچ تھا کہ اس نے شہاب احمد سے اندھا دھند محبت نہیں کی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے انہیں نہیں چاہ بیٹھی تھی۔ کس قدر سوچا تھا اس نے اپنی زندگی کے اس مسئلے پر اور کتنا غور کیا تھا۔

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ —

بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے پر بھی ٹھوکر لگ ہی جاتی ہے۔ اس نے سوچا —

اگر میری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو رو کر اپنے دل کا غبار کم کر لیتی۔ لیکن میں کیا کروں؟ مجھے تو رونا بھی نہیں آتا۔

خداوند! میرے پاس آنسوؤں کے خزانے کی اتنی کمی کیوں ہے؟ وہ کہ وہیں بل بدل کر سوچتی رہی۔

اور شہاب احمد اس کی سوچوں سے بے خبر گری نیند سونے رہے۔ معلوم نہیں یہ حقیقت تھی یا غرض عفت کا خیال —

کہ شہاب احمد کچھ زیادہ ہی گری نیند سوریے تھے۔ شاید یہ شراب کا خمار تھا۔

شہاب احمد کا گنا تھا کہ شادی کے بعد ان سے یہ حرکت پہلی مرتبہ سرزد ہوئی تھی۔

عفت نے سوچا —

معلوم نہیں ان کی اس بات میں کتنی صداقت ہے۔

میں بہت دفعہ دو دو، تین تین دن رہنے کے لئے اتنی کے پاس گئی ہوں۔ اپنی خواہش کو پورے کرنے کے کتنے بہترین مواقع ملے ہوں گے انہیں۔

ان کے بزنس ٹرپ پر بعض اوقات میں ان کے ساتھ مہینے جاسکتی ہوں کیسے یقین کر لوں کہ انہوں نے ان موقعوں کو گنوا یا ہوگا۔

اعتماد کی دیوار مزلزل ہو جائے تو یقین اور بے یقینی کے دو رہے پر لڑے ہو کر آئندہ زندگی گزارنے کا خیال کس قدر دستاورد ہوتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت عفت کی بھی ہو گئی تھی۔

مسجد دل میں فہر کی اذانیں ہونے لگیں۔ عفت کی آنکھیں بے خواب ہی ہیں اس نے اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی اور دوبارہ بستر پر اکھ لیٹ گئی پھر تھوڑی دیر بعد اسے نیند آگئی۔ وہ سو کر اٹھی تو دن چڑھا تھا شہاب احمد آفس جا چکے تھے۔ اسے اٹھائے بغیر اس سے ملے بغیر شہاب احمد کا چلے جانا اسے بہت تکلیف دہ محسوس ہوا وہ اداس اداس سی سوچوں میں کھوئی ہوئی کافی دیر بستر پر بیٹھی رہی۔ جیسی اس کی ساس اندر آگئیں۔ ان کے چہرے پر تشویش تھی اور آنکھوں میں سوچ و فکر کے سائے عفت احتراماً اٹھ کھڑی ہو گئی اور انہیں سلام کر کے بیٹھنے کے لئے کہا۔ عفت کی طرف سے آج ایک خلاف توقع بات ہوئی تھی۔

عفت کے دل و دماغ پر اب اس بات کا بوجھ تھا کہ شہاب احمد اسے اٹھائے
 فیروز اس سے ملے بغیر آفس چلے گئے۔ دوپہر ٹیلیفون ٹھیک کرنے والے آئے تو
 عفت نے سوچا۔ شاید شہاب احمد ٹیلیفون کریں اور ہوا بھی ہی۔ ٹیلیفون
 بمارٹنٹ والے گئے ہی تھے کہ شہاب احمد ٹیلیفون آگیا۔ وہ بار بار ملامت کا طہار
 کرتے جا رہے تھے۔ معذرت پر معذرت کر رہے تھے، شام کو وہ آفس سے آئے تو
 ان کا وہی پرانا انداز تھا۔ وہ عفت سے اس طرح ملے جیسے ہمیںوں بعد اسے دیکھا ہو
 اس کے اُلجھے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے ان کی انگلیاں ہی نہیں تھکتی تھیں۔
 کس قدر والہانہ پیہ تھا ان کی نگاہوں میں۔

اور عورت کا دل

وہ تو پیار کی ذرا سی آہنچ پاکر ہی پگھل جاتا ہے۔

وہ مرد کی غلطیوں کو ایک بار نہیں، بار بار نظر انداز کرتی ہے۔

شہاب احمد کے زانوؤں پر سر رکھے عفت دھیرے دھیرے مسکاتی رہی۔

زندگی پھر اسی حسین انداز سے گزرنے لگی۔ اپنی شادی کی پہلی سالگرہ شہاب احمد
 نے بڑے دھوم دھام سے منائی۔ نہ صرف شادی کی سالگرہ بلکہ عفت کے بار بار
 خیر کرنے کے باوجود خود اس کی سالگرہ بھی انہوں نے منائی۔ عفت کو یہ سب کچھ
 قطعی پسند نہیں تھا۔ لیکن شہاب احمد کے محبت بھرے اصرار کے علاوہ اسے یہ
 بھی خیال تھا کہ اس قسم کی تقریبات اس سوسائٹی کے آداب میں شامل تھیں۔ جو
 اب نہ صرف شہاب احمد کی بلکہ خود اس کی سوسائٹی بھی تھی۔

اور جب عفت کے یہاں ایک بیٹے کی عید آتش ہوئی تو اس کی ساس تو جس قدر

اس لئے ان کی پریشانی بجا تھی۔ انہوں نے بڑے پیار سے عفت کو اپنے سینے سے
 لگایا اور دعائیں دے کر اس کی خیر خواہی پوچھنے لگیں۔ عفت نے اپنی طبیعت
 کی خرابی کا ہمانہ بنا کر رات کی بے خوابی کا ذکر کیا۔ شہاب احمد کے دیر سے آنے
 کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن انہیں اپنے بیٹے کے رات گئے گھر لوٹنے کی خبر تھی۔ وہ
 عفت سے اصرار کرنے لگیں کہ آج پھر جا کر ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کروادو اور دوا
 پابندی سے کھاؤ۔ پھر اپنے بیٹے کو کچھ لغت ملامت کرتے ہوئے بولیں۔
 ”میں اسے سمجھاؤں گی کہ ان دنوں تمہارے دل و دماغ پر کسی قسم کی فکر و پریشانی
 کا بوجھ نہ ڈالے۔“

عفت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں امی جان! آپ ان سے کچھ نہ کہیں، وہ تو بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔“

”اسے تمہارا خیال رکھنا بھی چاہیے، تم سہی میرا لڑکی اسے نہیں مل سکتی تھی۔“

عفت شرمندہ ہو کر بولی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے امی جان!“

”نہیں بیٹی! میں تو کہتی ہوں وہ تمہاری جتنی بھی قدر کرے کم ہے۔“

عفت سر جھکا کر خاموش بیٹھی رہی۔

شہاب احمد کی والدہ اُٹھتے ہوئے بولیں۔

”چلو اٹھو! ناشتہ کر لو۔“

عفت کا دل تو بالکل نہیں چاہ رہا تھا، لیکن وہ اتنی محنت سے اصرار کر رہی
 تھیں کہ دو دفعہ کے بعد تیسری دفعہ انکار کرنے کی اس میں ہمت نہ ہو سکی۔

داری صدقے ہوئیں وہ الگ تھا۔ خود شہاب احمد پہلے سے بھی زیادہ اس کا خیال کئے لگے۔ ان کی غبت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ حالانکہ ظاہر ہے وہ پہلو بھی کا بچہ نہیں تھا شہاب احمد کو خدا نے منصور اور ثوبیہ کی شکل میں بیٹے اور بیٹی دونوں سے ہی نوازا تھا۔ عفت کی چھوٹی نند نے بچپے کا نام بڑے پیار سے کا نشان رکھا۔ سب اسے پیار سے کاشی کاشی کہتے لگے۔

کاشی کی پہلی سالگرہ کی خوشی دیکھنے سے پہلے ہی اس کی دلی خدا کو پیاری ہو گئی عفت کو ان کی وفات کا بے حد صدمہ ہوا۔ اسے ان کے ساتھ برسوں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن وہ جتنا عرصہ بھی ان کے ساتھ رہی تھی ان کی غبت اور چاہت عفت کے دل و دماغ پر کھرے لغزش پھوٹے تھے۔ بہت دنوں تک وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکی۔ شہاب احمد حیران ہو کر اس کی اس کیفیت کو دیکھتے تھے شاید انہیں یہ خیال آتا ہو گا کہ —

ارے ابہو کو اپنی ساس سے اتنی غبت بھی ہو سکتی ہے؟

فرخ بھائی اور نرہٹ بھائی کی زندگی بھی بہت سکون اطمینان سے گزر رہی تھی۔ بڑی آیا، چھوٹی آیا اور سعدیہ باجی اپنے اپنے گھروں میں خوش تھیں۔ اماں کو بس سعدیہ باجی کی گود خالی ہونے کی فکر تھی۔ خود عفت کی طرف سے اماں اور بھائی میاں کو جو فکر اور تشویش پہلے تھی۔ وہ اب نہیں تھی۔ ہرین وقتاً فوقتاً شہاب احمد کی شان میں اماں کے سامنے قصیدے پڑھ جاتی تھی۔

کا نشان جیسے جیسے بڑا ہو رہا تھا۔ عفت کے دل و دماغ پر اس کی بہتر سے بہتر حرمت کی فکر سوار ہوتی جا رہی تھی۔ کا نشان کے بارے میں سوچتے ہوئے منصور ادا

ثوبیہ کو اس کے ذہن نے کبھی بھی فراموش نہیں کیا تھا۔ ان دونوں کی تربیت حنا لعل منزلی انداز پر ہو رہی ہیں۔ اپنی دادی کے فوت ہونے کے بعد سے وہ دونوں مذہبی تعلیم سے بالکل ہی بیگانہ ہو گئے تھے اور شہاب احمد کو اس بات کی قطعی فکر نہیں تھی۔ جب تک ساس زندہ تھیں عفت نے اس مسئلے پر چند بار شہاب احمد سے دلی زبان میں گفتگو کی۔ اس نے شادی کے بعد سے ان دونوں بچوں کو اپنی ذمہ داری سمجھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ شہاب احمد اسے یہ ذمہ داری سونپنے کے لئے فطرتاً تیار نہیں تھے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ عفت یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ ویسے اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ شہاب احمد کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کا کوئی نقص نظر نہیں آتا تھا وہ اس سے بالکل مطمئن تھے۔ شہاب احمد سے اس مسئلے پر الجھنے کی اس نے کبھی کو شش نہیں کی۔ لیکن اب صدمت حال بالکل مختلف تھی ایک ہی گھر میں پرورش پانے والے بچوں کی تربیت جداگانہ انداز پر نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ دنیا والوں کو باتیں بنانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اسے احساس تھا کہ ان بچوں کے ساتھ اس کا رشتہ بے حد نازک تھا اسے اس بات کا بھی علم تھا۔ منصور اور ثوبیہ کی نخیال والے اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اس نے دونوں بچوں کو اپنے آپ سے مانوس کرنے کی جتنی الامکاں کو شش کی تھی لیکن وہ ناکام رہی۔ معلوم نہیں ان کے معصوم ذہنوں پر کیسی تصویر نقش کر دی گئی تھی کہ وہ عفت کے سلتے سے بھی گھبراتے تھے۔ منصور کا انداز پھر بھی قدرے بہتر تھا۔ لیکن ثوبیہ کے معصوم دل و دماغ میں وہ ذرا سی جگہ بھی نہیں بنا سکی تھی۔ کا نشان کی پیدائش کے بعد سے اس نے بار بار

منصور اور ثوبیہ کی زبان سے ایسے جملے سنے جو یقیناً ان کے معصوم اور سادہ ذہنوں کی اختراع نہیں ہو سکتے تھے وہ کوئی اور ہی لوگ تھے۔ جو ان کی ننھی ننھی زبانوں کا سہارا لے کر بولتے تھے۔

عفت کو حیرت ہوتی تھی۔

یہ تعلیم یافتہ لوگ —

جن کی عورتوں نے بھی گھروں کی چار دیواری میں رہ کر اپنی زندگیاں نہیں گزاریں تھیں۔

جو علم و ادب کے زلیور سے آراستہ تھیں۔

ان کا "اعلیٰ وارفع، ماحول۔

ان کی ادنیٰ سوسائٹی کے آداب۔

یہ سب کچھ —

یہاں، اس موقع پر کیوں رائیگاں جا رہا تھا؟

علم و ادب کا بیش قیمت خزانہ ان کے ذہنوں کو اتنی سی جلا بخشنے سے

بھی قاصر رہ گیا تھا کہ —

وہ ایک عورت کھانے پر لکھے ہوئے "دوسری ماں،

"سوتیلی ماں، اور "دوسری بیوی" کے الفاظ کو کھرچ پھینکتے؟

بلکہ وہ تو الٹا شغلوں کو اور ہوا دیتے تھے۔

جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کرتے تھے۔

وہ بچوں کے معاملے میں سراسر نیک نیت اور پرہیزگار تھیں۔

لیکن وہ اپنی نیک نیتی اور خلوص کا یقین دلانے کس کس کے پاس جاتی؟

دنیا بہت وسیع تھی —

ہاں بنائے والے لوگ یہاں وہاں بکھرے پڑے تھے۔

چلتے چلتے وہ آبلہ پا ہی جاتی تب بھی کسی نہ کسی سمت سے کڑوے کیلے

بلے سننے کو ضرور ملتے۔

عفت کے ساتھ ایک مشکل یہ تھی کہ اس معاملے میں شہاب احمد اس کے

ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ نہیں معلوم ہوتے تھے۔

معلوم نہیں کیوں؟

عفت کو اس قدر چاہئے اور اس کی ذات پر اس قدر اعتماد کرنے کے باوجود

وہ اپنے بچوں کے سلسلے میں عفت کو کوئی حق دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔

منصور اور ثوبیہ کے معاملے میں وہ بہت جذباتی تھے۔

لیکن بچوں کو ان کے حال پر بھی نہیں جھوٹا جاسکتا تھا۔

اگر بچے بگڑ جاتے تو لوگوں کو یہ کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا کہ اگر انہ

بچوں کی ماں زندہ ہوتی تو بچوں کی عادت و اطوار یہ نہ ہوتیں۔

عفت نے شہاب احمد سے اس موضوع پر از سر نو بات کی لیکن نتیجہ ہمیشہ

ای طرح وہی ٹھاک کے تین پات نکلا۔ اس روز عفت کو پختہ یقین ہو گیا کہ

شہاب احمد کو اس سے چاہے جتنی بھی محبت ہو لیکن اپنے بچوں کے سلسلے

میں وہ اسے کوئی حق نہیں دینا چاہتے تھے۔

انہوں نے صاف صاف کہہ دیا —

”عفت بیگم! آپ صرف اس بچے کی فکر کیجئے جو آپ کا اور میرا ہے ال بچوں کے لئے پریشان ہونے کی آپ کو قطعاً ضرورت نہیں جو میرے اور کسی دوسری عفت کے ہیں۔“

عفت کا دماغ سن ہو کر رہ گیا۔

وہ اپنی آنکھوں میں حیرانی، پریشانی اور دکھ کے جذبات سمیٹے ان کی لڑکتی رہی۔

شہاب احمد نے اگرچہ یہ بات قدرے مسکراتے ہوئے کہی تھی لیکن یہ بھی ان کے جملوں کی کاٹ عفت کے نگینہ دل کو بھٹیس پہنچا گئی۔ چند منٹ بعد جب اس کے ہوش و حواس درست ہوتے تو اس نے مدہم آواز میں کہا۔

”میں حیران رہ گئی ہوں آپ کی زبان سے یہ جملے سن کر۔“

شہاب احمد نے کہا۔

”ہاں! وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟“

”اس لئے کہ میں ان بچوں کو اپنی ذمہ داری سمجھتی ہوں۔“

”میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن تم خود ہی دیکھ لو کہ اتنے عرصے میں وہ بچے تم سے ذرا سا بھی مانوس نہ ہو سکے۔“

عفت نے ان کی بات کا جواب دینا چاہا تو شہاب احمد بولے۔

”یا پھر دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لو کہ تم ان بچوں کو اپنے آپ سے مانوس

نہیں کر سکیں۔“

عفت کے دل و دماغ پر ایک بار پھر تھوڑے سے برس گئے۔

اس نے ایک دہائی ہوئی سالس لے کر سوچا۔

”بہت خوب شہاب احمد! بالآخر قصور وار آپ نے مجھے ہی بھڑایا۔“

اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور بولی۔

”اس سلسلے میں آپ نے کتنا تعاون کیا میرے ساتھ؟ اس کا احساس ہے۔“

شہاب احمد بیزار ہو کر بولے۔

”چھوڑو بھی! کیا ذکر نکال بیٹھیں تم اس وقت؟“

”مشکل تو یہ ہے کہ آپ یہ ذکر نکالنے کے لئے مجھے کوئی بھی موقع نہیں دیتے“

شہاب احمد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

پھر حال! یہ وقت قطعی نامناسب ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں پھر کسی وقت اس موضوع پر آپ سے بات کروں گی۔“

”اس وقت تو تم جلدی سے ہو ٹل چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

عفت نے بڑی بے دلی سے کہا۔ ”اچھا“

یہ سچ تھا کہ اسی نے ”دیج“ میں کھانا کھاتے کا پروگرام بنایا تھا لیکن

بات کی گفتگو کے بعد اس کا قطعی کہیں جانے کا موڑ نہیں رہا تھا۔ اس کا

اوجہ تھا کہ انکار کر دے لیکن اپنی طرف سے بد مزگی پیدا کرنا اس کی عادت

نہیں تھا۔ شہاب احمد درستہجے میں جھک کر جانے کیا سوچنے لگے عفت

بلک دوم کی طرف چلی گئی۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح اہتمام سے تیار نہیں ہوئی۔

الماری کھول کر اس نے بڑی بد دل سے زرد پھولوں والی چاکلیٹی سارٹی لگائی
میک اپ کرنے کو بھی اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن شہاب احمد کو میک اپ
پسند تھا۔ ان کی خوشی اور پسند کی خاطر اس نے میک اپ بھی کیا۔ بالوں کو سمیٹ
کر دھیلا سا جوڑا بناتے ہوئے بڑی بالوس سی سوچول نے اسے آگیا۔ وہ تیار ہو
کر بیڈروم میں آئی تو شہاب احمد نہیں تھے۔

وہ راہداری میں نکل آئی۔ اس نے دیکھا —

راہداری کے آخری سرے پر کاشان کی آبا کھڑی تھی اور شہاب احمد کاشان کو
ہوا میں اچھالتے ہوئے مسکرا میسکر کر اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔ کاشان کی کلاڈل
راہداری میں گونج رہی تھیں۔ عفت قریب پہنچی تو شہاب احمد کاشان کو اس کی آیا
کے حوالے کر کے عفت کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ہوٹل میں بھی عفت کے دل پر پڑ مرگی سی چھائی رہی۔ ہوٹل کا خواب ناک
ساماحول بھی اس کے دل کی کیفیت کو بدل نہ سکا۔ وہ لوگ اندر بیٹھنے کے
بجائے باہر کھلے آسمان تلے بیٹھتے تھے۔

اوپر — سیاہی مائل نیلگوں آسمان پر ستارے جھلک رہے تھے۔

نیچے درختوں میں رنگ برنگے قمقمے ٹٹماتے جا رہے تھے۔

فاصلے فاصلے پر چلتی ہوئی قیدی لیں۔

زمین پر پھیلتے ہوئے درختوں کے سائے۔

رات کے ابتدائی پہر کی دھیمی دھیمی ہوا میں سرسراتے ہوئے پتوں کی

مدھم مدھم گونشیاں۔

پلیٹوں، کانٹوں اور چھول کا بجنا ہوا جلترنگ۔

سامنے ہی مختلف سارول کو سینھالے ہوئے نوجوان لڑکے۔

معزلی دھنیں بجاتے ہوئے۔

اور چیخ چیخ کر گاتے ہوئے۔

عفت کو اپنے دماغ پر تیز صرزیں سی پڑتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

ذہنی تھکن تھی کہ ہر لمحے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

اس کے سامنے اس کی پسندیدہ چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

لیکن وہ کھانے سے زیادہ ہوٹل میں آنے جانے والوں، میزوں کے ارد گرد

بٹھنے والوں، مردوں، معزلی دھنوں پر لگاتے ہوئے نوجوان لڑکوں اور صرزیں

بٹھنے والوں کے چہروں کو تکتے ہوئے جانے کو نسی کہا نیوں کے

نے بنائے بن رہی تھی۔

اس ہوٹل کا خواب ناک ساماحول اسے بہت پسند تھا۔

لیکن اس کے دل پر کچھ ایسا بوجھ لگا ہوا تھا کہ ہوٹل پر خاموشی کی مہر لگاتے

بٹھ رہا ہی اسے غنیمت لگ رہا تھا۔

کھانا ختم ہوا تو شہاب احمد نے اپنے لئے کافی اور اس کے لئے میون آپ

لایا۔ میون آپ کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے ہوئے اس نے شہاب احمد

باز دیکھا وہ کافی کا کپ ہونٹوں سے لگاتے جانے کن سوچوں میں ڈوبے ہوئے

تھے۔

اس لمحے — جانے کیوں؟ عفت کو ایسا غسوس ہوا۔

جیسے — گزرتے ہوئے وقت کے لمحوں نے اس کے اور شہاب احمد کے درمیان ایک دیوار سی کھڑی کر دی ہو۔

عفت کے دل کی گھبراہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔

اس نے شہاب احمد کی طرف قدرے جھکتے ہوئے پوچھا۔

اس قدر چپ چپ کیوں ہیں آپ؟

شہاب احمد نے شکایت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔

”یہی سوال میں تم سے بھی تو کر سکتا ہوں۔“

عفت کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

گھر جاتے ہوئے — رستے میں وہ دونوں بیشتر وقت خاموش ہی رہے

گاڑی سے اتر کر عفت کا شان کے کمرے کی طرف چلی گئی اس کے چچ چچ کہ

رونے کی آواز آرہی تھی۔ اپنے سینے سے لگائے وہ دیر تک کمرے میں ٹھکتی

اور اسے چپ کراتی رہی۔ کاشان سو گیا تو وہ بیڈروم میں چلی آئی۔ شہاب احمد

منہ خرابی کا لباس پہنے درپے کچے میں جھکے سکرٹ پی رہے تھے۔ قدموں کا

آہٹ پر پلٹ کر انہوں نے عفت کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں کا تسلسل بڑی

دیر تک نہیں ٹوٹا۔ شہاب احمد کا یہ انداز عفت کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا

وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔

ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”آپ کیا سوچے جا رہے ہیں؟“

”تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں؟“

”مجھ سے کوئی غلطی ہوئی؟“

شہاب احمد نے اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ مگر عفت کو ان کے انداز

ن وہ پرانی سی گرم جوشی نہیں محسوس ہوتی۔

”عفت!“

”جی!“

”اپنے اور میرے درمیان کوئی دیوار کھڑی کرنے کی کوشش نہ کرو“

”کیسی دیوار؟“

”تمہیں سکون سے رہنا اچھا نہیں لگتا؟“

عفت نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں شہاب احمد؟“

شہاب احمد سنی ان سنی کرتے ہوئے بولے —

”اب کبھی مجھے نہ الجھانا عفت!“

عفت نے مدغم آواز میں کہا۔

اس گھر میں وہی ہو گا شہاب احمد جو ہاتھتے ہیں۔“

شہاب احمد نے قدرے مسکرا کر پوچھا۔

”ناراض ہو کر کہہ رہی ہو یہ بات؟“

”نہیں، میں آپ کی ہو چکی تو آپ کی ہر خوشی اور آپ کی مرضی میری بھی خوشی

لا مرضی ہے۔“

شہاب احمد چند سیکنڈ پیار بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے رہے
پھر ایک دم اس کا رخ درست کچے کی سمت موڑتے ہوئے بولے —
”دیکھو! رات کتنی پُر سکون اور خوب صورت ہے۔“
عفت نے پورے چمکتے ہوئے چاند پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔
”اور چاند کا حسن نہیں دیکھتے آپ؟“
شہاب احمد نے قدرے گردن گھماتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں کہا۔
”چاند کا حسن؟“

”جی ہاں“

”میں تو اس چاند کا حسن دیکھتا ہوں جو میرے گھر کے آئینے میں اتر آیا ہے“
جانے کیوں؟ عفت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ بکھر سکی۔ شہاب احمد
اس کے بالوں میں الجھے ہوئے آویزے کو درست کرنے میں مصروف تھے۔
وہ عفت کے سپاٹ چہرے کو نہ دیکھ سکے۔ عفت شبِ خوابی کا لباس
پہن کر آئی تو شہاب احمد آنکھیں بند کر کے بیٹھے تھے عفت بھی سونے کے لئے
لیٹ گئی۔ لیکن اس رات بھی اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔

ان گنت سوچیں داغ میں پسرا گئے ہوئے تھیں۔

امد — اس کے دل و دماغ میں ایک شور مچا تھا۔

اور باہر — خاموش رات کی باہیں گزرتے ہوئے لہجوں کو سمیٹے ہوئے

تھیں۔

بہت خاموشی تھی۔

اور بڑا استغناء۔

بہت سوچنے اور بہت غور کرنے کے بعد عفت نے فیصلہ کیا۔

اس کی بہن تری اسی میں ہے کہ —

بیکار کی صندوق اور محنتوں میں الجھ کر وہ اپنی اور شہاب احمد کی زندگی میں
انٹے نہ بھرے۔

اپنی آئندہ زندگی کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس کا خیال تھا کہ وہ
ہسکون ہو جائے گی۔

لیکن دل کو پھر بھی جانے کیسی بے چینی تھی۔

سے ہو چکی تھی۔ دونوں نے اپنے قول کو نبھانے کے لئے وقت کے طویل فاصلوں کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ شہلا نے پی۔ ایچ۔ ڈی کر لی تھی اور یوسف اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو چکا تھا۔ ہرین، ہر وزا خیر کی رفاقت میں ہمیشہ کی طرح خوش اور مطمئن تھی۔ خدا نے اسے دو بہت پیاری بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا تھا۔ حزم ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بو۔ کے گیا ہوا تھا۔ فوزی بھی اپنے گھر کو ہو گئی تھی۔ لیکن اماں کو سعیدہ باجی کا تم کھانے جاتا تھا۔ سعیدہ باجی کا بانجھ پن ان کے ماتھے کا سیاہ داغ بن کر رہ گیا تھا۔ ان کی گھریلو زندگی کا سارا سکون اور چین غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ بات بات پر مسکرا نے والی اور دوسروں کو مہنسانے والی سعیدہ باجی — جن کی خوب صورتی بھی کبھی قابل دید تھی۔ اب سرسوں کے پھول کی طرح پتلی پڑ گئی تھیں۔ ان کی زندگی میں اب صرف سسرال والوں کے طعن ہی رہ گئے تھے۔ واری صدقے ہونے والی ساس ندیں اب سعیدہ باجی کے وجود کو اپنے گھ میں برداشت کرنے کے لئے ذرا بھی آمادہ نہیں تھیں۔ صرف ان کی وہ تند — جو کبھی یونیورسٹی میں ان کی کلاس فلورہ چکی تھی۔ ان کے ساتھ کئے جانے والے سلوک کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ شکر ہے اس نے پڑھ کر گد گدوایا نہیں تھا۔ اسے سبب بھی موقع ملتا وہ اپنی اماں اور دوسری بہنوں کو سمجھانے کی کوشش نہ کرتی تھی۔ اس کی اکیلی جان تھی جو سعیدہ باجی کی زندگی میں کسی بھی لمحے آنے والے طوفان کو جانے کس طرح روکے ہوئے تھی۔ یا پھر — اشتقاق بھائی کی محبت سعیدہ باجی کے جیون کی ڈوبتی ابھرتی ناؤ کو سہارا دیتے ہوئے تھی۔

وقت کی اڑتی ہوئی دھول بڑی خاموشی سے گزرتے ہوئے لمحوں پر جمتی جا رہی تھی۔

لمحوں کا ایک کارواں تھا۔

جو چپ چاپ سر بھکائے ہوئے گزر گیا تھا۔

آتی جاتی رُتوں نے زندگی کے بدلتے ہوئے رنگوں کو بڑی خاموشی سے دیکھا۔

سب کچھ کس قدر غیر محسوس طریقے پر بدلتا جا رہا تھا۔

فرخ بھائی اس عرصے میں ایک بیٹی اور ایک بیٹے کے باپ بن گئے تھے۔ بڑی آپا چار بچوں کی ماں بننے کے بعد اپنے جسم کی وہ خوب صورتی اور نزاکت کھو بیٹھی تھیں۔ جس کو محنت وقتاً فوقتاً سرسے بغیر نہ رہتی تھی۔ پھوٹی آپا کے دو بیٹے تھے۔ بیٹی کی حسرت ابھی باقی تھی۔ محنت کی دوست شہلا کی شاد بکوب

اشفاق بھائی کی محبت بھی اب وہ پہلی سی محبت نہیں رہی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ محبت کا مفہوم بدل چکا تھا۔

حالات کے ساتھ ساتھ ان کی محبت کا انداز بدل چکا تھا۔

اشفاق بھائی کو بھی دوسرے مردوں کی طرح اولاد کی چاہ تھی۔

نشاید انہیں اپنے دل میں بسی ہوئی سعدیہ باجی کی زنگ آلود محبت سے

کہیں زیادہ خدا کا خوف تھا۔

جو وہ اپنی اماں اور بہنوں کے بار بار کہنے کے باوجود اب تک دوسری

نشاوی نہیں کر سکے تھے۔

یہ تو وہ خود ہی بہتر جانتے ہوں گے یا خدا کہ وہ کس کس طرح اپنے دل

کو مار رہتے ہوں گے۔

سعدیہ باجی کے ساتھ ان کا جیب سلوک تھا اس کا اظہار وہ اپنی زبان سے

ذکر نہیں کرتی تھیں۔ کچھ والا شخص دیکھ اور سمجھ سکتا تھا کہ ان پر کیا بیت

رہی ہے وہ گھڑائیں تو بہت مسکراتیں اور بہت بلند قہقہے لگاتیں لیکن ان کا

چہرہ، ان کی آنکھیں دل کا راز افشا کئے دیتی تھیں۔ ممتا کی ماری اتلی سعدیہ باجی

کے لئے جانے کون کون سی فتنیں مان چکی تھیں، بھائی میاں جانے کتنی نفلیں ملنے

بیٹھے تھے۔ بہنیں جیسے جیسے وظیفہ پڑھ کر تھک چکی تھیں۔

لیکن سعدیہ باجی — گلدان میں ہفتوں پرانا سجایا ہوا وہ مرجھایا ہوا پھول

تھیں جو کسی بھی لمحے گلدان سے نکال کر پھینک دیا جاسکتا تھا۔

ان کی ازدواجی زندگی کبھی ہوتی سمیع کی وہ بھڑکتی ہوئی کو تھی۔

جسے وقت کا ان دیکھا ہاتھ کسی بھی لمحے بچھا سکتا تھا

جسے حالات کی نیز و تند آندھی کسی بھی پل گُل کر سکتی تھی۔

نزہت بھابھی کا بھائی ذیشان کینیڈا سے لوٹ آیا تھا۔ بہنوں کو بھائی

کے سرے کے پھول دیکھنے کا ارمان تھا، ماں کو اپنی چھوٹی بہو کی چوڑیوں کی

بھنگار سننے کی حسرت تھی۔

مگر ذیشان — اس کے دل کی خبر شاید کسی کو نہیں تھی۔ اس کے

مسئل انکار نے اچانک سب کو یہ احساس دلایا کہ شاید وہ کسی لڑکی کو پسند کر

بیٹھا ہے۔ سب اس بات پر بھی آمادہ تھے کہ وہ جہاں اور جس لڑکی سے بھی

نڈی کرنا چاہے، کر لے۔ ذیشان کا ایک ہی جواب تھا — ”جب کوئی لڑکی

پسند آئے گی شاید مجھ کو لوں گا۔“

لیکن گھر والوں کو اس بات کی فکر تھی کہ آخر اسے کوئی لڑکی کب پسند

آئے گی؟ اس کی زندگی کے ماہ و سال کس طرح کم ہونے جا رہے تھے۔

اسے ذرا بھی احساس نہیں تھا، نزہت بھابھی اور دوسرے لوگوں کی زبانی

فلت بھی یہ ساری باتیں سنتی اور اپنے آپ سے سوال کرتی —

ان تمام باتوں کی وجہ میں ہوں؟

لیکن کوئی جواب سننے سے پہلے ہی وہ اپنا سر جھک دیتی۔

اسے بہت خوف آتا تھا۔

کہیں اس کے دل و دماغ کی حدائیں دوسروں کے قانون تک نہ پہنچ

جائیں۔

ایسا بھی ہونا ہے کہ عمر بن کر جاتی ہیں ایک دوسرے کی رفاقتوں کے
ہمارے ساتھ۔

گھر پیار کے خزانے کے خالی پن کا احساس تک نہیں ہوتا۔

ہرین کی مثال اس کے سامنے تھی اور پھر بڑی آپا۔ ان کی شادی تو بخت
کی شادی بھی نہیں تھی، فرخ بھائی اور نرہت بھائی کے یہاں پیار کے کھوکھلے
بن کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ ماموں جان کی بیٹی کو نرہت آپا شادی کے اتنے برسوں
بعد تک اُسی طرح پیار و محبت کے ہنڈولے میں بھول رہی تھیں۔ یہ تو اس کے
اپنے جاننے والوں کی مثالیں تھیں ورنہ دنیا تو بہت وسیع تھی۔ ایسے ایسے جانے
لئے شادی شدہ جوڑے ہوں گے۔

اسے اپنی زندگی کیوں شکستہ دیوار کا ملبہ معلوم ہوتی تھی؟

اس نے کئی دفعہ اپنے آپ سے سوال کیا۔

کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ شہاب احمد نے اپنے پیار کے خزانے کو بڑی
افراط سے لٹایا تھا اور اب وہ بالکل تہی دامن ہو چکے تھے۔

ان کے ہاتھوں میں اس کی چاہت کی چند بچی لکھیاں اور گنتی کے
پھول رہ گئے تھے۔

یا پھر۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ خدا اس کی اپنی طرف اسے کوئی کوتاہی
ہوئی تھی؟

اس نے شہاب احمد کے ساتھ گزارے ہوئے پچھلے تمام برسوں میں اپنے کردار
ابہت تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیا تھا۔

لینڈ اسے ذیشان کی واپسی پر اماں اور بھائی میاں نے دعوت کا اہتمام کیا تھا۔
ساری بیٹیاں اور داماد بھی مدعو تھے۔ جب ذیشان اور عفت کا تعارف کروایا گیا
تو عفت نے اپنے دل و دماغ کو سرزنش کرتے ہوئے بڑی متانت کا مظاہرہ
کیا اور ذیشان کی لگاؤوں نے بھی عفت کے ساتھ کسی پرانی فائسنگی اور کسی دیرینہ
تعلق کا اظہار نہیں کیا۔ شہاب احمد اور ذیشان ایک دوسرے سے بڑے تپا کہ
ملے۔ اگلے روز کے لئے شہاب احمد نے ذیشان کو اپنے یہاں ڈنر پر مدعو کیا۔ ذیشان
نے بہت عذر معذرت کی لیکن شہاب احمد کے اصرار کے آگے مزید انکار کی گنجائش
نہیں رہی۔

اور اگلے روز شہاب احمد کی وسیع مالی شان کو عفت پر وہ تمام لوگ جمع تھے
جو ایک دن قبل کی دعوت میں تھے۔

اماں البتہ نہیں آسکی تھیں، نرہت بھائی کی بیٹی کو ملو ہو گیا تھا۔

اماں کے گھر دعوت میں، عفت تمام وقت بہت پر سکون رہی لیکن واپسی
پر۔۔۔ راستے میں وہ اپنے ہونٹوں پر لگی ہوئی چُپ کی ہر کوئی نہ توڑ سکی شہاب
بھی خاموش تھے، جانے کن سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

یوں بھی گزرتے ہوئے وقت نے بڑی خاموشی سے ان دونوں کے درمیان
فاصلے قائم کر دیئے تھے۔ آنے والا ہر دن ان فاصلوں کو اور بڑھا تا چلا جا رہا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان کی شادی کو تقریباً نو سال ہو چکے تھے مگر۔۔۔ شادی جیسے
بندھن اور سمجھوتے کے لئے نو سال کا سرمہ کچھ اتنا زیادہ طویل تو نہیں ہوتا۔

عفت کبھی کبھی سوچتی تھی۔

ایک دفعہ نہیں۔ بار بار۔

مگر اسے تو ہر بار یہی احساس ہوا کہ اس نے تو قدم قدم پر ان کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔

اس نے تو شباب احمد کے رخ سے ہر نئی نقاب سرکنے کے بعد ان سے سمجھوتہ ہی کیا تھا۔

نہ صرف ان سے — بلکہ وقت اور حالات کے ساتھ بھی وہ سمجھوتہ کرتی چلی آئی تھی۔

لڑائی، جھگڑا اور فساد کرنے کے بجائے اس نے ہمیشہ یہی کوشش کی تھی کہ سمجھ بوجھ سے کام کیا شباب احمد کو ہراس برائی سے باز رکھ سکے جو گھر کی فضا کو ناخوشگوار بنا سکتی تھی۔

اپنی اولاد کے معاملے میں عفت کی مداخلت انہیں پسند نہیں تھی۔

عفت نے چپ چاپ ان کی بات مان لی۔

اپنے تمام پرانے شوق انہوں نے از سر نو پورے کرنے شروع کر دیئے تھے۔

عفت نے ان کی عادتوں کو ترک کروانے کے لئے پیار کے سارے حربوں،

چاہت کی ساری قسموں اور محبت کے تمام وعدوں کو آزمایا مگر —

وہ جتنی آسانی سے قسمیں کھاتے تھے۔

جتنی جلدی وعدے کرتے تھے۔

اس سے کہیں زیادہ آسانی سے اور اس سے کہیں زیادہ جلدی ان قسموں اور

وعدوں کو توڑ ڈالتے تھے۔

عفت کو آخر کار احساس ہو گیا کہ ان کی قسمیں اور ان کے وعدے سب جھوٹے

انسانے ہیں اور ان کے شوق — عفت کو سوچ سوچ کر اور دیکھ دیکھ کر حیرت

ہوتی تھی، بظاہر اس قدر ڈریسنگ آدھی — جس پر سرتاپا نظر ڈال کر نفاست

احساس ہوتا تھا کس قدر گہری دلدلوں میں پھنسا ہوا تھا۔ اپنی لیڈی سیکرٹری سے

لے کر اپنے بعض دوستوں کی آوارہ مزاج بیویوں تک پر بھی اس کی نظر میں بھٹکتی

نظر پڑتی تھی۔ غلط کرتا تھا وہ؟ بے تکلف دوستوں کے گھروں پر بیٹھے پلانے

لے لٹھلیں گرم ہوتی تھیں، رقص و موسیقی کے نام پر بازاری عورتوں کے جسموں کے

غیر کئے کا نظارہ کیا جاتا تھا۔ عفت نے محض یہ سوچ کر کہ بات آگے نہ بڑھے

بھی اس تفصیل میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ان کے کون کون سے شوق پرانے

تھے اور کون سے شوق آوارہ مزاج اور عیاش دوستوں کی صحبت میں رہ کر ان کی

عادت میں شامل ہوئے اور رنگ لائے چلے گئے۔

توبیہ ابھی بارہ سال کی تھی لیکن جس تیزی سے وہ ادبچی سوسائٹی کے آداب سیکھی

ہل جا رہی تھی وہ عفت کے دل کو خوف زدہ کرنے اور سہا دینے کے لئے کافی

تھا۔ مگر وہ خوف زدہ ہو کر اور سہم کر اپنے دل کو پریشان ہی کر سکتی تھی مفسور اور

توبیہ کے معاملے میں اسے اپنی حیثیت کا اندازہ اچھی طرح تھا لیکن پھر بھی کبھی

توبیہ کو سمجھانے سے باز نہ رہ سکتی اور — توبیہ کا جواب — اس کے

بیشہ دل کو چور چور کر دیتا — آپ نہ میری مٹی ہیں نہ ڈیڑھی، اور آپ یہ بھی

اچھا طرح جانتی ہیں کہ میرے ڈیڑھی نے میرے معاملات میں مداخلت کا حق آپ کو

بھی نہیں دیا۔“

عفت اپنے سنیسہ دل کی کرجیوں کو سنبھالتے ہوئے سوچتی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو تو یہ اٹھیک کہتی ہو۔“

تمہارے ڈیڑھی نے اس گھر کے کسی بھی معاملے میں مداخلت کا حق مجھے نہیں دیا۔
مجھے تو بس خاموشی دیکھ کر سب کچھ دیکھتے رہنے کا حق ہے۔

ایک کے بعد دوسری، تیسری، چوتھی اور پھر مسلسل خاموشی۔

ہر بات پر خاموشی۔

اس طویل خاموشی کا انجام کیا ہوگا؟

خدا را! کوئی تو مجھے بتاؤ۔

یہ چپ کی ہنر۔

یہ خاموشیوں کے پہرے۔

کس قدر گراں باری ہے میرے دل پر؟

یہ میرے اندر کے سناٹے۔

یہ خاموشیاں

اب تو یہ مدائن کر گرجنے لگے ہیں۔

کیسی کیسی خبریں پڑتی ہیں میرے راسخ پر؟

کس کو بتاؤں؟

کس سے کہوں؟

اس راستے کا انتخاب تو میں نے غریباً ہی کیا۔

شہاب احمد ذک پہنچنے والا راستہ۔

اس ایک راستے پر چلنے سے پہلے سارے راستے، تمام راہیں میں نے خود اپنے
ٹوں بند کر دی تھیں۔

اب نہ میں کسی سے گلہ کر سکتی ہوں نہ شکوہ۔

گلے شکوے تو بہت دور کی بات ہے میں تو اپنے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا کرنے
لے بھی کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔

زندگی کے جس اہم معاملے پر سب سے زیادہ غور کرنے اور سب سے زیادہ

بڑے سمجھنے کے بعد فیصلہ کیا، مٹھو کر اسی مسئلے پر کھائی۔

شہاب احمد نے کہا تھا۔

”عقرا! اپنے اور میرے درمیان کوئی دیوار کھڑی کرنے کی کوشش نہ کرنا۔“

”تمہیں سکون سے رہنا اچھا نہیں لگتا عقو؟“

”اب کبھی مجھے الجھنے کی کوشش نہ کرنا عفت!“

اور ان تمام باتوں کے جواب میں عفت کا یہ کہہ دینا۔

”اس گھر میں وہی ہوگا شہاب احمد! جو آپ چاہتے ہیں۔“

ادب اور سوچتی تھی۔ شہاب احمد کو کیسے سمجھائے؟

وہ۔۔۔ جو ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اپنے درمیان کوئی دیوار کبھی نہیں

دکھاتے۔

اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی کا سین و سکون ختم کرنا کسے اچھا لگتا ہے؟

خوشی اور مسرت سے بھرپور زندگی میں اپنے ہی ہاتھوں کانٹے بچھانا کون

بند کرتا ہے؟

اور اگر ادھر چند سالوں میں یہ سب کچھ ہو گیا تو یہ کس نے شہاب احمد کس نے کیا؟

کسے مصنف بناؤں؟

کس سے انصاف چاہوں؟

میں تو اپنی زبان سے چاہت و محبت کا اقرار نہ کرنے کے باوجود اپنی بساط سے کہیں زیادہ نبھا گئی۔

اور آپ — جنہیں دعویٰ تھا بے پناہ محبت اور چاہت کا کس طرح نگاہ بدلتے چلے گئے۔

سوچتے سوچتے اس کے دماغ کی رگیں تفتی چلی جاتیں۔

شوہر کے تیمود بدل جاتیں تو عورت کو اولاد کا سہارا ہوتا ہے۔

اس پر مان ہوتا ہے — خصوصاً بیٹا تو مایوس زندگی کے گھوڑاندھیروں میں روشنی بن کر جھللا اٹھتا ہے لیکن عقبت کے لئے کوئی سہارا نہیں تھا۔ لاشان کی پیدائش جانے کس مغوس گھڑی میں ہوئی تھی کہ عقبت اس کے سدھرنے کی آس لئے ہوتے برس برس گزرتی چلی جا رہی تھی۔ لاشان کے بعد اس کے یہاں ایک مردہ بیٹے کی پیدائش ہوئی پھر ایک ننھی منی نرم و نازک سی کلی بھی اس کی زندگی کے چمن میں کھلی لیکن صرف تین ماہ اس کے آپچل میں ممکنے کے بعد ہمیشہ کے لئے مرجھا گئی۔ عقبت کو اس کلی کے مرجھانے کا بے حد دکھ تھا اس کی یاد جب بھی آتی اس کے سینے پر ایک ہوک سی اٹھتی۔ بیٹیاں — ماؤں کی ہمدرد و غمگسار — اچھے اور برے وقتوں کی ساتھی — خدا نے کتنی بڑی نعمت دے کر اس سے چھین لی تھی۔

اس کے لئے ممبر کو ناعفقت کو بہت دشوار لگتا تھا مگر وقت سپہ بہ سپہ امتحان لینے پر ارادہ نظر آتا تھا۔

ذیشان کے اعزاز میں دی جانے والی دعوت کے سلسلے میں شہاب احمد نے بہت اہتمام کیا تھا۔ سارے نمان جمع ہوئے، عقبت اپنے بدن کو شہاب احمد کے ہندیدہ رنگ کی عیش قیمت ساڑھی میں پیٹے، اپنے وجود کو ان کی پسندیدہ خوشبو میں بسائے تمام وقت اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سیاتے رہی اور سب کو بہ تاثر اپنے کی کوششیں کرتی رہی کہ وہ شہاب احمد کی رفاقت میں بے حد خوش ہے، اسے کوئی دکھ، کوئی غم نہیں ہے۔

اپنے دل کی گہرائیوں میں اس نے کسی کو بھی جھانکنے کا موقع نہیں دیا۔

مگر — یہ کس قدر مشکل کام تھا۔

کتنا دشوار؟

روح درد کے انبار تلے دبلی سسک رہی ہو۔

مگر ہونٹوں سے قہقہے ابل رہے ہوں۔

دل میں زخموں کے انبار لگے ہوتے ہوں۔

مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ سچی ہوتی ہو۔

دل سے آنکھوں تک طوفان ہی طوفان ہو۔

مگر آنکھیں پھر بھی ساحل بنی رہیں۔

دوسروں کے لئے اس کی زندگی قابل رشک تھی۔

لیکن وہ اس کے اندر گونجتے ہوئے سناٹے۔

وہ اس کے من کا خالی بن۔

اور وہ اس کی بے خواب راتیں —

وہ کسی کو کیسے بتا دیتی کہ —

ستارہا جب تنہائی کے زہر میں گھلتا ہے تو لمحے کتنے اذیت ناک بن جاتا

ہیں؟

اس کی چاہ کا بھرم نہ کھل جاتا!

وہ دیکھنے والوں کی نگاہوں میں تماشہ نہ بن جاتی!

اور یہ سب کچھ اسے کسی قیمت پر بھی منظور نہیں تھا۔

اس کی روح اند ہی اند سسک کر دم توڑ دے۔

اس کے من کا اندھیار — گھور اندھیار — سہما سہما کر اسے مار ڈالے۔

یہ سب کچھ اسے منظور تھا۔

لیکن اپنے گھر کی رسوائی اسے ہرگز منظور نہیں تھی۔

اپنے لئے تو سب ہی جیتے ہیں۔

کسی اور کی خاطر زندگی گزارنے کا تجربہ نہ کرنے کا ایک عہد جو ۲۱

نے کیا تھا۔

اس تجربے کی ناکامی کا علم وہ کسی کو نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

درد کی جانے دہلیز میں تھیں۔ جنہیں ایک کے بعد ایک کر کے وہ پار کرتی،

جار ہی تھی اور وقت بے حس بنا آگے بڑھا جا رہا تھا۔ اس کی عمر کے تناور درخت

سے جانے کتنے سال سوکھے پتوں کی مانند چپ چاپ بھر پڑ گئے۔ شہاب احمد۔

منصور کو سینئر کمبرج کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیج دیا تھا۔ انہوں نے تو کاشان اور ٹوبہ کے لئے بھی ایسے ہی خواب دیکھے تھے۔ لیکن کاشان اور ٹوبہ دونوں میں سے کسی کو بھی پرہیزگار لکھا تھا۔ کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی زندگی کسی اور ہی انداز سے گزر رہی تھی۔ ٹوبہ کی اڑان اتنی اونچی تھی کہ کسی بھی لمحے زمین کی پستیوں میں گر جانے کا خوف عفت کو خوف زدہ نہ کرتا تھا اور کاشان کے غلط قسم کے دوستوں کی صحبتوں نے اسے غشیات کا عادی بنا دیا تھا۔

اس کی بے پناہ چاہتوں، اس کی خاموشیوں اور سمجھوتوں کے حملے میں شہاب احمد اس سے دور ہوتے چلے گئے اور اسے پرانی، بیکار اور قاتلوشے کی طرح گھر کی تباہیوں میں ڈال کر بیگانے بن گئے۔ اس نے صبر کر لیا۔

اس کی بیٹی فوت ہوئی اس نے اپنے آپ کو سمجھا لیا۔

کاشان شروع سے بگڑا ہوا بچہ تھا وہ اس کے سدھرنے کی آس لئے جیتی رہی لیکن اس کی اتنی بڑی بے راہ روی عفت کا زخموں سے چھڑ چھڑ دل برداشتہ نہ کر سکا۔ وہ لیٹر سے لگ گئی۔ لیکن بڑی سخت جان تھی وہ بھی۔ زندگی کا کوئی نیا دکھ — کوئی تازہ زخم کھانے کے لئے پیٹھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

کاشان جانے کب سے ان غشیات کو استعمال کر رہا تھا، اسے خبر ہی نہ تھی۔ اس کی گھر واپسی کے اوقات ہی ایسے تھے کہ وہ بے خبر ہی رہی۔ اپنے دل و دماغ کے سکون کی خاطر — اپنی بے خواب راتوں کو خوابوں سے بچانے کی خاطر — وہ تو خود خواب آور گولیوں کی محتاج بن کر رہ گئی تھی۔

جس رات پہلی بار اسے کاشان کی اس حرکت کا علم ہوا وہ پہلے تو سس ہو کر

رہ گئی۔

نہ اس کا دماغ چند لمحوں تک کام کر سکا۔
نہ ذہن اس کا ساتھ دے سکا۔

اور جب — وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تو غصے میں اپنے آپ سے
باہر ہو گئی۔

اپنی پوری قوت سے اس نے کاشان کے منہ پر تھپڑ مارا اور یہ جھج پڑی —
”کاشان! میرا خون اتنا گندہ کیسے ہو گیا؟“

”تم نے تو میری زندگی کا راسخا سکون بھی آج چھین لیا“
”دور ہو جاؤ، دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے“

اور کاشان — وہ اپنے ہوش میں ہی کب تھا؟ لڑکھڑاتا ہوا، کچھ بڑبڑاتا
ہوا وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ عفت ساری رات جاگتی رہی، ایک پل کے لئے
بھی اس کی آنکھ نہیں جھپکی، دوسرے روز اس نے کاشان کو سمجھایا کہ کاشان اب اتنی
دور چاچکا تھا کہ نہ اس پر پیار و محبت سے سمجھانے کا کوئی اثر ہو سکتا تھا نہ تھپڑوں
کا۔ اس روز اس نے بڑی بے بسی سے شہاب احمد سے زیادہ کی۔ اس وقت وہ باہر
جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

”شہاب صاحب!“

”جی! فرمائیے۔“

اب وہ زیادہ تر ”آپ“ ”جناب“ کہہ کر ہی اسے مخاطب کرتے تھے۔
”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“

وہ اپنے لمبے کی برہمی کو کسی طرح بھی نہ چھپا سکی۔

شہاب احمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا یہ انداز ان کے لئے نیا
تھا۔ اپنی فیض کے بٹن بند کرتے ہوئے وہ کمر سی پر بیٹھ گئے اور بولے۔

”کہئے، کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟“

”مجھے آپ سے تفصیلی گفتگو کرنی ہے اور آپ روزانہ کی طرح کہیں جانے
کے لئے تیار ہیں۔“

”آپ بات کیجئے، میں تھوڑی دیر سے پلا جاؤں گا۔“

عفت چند منٹ تک گہری سوچوں میں ڈوبی رہی پھر سر اٹھا کر اس نے شہاب احمد
کی طرف دیکھا۔ وہ سگریٹ سلاگنے میں مشغول تھے۔ سگریٹ سلاگ کر انہوں نے دو تین
لش لئے اور بولے۔

”آپ اب تک خاموش ہیں؟“

”میں نے تو زندگی کے اتنے سارے برس آپ کے ساتھ خاموش رہ کر یہی گزاریے

ہیں پھر بھی حیرت ہے آپ کو؟“

”بھگڑا فساد کرنے کی تمنا اور حسرت آپ کے دل میں ہے تو اسے پورا کر لیجئے“

”ہیں اگر بھگڑا فساد کرنے والی عورتوں میں سے ہوتی تو اس کی ابتدا برسوں پہلے

کر چکی ہوتی۔“

”پھر آج اس قدر برہمی کا انداز لے آپ کیا کہنے چلی آئی ہیں؟“

”میں آپ سے کاشان کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیجئے۔“

”کس معاملے میں؟“

”منصور اور ثوبیہ کے سلسلے میں آپ نے مجھے کبھی مداخلت کا حق نہیں دیا
لیکن کاشان کے معاملے میں آپ قدم قدم پر مداخلت کرتے رہے، ہر موقع پر
میری رائے سے اختلاف کرتے رہے۔“

شہاب احمد بڑی شان سے بولے۔

”کیوں نہ کرنا۔ وہ میرا بیٹا نہیں؟“

”جی ہاں! یقیناً وہ آپ کا بیٹا ہے۔“

”تو پھر یہ شکوہ شکایت کیوں؟“

”شکوہ اس لئے ہے کہ آپ نے اسے بری صحبتوں میں جانے سے کیوں نہیں
روکا؟“

”آپ بھی تو ماں ہیں آپ نے کیوں نہیں روک لیا؟“

”میں گھر میں رہتی ہوں، گھر کی حد تک اسے سدھارنے کی میں نے پوری

کوشش کی، باہر اس کے ساتھ ساتھ جانا میرا کام نہیں تھا۔“

”ہاں! ظاہر ہے، آپ نے تو کبھی میرا ساتھ دینا بھی گوارا نہیں کیا،“

شہاب احمد طنز بہ انداز سے بولے۔

عفت نے دبی ہوئی سانس لے کر کہا۔

”بہتر ہو گا ہم دونوں اس موضوع پر کوئی گفتگو نہ کریں،“

”کیوں؟“

”شادی سے پہلے ہی میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ آپ کا اسٹیٹس اور

”آپ جانتے ہیں کہ وہ منشیات کا کس حد تک عادی ہو چکا ہے؟“

”اچھا!، شہاب احمد نے پھرتے کا اظہار کیا۔ یا تو وہ پیچ بچ لا علم تھے یا پھر
ادا کاری کر رہے تھے۔

عفت نے کہا۔

”اور آپ کو یہ بھی خبر ہے کہ وہ کس قسم کی منشیات استعمال کرتا ہے؟“

شہاب احمد کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

”منشیات کسی بھی قسم کی ہوں بہر حال منشیات ہیں۔“

عفت چپ چاپ ان کی طرف دیکھتی رہی۔ شہاب احمد بھی خاموش تھے۔

”جی! آپ چپ کیوں ہیں؟“ عفت نے پوچھا۔

”آپ کے خیال میں مجھے کیا کہنا چاہیے؟“

”کیا مطلب؟“

”شاید آپ کو یاد ہو عفت بیگم! میں نے ایک دفعہ آپ سے کہا تھا کہ آپ

صرف اس بچے کی فکر کیجئے جو آپ کا اور میرا ہے، ان بچوں کے لئے آپ کو پریشان

ہونے کی قطعی ضرورت نہیں جو میرے اور کسی دوسری عورت کے ہیں،“

”جی! مجھے اچھی طرح یاد ہے،“

”تو پھر؟“

عفت نے بے حد سیکھے انداز سے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

”بہتر ہو گا شہاب صاحب! کہ آپ صدق دل سے کہہ انکم اس معاملے

میں اپنی زیادتی کا اعتراف کر لیں۔“

آپ کا ماحول ہماری راہ کی بہت بڑی رکاوٹیں ہیں،

”جی! کچھ یاد تو پڑتا ہے۔“

”ظاہر ہے اس کا مطلب یہی تھا کہ میں آپ کی اونچی سوسائٹی کے آداب بچانے کی اہل نہیں ثابت ہو سکوں گی۔“

”پچھتاوا تو بہت ہو گا آپ کو اپنے فیصلے پر؟“

عفت طنز بہ انداز سے مسکرا کر بولی۔

”پچھتاوا! میرے نزدیک یہ لفظ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے،

”ارے! وہ کیوں؟“

”یہ پچھتاوا میری زندگی کے گزشتہ برسوں کو واپس لا کر مجھے نہیں دے سکتا۔“

”زندگی کے کون سے برسوں کی بات کر رہی ہیں آپ؟“

عفت نے زہر خند سے کہا۔

”وہی جو آپ کے ساتھ گزرے۔“

”میرے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیوں کر بیٹھی تھیں؟“

شہاب احمد کا یہ جملہ عفت کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔ شبی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

”شہاب صاحب! آپ... آپ...“

پھر اس کا گلہ بندھ گیا۔ وہ آنسو بہانا نہیں چاہتی تھی۔ آنسوؤں کی نمی کو حلق میں

اٹاتے ہوئے اس نے ایک طویل سانس لی اور سوچنے لگی۔

پتھر پر پانی کی بوند ایک ہی جگہ مسلسل گرتی رہے تو ایک نہ ایک دن اثر ہونا

ضروری ہے، میرے دل میں آپ کا کوئی خیال نہیں تھا۔ یہ آپ ہی تو تھے جس کے

مسئلہ مرا نے میرے دل میں اپنی جفت پیدا کی، میرے قدم آگے بڑھنے چلے گئے۔

آپ نے اپنی زندگی کا ایک اور رخ دکھایا تو میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ پھر۔

وہ آپ نہیں تھے؟ جس نے کہا۔ اپنے لئے تو سبھی زندہ رہتے ہیں کبھی کبھی دوسروں

کی خاطر زندہ رہنا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہی خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا لیکن

میرے انکار کے بعد اگر آپ خاموش ہو جاتے تو یقیناً میں بھی آہستہ آہستہ

سب کچھ فراموش کر دیتی۔

اپنی گہری سوچوں میں ڈوب کر وہ شہاب احمد کے وجود کو نظر انداز کر چکی

تھی۔ لیکن شہاب احمد شاید اس وقت عفت کے دل کی گہرائیوں میں جھانک لینے

پر تلبے بیٹھے تھے۔

انہوں نے کچھ طنز بہ انداز سے کہا۔

”بڑی گہری سوچوں میں ڈوب گئی ہیں آپ“

عفت نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

شہاب احمد نے کہا۔

”میں منتظر بیٹھا ہوں، آپ اپنی ادھوری بات پوری نہیں کریں گی؟“

”مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا ہے۔“

”لیکن میں تو اپنی بات کا جواب سننا چاہتا ہوں،“

”کس بات کا جواب؟“

”یہی کہ آپ میرے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیوں کر بیٹھی تھیں؟“
عفت نے بڑے تحمل سے کہا۔

”اس بات کا جواب آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”غالباً آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ نے میری خاطر میرے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر کے احساں کیا ہے میرے ادھر؟“
عفت نے سوچا۔

”یہ آپ کے من کا چور بول رہا ہے شہاب احمد!“

شہاب احمد نے ایک اور وار کیا۔

”کوئی کسی کی خاطر نہیں جتنا عفت بیگم!“

عفت نے بڑے رसान سے کہا۔

”ممکن ہے آپ ہی درست کہتے ہوں۔“

شہاب احمد طنز پر انداز سے مسکرا کر بولے۔

”ہر شخص کے سامنے اس کے اپنے مفادات بھی ہوتے ہیں۔“

عفت کے دل پر بڑی گہری جھوٹ پڑی۔

اس نے سوچا۔

میرے کون سے مفادات ہو سکتے ہیں شہاب احمد؟ آپ اس قدر لپٹ

ذہنیت کا منظر ہر بھی کر سکتے ہیں؟

اس نے شہاب احمد سے پوچھا۔

میرے کون سے مفادات والبتہ تھے آپ کے ساتھ؟“

”بھئی! کون سی لڑکی ہے جو اپنے خواب نہیں دیکھتی؟ یہ اسٹیلٹس یہ....“

عفت نے انتہائی کرب کے عالم میں اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے

اور آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔

”بس! بس! شہاب احمد! آگے کچھ نہ کہئے گا، ایک لفظ نہ بولئے گا۔“

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی، اس کا سارا جسم بید کی طرح کانپ رہا تھا۔

”میری چاہت میرے مخلص اور ایثار کا اس قدر مذاق نہ اڑائے“

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

شہاب احمد نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

عفت نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے پھینکتے ہوئے کہا۔

”اب کچھ سننے کی تاب نہیں مجھ میں“

اس نے ایک لمحے کے لئے بس نگاہوں سے شہاب احمد کی طرف دیکھا

اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے بیڈروم میں آگئی۔

اپنے زخمی دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے وہ کمر سی پر گر گئی۔

یہ کیسی آزمائش ہے خدا و اندا۔

ابھی درد کی اور کتنی دہلیزیں پار کر نی باقی ہیں؟

ابھی صبر کی اور کتنی صلیبیں لڑکانی ہیں مجھے اپنے سینے پر؟

زخموں سے چور چور میرا یہ دل کہیں پھٹ نہ جائے۔

سوچتے سوچتے اس سے دماغ کی رگیں تن گئیں۔

راہداری میں شہاب احمد کے قدموں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

اپنی ٹائی کی گمرہ درست کرتے ہوئے وہ اس کے کمرے کے در پیچے کے سامنے سے گزر گئے۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پھر آہستہ آہستہ گاڑی کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔

وہ اٹھ کر در پیچے میں چلی آئی۔

شام آہستہ آہستہ ڈوب رہی تھی۔

لمبے اپنا درد چھپاتے چپ چاپ گزر رہے تھے۔

اس کے دل کا بوجھ آج ناقابلِ برداشت تھا۔

وہ در پیچے سے ہٹ آئی۔

اس کی نگاہوں میں شہاب احمد کی شبیہ تھی۔

اور دماغ میں ان کی آواز کی بازگشت۔

ڈریننگ ٹیبل کے سامنے سے گزرتے ہوئے اپنے سمر اپے پر اس کی

نگاہ پڑی۔

وہ ہٹھک کر رہ گئی۔

اس نے بڑی حیرت سے اپنے آپ کو دیکھا۔

ارے!! یہ میں ہوں؟

میں! عفت شہاب؟

اور وہ عفت شہاب کہاں چلی گئی؟

ختم ہو گئی؟

مر گئی؟

یہ مائل یہ فزہی جسم۔

یہ بالوں میں چمکتے ہوئے چاندی کے تار

وقت کے دھندلے پریٹوں کے اس پار اس نے عفت شہاب کو تلاش

لنا چاہا۔

ماہ و سال کا ایک طویل قافلہ تھا۔ جو گزر گیا تھا۔

لیکن۔۔۔ یہ ان گنت ماہ و سال تو صرف اُس پر سے گزر گئے تھے۔

وہ ایک شخص۔۔۔ جو ابھی کچھ دیر پہلے اس کے در پیچے کے سامنے سے

گزارا تھا۔

وہ تو ویسا ہی تھا۔

جیسا اسے برسوں پہلے دیکھا تھا۔

یہ چپ چاپ گزرتے ہوئے روز و شب اس کا سیوں کچھ نہیں بگاڑ سکے

تھے؟

وقت کی اثراتی ہوئی دھول اس کے چہرے اور اس کے بالوں پر کیوں

نہیں جسم کی تھی؟

اس کے سینے میں مکھ کی ایک لہری اٹھی۔

اس نے ایک بار اور بڑی حسرت سے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا اور

ہٹ گئی۔

کہ سی پر بیٹھے ہوئے اسے پھر شہاب احمد کی باتیں یاد آ گئیں۔
کس قدر تکلیف دہ باتیں تھیں ان کی؟

وہ شخص — جس کی خاطر اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔
کہنے کھٹیا الزامات لگا گیا تھا اس پر؟

ایشاور اور خلوص کا یہ صلہ ملا کرتا ہے دنیا میں؟

وہ اپنے وجود کی تنہائیوں میں چپ چاپ جلتے ہوئے اپنی عمر کے میٹھے لئے
لمحوں کو بکھرتے دیکھتی رہی۔

اس کے کمرے کے نصیب میں اب صرف ستاٹوں کا زہر باقی رہ گیا تھا۔

اور خود اس کے مفقود میں ایک سلسلہ شام و سحر تھا۔

اس نے بہت کوشش کی کہ دل کے داعیوں کا رنگ چہرے پر نہ جھک آئے۔

سینے کی گہرائیوں میں ٹھہرے ہوئے سمندر کا کوئی قطرہ آنکھوں تک نہ آنے پائے

لیکن وقت کی بے رحم آندھیاں اس کی زندگی پر پڑے ہوئے پردوں کو

اڑانے کی کوشش میں مصروف تھیں۔

کچھ لوگوں نے جان لیا کہ اس کے قہقہے کھو گئے اور مسکراہٹیں بے جان ہیں۔

یہ بھی غنیمت ہو کہ جاننے والے کا شان کی بے راہ روی کو عقّت کے کھو گئے

قہقہوں اور ہنسی کے بے جان مسکراہٹوں کا سبب سمجھے۔

وہ رسوا ہونے سے بچ گئی۔

وہ دنیا والوں کے سامنے تماشا بیٹنے سے بچ گئی۔

اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکریہ ادا کیا۔

ایک اداس شام — جب وہ فرخ بھائی کی بیٹی نوشین کی طبیعت کی غرابی کا سامنا

راہے دیکھے آماں کے گھر گئی ہوئی تھی اور رتے میں کھڑی ہوئی اداس شام کی

بجٹی ہوئی پھپکی بے جان مسکراہٹوں کا موازنہ اپنی مسکراہٹوں سے کر رہی تھی —

ہو این تند و تیز تھیں — پتے بکھر رہے تھے — سعدیہ باجی ایک چھوٹا سا

بٹ کیس ہاتھ میں تھامے اندر چلی آئیں — زمین پر بکھرے ہوئے زرد سوکھے

پتے ان کے قدموں تلے دب کر چرچ آٹھے — درد میں ڈوبی ہوئی سینکڑوں صلیبیں

— ان گنت فریادیں گونج اٹھیں۔ سعدیہ باجی کے چہرے پر بکھرا ہوا حزن و ملال

سب کچھ کہہ گیا — ان کے لب خاموش تھے۔ مگر آنکھیں سب کچھ کہہ دے رہی

تھیں — صبر و ضبط کی تصویر بننے کی کوشش میں وہ رنجوں کا دکھتا ہوا الاؤ بن

گئی تھیں — آماں کے چہرے پر عقّت کو ایک دم ہی بے شمار تجرباں نظر آئیں

اور بھائی میاں کی آنکھوں میں غم و اندوہ کے اتنے گہرے سائے کا نیپے نظر آتے

کہ عقّت لہر زکر رہ گئی۔

اس رات — اپنے بابل کے آنگن میں، چار پائی پر لیٹے ہوئے، بادلوں کے

ننگ شگ چلتے ہوئے چاند پر نگاہیں جماتے ہوئے اس نے سوچا —

آخر کار اشتقاق بھائی کی رنگ آلود محبت نے بھی دم توڑ دیا۔

اور میں —؟ آماں اور بھائی میاں! آپ کو کیسے بتاؤں کہ بے یقینی کی

دلہیز پر تنہا کھڑی سوچ رہی ہوں کہ اگلا لمحہ میری زندگی میں جانے کون سا طوفان

لے کر آئے گا۔

وہ نوشین کو دیکھنے کے لئے آماں کے گھر آئی تھی۔ گھر سے یہ ارادہ کہہ کے

نہیں چلی تھی کہ وہ وہاں رہ بھی جائے گی لیکن سعدیہ باجی — جو اپنے چہرے پر اجڑی ہوئی زندگی کی المناک داستان تحریر کے چلی آتی تھیں انہیں دیکھ کر عفت کے دل کی گراں باری کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کے اپنے غم، اپنے دکھ اور اپنی تلخیص پہلے ہی اتنی زیادہ تھیں کہ انہیں چپ چاپ سستے سستے اس کا دل بے مدد کر رہا ہو گیا تھا۔

اس کا اندازہ کس کو تھا اور کتنا تھا کہ اس کی خاموشیوں کے نیچے جانے کتنی چیخیں گھٹ گھٹ کر دم توڑ چکی تھیں؟
 ذہن کے تپتے جھلسے صحرا میں سوچوں کی تند و تیز آندھی تھی —
 جو پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر جھپکتی پھیر رہی تھی۔
 اس کی پریشانیوں کا حکم کسی شخص کو کیسے ہوتا؟
 اس کے دکھوں کا حال کوئی کیسے جانتا؟
 جب کہ اس نے حوزہ اپنے لبوں کو ہی دیوار بنا رکھا تھا۔
 خاموشی اور بے زبانی کی اس دیوار کے پیچھے اس پر کیا کچھ بیت رہی تھی۔
 کوئی کیسے جانتا۔

اتال سے اس نے کہا تھا —

”اماں! میں رات کو چلی جاؤں گی،“

لیکن رات آئی تو وہ جانہ سکی۔ اس کے قدم اپنے گھر کی سمت اٹھ ہی نہ سکے۔ سب کے چہروں پر سعدیہ باجی کی برباد زندگی کے سوگ کے گہرے نقوش تھے۔ اتال سعدیہ باجی کو سینے سے لگا کر اناروئی تھیں کہ ان کی حالت بگڑ گئی تھی۔

زہت بجا بھی اپنی بیٹی کی بیماری کو بھول کر اتنے آنسو بہا چکی تھیں کہ ان کی گلوں کے پوٹے متورم ہو گئے تھے وہ سعدیہ باجی کو تسلی دلا سے دینے کی کوشش میں تو ان کا گلہ بندھ جاتا آنکھیں بھر آتیں۔
 بھائی میاں نے سعدیہ باجی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے صبر و ضبط سے کہا —

”خدا تمہیں صبر دے سعدیہ! اور تمہارے دل و دماغ کو سکون دے،“
 اس کے بعد سے بھائی میاں جو اپنے کمرے میں بند ہوتے تھے تو باہر ہی نکلتے۔

فرخ بھائی سعدیہ باجی کا سراپہ نشانے سے لگا کر کئی منٹ تک خاموش رہے۔ ان کے چہرے پر حزن و ملال کے بڑے گہرے سائے کانپ رہے تھے۔ اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے بھینچ کر شاید وہ اپنے آنسوؤں کی ساری لاکھلی میں اندھیل گئے۔

پھر سعدیہ باجی کی پٹھ پٹھکیے ہوئے بولے۔

”حوصلہ کرو سعدیہ! تم تو بڑی جہت والی ہو۔“

فرخ بھائی نے ٹیلیفون کر کے بڑی آپا کو بلوایا۔ بڑی آپا مع اپنے شوہر اور بچوں کے آگئیں ہر شخص سعدیہ باجی کے غم میں برابر کا شریک تھا، انہیں تسلی دے دے رہا تھا۔ لیکن سعدیہ باجی کا غم کوئی ایسا غم نہیں تھا جو تسلی اور ہول سے کم ہو جاتا۔

وقت ہی ان کے غم پر مرہم رکھ سکتا تھا۔

وقت ہی ان کے دکھ کی شدت میں کمی کر سکتا تھا۔

اور وقت کے گزر جانے کے لئے انہیں انتظار کے کھٹن مراحل سے گزرنا تھا۔

سبھی نے سعیدہ باجی کا دکھ بانٹنے کے لئے کچھ نہ کچھ کہا لیکن عفت خاموش تھی۔ بالکل خاموش۔

اس نے سوچا۔

سعیدہ باجی! میں آپ سے کیا کہوں؟

یہ الفاظ کے جھوٹے سہارے۔

مجھے ان کی حقیقت کا اندازہ اچھی طرح ہے۔

یہ آپ کے زمنوں سے چور چور دلی پر مرہم نہیں رکھ سکیں گے۔

یہ آپ کے درد کا درمانی نہیں بن سکیں گے۔

یہ آپ کی زندگی کے ان بیش قیمت ماہ و سال کو نہیں لوٹا سکیں گے جو

امید کی ایک کون کے سہارے آپ نے سسرال والوں کی اذیت ناک باتیں سنتے ہوئے گزاردیئے۔

عفت نے گھر پہ ٹیلیفون کر کے اطلاع دے دی کہ وہ شاید دو تین روز تک نہیں آسکے گی۔ ٹیلیفون اس کے بیٹے کاش نے رسیو کیا۔ اپنی لڑکھڑائی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

دادا کے ممتی! آپ کا جب تک دل چاہے۔ رہیں، مجھے یا ڈیڑھی کو بھلا کیا ہنر ہو سکتا ہے۔

عفت نے رسیور کو ڈیل پر رکھتے ہوئے سوچا۔

تم ٹھیک کہتے ہو کاشی! مجھے بھی اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہے کہ اب اس گھر میں میری ضرورت کسی کو نہیں ہے تمہیں میری ضرورت اس لئے نہیں کہ میری کبھی کبھار

کی روک ٹوک تمہیں ناگوار گزرتی ہے اور کبھی کبھار بھی جانے کیوں میں تم سے کچھ کہہ جاتی ہوں جب کہ میں جانتی ہوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ انجکشن یہ انجکشن لگوا کر

تم اپنے بازوؤں کو پھیلی کروا چکے تمہارے ہوش و ہوا اس کا یہ عالم ہے کہ اب شاید مرتے دم تک مجھے یہ حسرت ہی رہے گی کہ تمہیں ابھی حالت میں دیکھوں۔

اور تمہارے ڈیڑی۔ ان کی زندگی میں اتنی دلچسپیاں، اتنی رنگینیاں اور اتنی رعنائیاں ہیں کہ وہ اب میرے سلسلے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ کس طرح

مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھا پھڑپھڑا لیں۔ اور توبہ۔ اس کا تو خیر ذکر ہی کیا۔

سوچتے سوچتے عفت کی آنکھوں میں غمی سی اتر آئی۔ ایک گھٹی گھٹی سی سانس نے اس کے لبوں تک آ کر دم توڑ دیا۔

اس رات گھر میں کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ سب کی کوششوں کے باوجود سعیدہ باجی کے حلق سے ایک نوا رہ بھی نہ اتر سکا تو باقی لوگ کیا کھاتے۔ اماں کی

طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں تھی۔ سعیدہ باجی کو نہ بہت بجا بھی اوپر کی منزل پر اپنے ساتھ لے گئیں۔ فرخ بھائی نے اوپر کی منزل بھی بنوائی تھی۔ فرخ بھائی،

نہت بجا بھی اور بچوں کے بیڈ روم اوپر ہی تھے۔

عفت کو کمرے میں شدید گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ آئین میں پڑی چادر پائی پرتیکر ڈال کر لیٹ گئی۔

لمحوں کا کارواں ستاروں کے سنگ سنگ چپ چاپ گزرتا رہا۔
یادوں کی ایک دھندلتی جو کسی طرح چھٹی ہی نہ تھی۔

چاند جیسے دھیرے دھیرے سرکتا رہا۔

چاندنی کا رو پہلا غبار بنا آہٹ کے آنگن میں سر نہلاتا رہا۔

یوں رات تمام ہو گئی۔

کچھ اپنے اور کچھ سعدیہ باجی کے متعلق سوچتے ہوئے اس کی بے خواب آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے بھی نیند نے نہیں جھانکا۔

اوس میں جھجکی ہوئی رات کچھ یوں گزری کہ اس گھر کی کتاب زندگی کے اوراق اٹتے اٹتے اس کی انگلیاں تھک گئیں۔

فجر کی آذان کے وقت جب بجائی میاں نماز کے لئے اُٹھے تو آنگن میں کسی کو لیٹا دیکھ کر وہ قریب چلے آئے۔ شاید وہ سمجھے تھے کہ سعدیہ باجی لیٹی ہیں لیکن عفت کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ بولے۔

”اسے! تم ہو عفت؟“

”جی بجائی میاں! وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔“

”تم یہاں کیوں سوئیں؟ بہت اوس گرتی ہے آج کل“

”کمرے میں بڑی گھٹن تھی۔“

عفت نے جواب دیا اور سوچنے لگی۔

نیند اور میری آنکھوں میں! بڑی خوش نصیب ہوتی ہیں وہ راتیں جب بلینہ خواب

آؤد گولیوں کے میری آنکھوں میں نیند اتر آتی ہے۔

بجائی میاں ہاتھ روم کی طرف چلے گئے۔ تو وہ اُٹھ کر کمرے میں آگئی۔
اوس کی وجہ سے اس کا سارا جسم اکڑ کر رہ گیا تھا۔

سورج نکلا تو زندگی اپنے معمول پر آگئی۔ وہی ہنگامے تھے، وہی مصروفیتیں تھیں

گر آج اماں کے گھر کے معمولات میں فرق آگیا تھا۔ نزہت بھابھی نے بڑی بدولی سے ناشتہ تیار کیا۔ فرخ بجائی صرف ایک کپ چائے پی کر آفس چلے گئے۔ ان کا بیٹا

شہر بار بغیر کچھ کھائے پئے کالج چلا گیا۔ بجائی میاں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد غلامت معمول دوبارہ سو گئے۔ نزہت بھابھی سعدیہ باجی کو زبردستی اٹھا کر، منہ ہاتھ دھلا کر

ناشتہ کی میز پر لائیں، اماں اور بجائی میاں کو بھی لائیں، عفت کو بھی بلوایا۔ ناشتہ کی میز پر بیٹھے ہی سعدیہ باجی نے پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ بجائی میاں

ان کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے، اماں اور نزہت بھابھی تسلیاں دے رہی تھیں۔

عفت ہونٹ دانتوں تلے پھینچنے خاموش بیٹھی تھی۔ سعدیہ باجی نے بمشکل تمام ایک کپ چائے پی اور اوپر چلی گئیں۔ عفت بھی چائے پی کر اوپر چلی آئی۔ کچھ دیر وہ

وٹس کے پاس بیٹھی اس سے باتیں کرتی رہی۔ پھر دل کی بے قابو دھڑکنوں کو سنبھالے سعدیہ باجی کے پاس چلی آئی۔ سعدیہ باجی منہ سر لپیٹے پڑی تھیں۔

عفت نے آہستہ سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”سور ہی ہیں سعدیہ باجی؟“

سعدیہ باجی نے دوپٹے کا پلو منہ پر سے ہٹایا اور چپ چاپ اس کی طرف

دیکھتی رہیں۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ عفت بھی ان کے قریب بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ اپنے

ہاتھ میں لے لیا۔

سعدیہ باجی نے مسرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”تمہارے پاس مجھ سے کہنے کے لئے کچھ نہیں؟“

”آپ شکوہ کر رہی ہیں؟“

”نہیں عفو! شکوہ تو میں نے اس سے بھی نہیں کیا جس سے کرنا چاہیے تھا۔“
عفت نے کہا۔

”مجھے یقین ہے میری زبان سے نکلے ہوئے چند الفاظ آپ کے درد کا درماں نہیں بن سکیں گے۔“

”ہوں“ سعدیہ باجی نے ایک دبی ہوئی سانس لی۔

عفت نے کہا۔

”درد کی جس منزل سے آپ گزر رہی ہیں یہاں آکر الفاظ بالکل بے معنی،
بے وقعت ہو کر رہ جاتے ہیں۔“

سعدیہ باجی نے کہا۔

”اب تو سب کچھ بے معنی، بے وقعت ہو کر رہ گیا ہے۔ مرد کی محبت، اس
کا پیار، اس کے وعدے، اس کی قسمیں،“

سعدیہ باجی بہت جذباتی ہو گئیں۔

عفت خاموش رہی۔

”میری آنکھوں نے مرد کا ایسا روپ دیکھا ہے۔ عفت، کہہ اگر تم سن لو تو مرد کے

اس روپ کو کوئی نام ہی نہ دے سکو،“

عفت نے سوچا۔

اور سعدیہ باجی، مرد کا جو روپ میں دیکھ رہی ہوں وہ آپ نے نہیں دیکھا ہوگا۔
اور پھر سعدیہ باجی نے اشفاق بھائی کے متعلق عفت کو جو کچھ بتایا اسے سن
کر عفت حیران رہ گئی، چند سیکنڈ تک تو اسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا۔

اشفاق بھائی نے سعدیہ باجی کے علم میں لاتے بغیر کئی سال پہلے شادی کر لی
تھی۔ ان کے تین بچے بھی تھے۔ ان کی بیوی اور بچے حیدر آباد میں رہتے تھے وہ —
جو سعدیہ باجی کے سامنے قہقہے کھاتے تھے، وعدے کرتے تھے کہ وہ زندگی بھر دوسری

شادی نہیں کریں گے، سعدیہ باجی کو کبھی اپنے آپ سے جدا نہیں کریں گے۔ بیسوں سے

انہیں دھوکہ دے رہے تھے۔ بیوں — وہ سعدیہ باجی کو طلاق دے دیتے تو شاید

انہیں اتنا زیادہ صدمہ نہ ہوتا، ان کا شیشہ دل تو مرد کی اس دھوکہ دہی پر چرچور

ہو گیا تھا۔ اشفاق بھائی جب تک اپنے جھوٹ پر پردہ ڈال سکتے تھے ڈالتے رہے

”اپنے دوروں کا بہانہ بنا کر آتے دن گھر سے دور رہنے اور سعدیہ باجی بھوٹے

اغما کا سہارا لے ان کی قسط رتیں۔ انہیں بڑا مان تھا کہ اشفاق بھائی ان کے جیتے جی

کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ ان کی اماں بنیں جب ان سے دوسری شادی کے لئے

کہیں تو وہ بڑی ذہن سوتی سے انکار کر دیتے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر

جانے کب سے وہ کسی اور کو اپنا بنا لے بیٹھتے تھے۔ اب جب ان کی بیوی اور بچے

ان کے ساتھ رہنے پر ایضاً ہو گئے تو بات سب کے سامنے آگئی۔ ان کی اُمی بہنوں

اور عمو ان کی بیوی نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب اس گھر میں سعدیہ باجی کی کوئی

گنجائش نہیں۔ اور پھر سچ سچ اس گھر میں سعدیہ باجی کے لئے کوئی جگہ نہ رہی۔

سعدیہ باجی نے کہا۔

”مرد کی ذات بہت گھٹیا ہے عفو بڑی کمبختی“

عفت نے ان سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

”آپ کے ساتھ واقعی بہت ظلم ہوا ہے لیکن سب مرد ایک سے نہیں ہوتے“

سعیدہ باجی نے کہا۔

”یہ تم کہہ رہی ہو عفت۔“

عفت نے ان کے اس جملے پر چونک کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”شہاب احمد کو تم مردوں کی کون سی صف میں کھرا کر دو گی؟“

عفت کا داغ جیسے منہ ہو کر رہ گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

اس نے سوچا۔

اے خداوند! جس ملاز کو میں نے اپنے آپ سے بھی چھپانے کی کوشش کی

وہ — وہ سعیدہ باجی جانتی ہیں؟

میں تو سمجھتی تھی کہ میں دنیا والوں کی نگاہوں میں رسوا ہونے سے بچ گئی

ہوں۔

میں تو یہ سمجھتی تھی کہ میں اپنی زندگی میں گھٹنے والے اس زہر کو قطرہ قطرہ چپ

چاپ اپنے حلق میں اس طرح اندلیتی رہوں گی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی کہ بڑبڑ

اور حالات میرے ساتھ کتنا سنگین مذاق کر گئے۔

میں تو یہ سوچ کر خوش تھی کہ دنیا میرے اجر طے کا تماشہ نہ دیکھ سکے گی۔

مگر — یہ کیا ہوا میرے بعد؟

میری اس ایک دعا کو تو قبول کر لیا ہوتا۔

اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے مگر اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا

در بولی۔

”شہاب احمد! شاید آپ کو ان کی طرف سے غلط فہمی ہوئی ہے سعیدہ باجی!“

سعیدہ باجی نے زہر خند سے کہا۔

”مردوں کے بارے میں میری ساری خوش فہیاں دور ہو چکی ہیں“

”مگر شہاب احمد.....“ عفت نے ان کی صفائی میں کچھ کہنا چاہا۔

سعیدہ باجی نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

”میری زندگی کے گردے ہوئے برسوں نے تجربات و حوادث کی شکل میں

مجھے اتنا کچھ دیا ہے کہ اب میں چہروں پر کبھی ہوتی واضح اور مبہم دونوں تحریروں

دبا سانی پڑھ سکتی ہوں۔“

عفت نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں تو اپنی زندگی سے بہت مطمئن اور بے حد خوش ہوں۔“

”تم اپنے جھوٹ کا سہارا لے کر حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکتیں“

”میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں“

”تم اپنی زندگی سے کتنی خوش اور کتنی مطمئن ہے اس کا اندازہ مجھے کئی سالوں سے

ہے۔ شہاب احمد کتنے پانی میں ہیں، اس کا بالکل صحیح نہ سہی لیکن کافی حد تک غلط

اندازہ ہے“

”میں چہرہ ہی کہوں گی سعیدہ باجی! کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے“

”جھوٹا مت بولو عفت!“ سعدیہ باجی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

عفت نے پھر کچھ کہنا چاہا تو سعدیہ باجی نے کہا۔

”لیکن تم مطمئن رہو، جس بات کو تم راز رکھنا چاہتی ہو میری زبان بھی اس راز کو
بھی عیاں نہیں کرے گی۔“

پھر عفت ان سے لگا ہیں نہ ملا سکی۔

سعدیہ باجی نے کہا۔

”میں اگر چاہتی تو بہت پہلے امی اور بھائی میاں کے علم میں یہ بات لاسکتی تھی کہ
تم کس عذاب کی زندگی گزار رہی ہو۔ مگر میں نے سوچا۔ اماں اور بھائی میاں پہلے
ہی میری وجہ سے پریشان ہیں۔ تمہاری داستان سنا کر میں ان کے دکھوں میں اور غماز
ہی کرتی نا،“

”مجھے ہمیشہ سے یہ بات معلوم ہے کہ تم گھٹ گھٹ کر مر جانے والوں میں سے
ہو لیکن حرف شکایت زبان پر لا کر دنیا والوں کو تماشا دکھانا تم کبھی بھی پسند
نہیں کرو گی،“ سعدیہ باجی نے کہا۔

عفت نے کہا۔

”میری پریشانیوں اور تکلیفوں کا سبب کا نشان کی بے راہ روی ہے، آپ ذرا
اندازہ تو کیجئے سعدیہ باجی اس عورت کی ذہنی کیفیت، کاجس کا ایک ہی بیٹا ہوا اور اس
کی زندگی کے لمحات نشہ آور انجکشنوں کی نذر ہو کر دن بدن کم ہو رہے ہوں کا نشان
میں سب کچھ نہیں رکھا سعدیہ باجی! وہ تو بیس پڑیوں کا ایک پنجر ہے،“
سعدیہ باجی نے کہا۔

”ہاں! ابتدا میں، میں بھی یہی سمجھتی رہی کہ تمہاری اداسی کا سبب کا نشان کی بے راہ
راہی ہے مگر حقیقت بہت دنوں تک پھپی نہیں رہ سکتی۔“

پھر عفت سعدیہ باجی سے لگا ہیں نہ ملا سکی۔

عفت اماں کے یہاں سے واپس آئی تو شہاب احمد نے پلٹ کر یہ بھی نہ پوچھا کہ
تم کیوں رہ گئی تھیں۔ ویسے بھی وہ ان دنوں اپنی نئی نوجوان اور خوب صورت بیکروڑی میں
بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ بھی پوری طرح انہیں اپنے دام میں گرفتار کر لینے پر آمادہ
تھی۔ شہاب احمد کی عمر گزر گئی تھی تو کیا ہوا، بظاہر تو وہ جوان ہی نظر آتے تھے ان جیسے
مرد کبھی بوڑھے نہیں ہوتے، وہ تو سدا بہار ہوتے ہیں، مومنوں کا تغیر و تبدل بھی ان کی
صحت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

وہ تو ایک ساحر ہوتے ہیں۔

ہمیشہ جوان رہنے والے۔

لیکن ان کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار کر لینے والے۔

آفس سے واپسی پر وہ کتنی ڈھٹائی اور بے غیرتی سے ماریا کو اپنے ساتھ لے
پلے آتے تھے۔

ہر جگہ اسے ساتھ ساتھ لے پھرتے تھے۔

بقول ان کے — وہ ان کی ہمدرد و غمگسار تھی۔

وہ ان کی مولس تھی۔

وہ ان کی جلوتوں اور خلوتوں کی ساتھی تھی۔

اور عفت نے اپنے لبوں کو سما لیا تھا۔

اتنے مضبوط ٹانگے لگاتے تھے اس نے — جو کبھی کھل نہ سکیں، کبھی ٹوٹ نہ سکیں۔

اب اس کی تمام تر توجہ کاشان کی طرف تھی۔ منشیات سے اس کا چچا چھڑانے کی خاطر وہ اسے ایک ڈاکٹر سے دوسرے ڈاکٹر اور دوسرے سے تیسرے ڈاکٹر کے پاس اور پھر نہ جانے کہاں لے گئی۔ ڈاکٹروں کی نصیحتوں پر عمل کر دانے کی خاطر اسے کاشان پر سختیاں بھی کرنی پڑیں۔ اس وقت کاشان کی حالت قابل دیدار قابلِ رحم ہوتی تھی۔ وہ عفت کے سامنے ہاتھ جوڑا تھا، فریاد کرتا تھا۔

”نئی! خود گوڈ سیک (خدا کے واسطے) بس ایک انجکشن لے لوں، اچھا! انجکشن نہیں تو کوئی ہی سہی، پھر نہیں مانگوں گا کبھی نہیں،“

مفت ٹرپ کر سوچتی — خداوند! کس حال کو پہنچ گیا ہے میرا بیٹا! اس کے باپ کی غفلتوں نے اسے کیوں کا نہ چھوڑا۔

اس کا سارا حوصلہ اور ساری ہمتیں جواب دینے لگتیں۔ اس کی الی کو بے نشوون کا یہ نتیجہ نکل رہا تھا کہ کاشان دل بدن اس سے دور ہونا چاہتا تھا، اسے اپنی ماں سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسے اپنا دشمن سمجھنے لگا تھا۔

کبھی کبھی عفت کا دل چاہتا وہ دھیر ساری گولیاں کھا کر سو رہے۔

ہیمنشہ کے لئے، کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔

مگر رسوائی کا خوف اسے سر تا پا لہرزا کر رکھ دیتا۔

یہ احساس اسے سہا کر رکھ دیتا کہ پھر دنیا کو تماشا دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔

وہ اپنے اوپر کسی کو ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

وقت نے بڑے طویل فاصلے قائم کر دیئے تھے۔ اس کے زمانہ طالب علمی کے ساتھی — جن کے ساتھ اس نے کبھی بڑا اچھا وقت گزارا تھا، ملتے تھے مگر کبھی کبھی۔ ہمزس سے بھی اب وہ پہلی سی ملاقاتیں نہیں ہوتی تھیں، سب کی اپنی اپنی مصروفیتیں تھیں، اس نے ہرین کو بھی شہاب احمد کے ناروا سلوک کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ ہرین نے شہاب احمد کے بارے میں اڑتی اڑتی افواہیں سن کر کبھی عفت سے کچھ کریدنے کی کوشش بھی کی تو عفت نے بہرہ کر مثال دیا کہ لوگوں کے پاس بے پرکی اڑانے کے سہمیت وقت ہے، وہ کسی کو سکون سے رہتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے، شہاب احمد نے مجھے مذکی کی ہر خوشی اور ہر سکھ دیا ہے۔

پھر ہرین نے عفت کے چہرے پر کبھی کبھی چھائی ہوئی اداسی کو دیکھ کر یہ فرض کر لیا کہ اس کا سبب صرف اور صرف کاشان ہے۔

زندگی کی گاڑی کو اب کسی نہ کسی طور کھینچنا ہی تھا۔

بول بھی عفت کو ایسا محسوس ہونا تھا جیسے موت اور زندگی کے درمیان فاصلہ اب بہت زیادہ طویل نہیں رہا تھا۔

ایک روز — شام کو وہ ڈاکٹر کے پاس سے آ رہی تھی راستے میں اس کی

گاڑی غراب ہو گئی۔ اس نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی مگر گاڑی اس سے دُرت نہ ہوئی۔

سڑک کے کنارے وہ پریشان کھڑی تھی بھی گاڑی اس کے قریب آ کر رک گئی اس نے

دیکھا — وہ ذیشان تھا۔ ذیشان گاڑی سے اُتر کر اس کے قریب چلا آیا۔ عفت کسی

انجانے خوف سے کانپ کر رہ گئی۔

ذیشان نے کہا۔

” غالباً گاڑی خراب ہو گئی ہے آپ کی“

عفت نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

” میں دیکھ لیتا ہوں، اتنی دیر آپ میری گاڑی میں بیٹھ جاتے“

عفت نے انکار کیا تو اس نے کہا۔

” آپ کا سرٹک کے کنارے کھڑا ہونا میں مناسب نہیں سمجھتا۔“

ذیشان نے اس سے کئی دفعہ گاڑی میں بیٹھ جانے پر اصرار کیا لیکن عفت کا انکار

اقرار میں مذہلاً مجبوراً ذیشان خاموش ہو گیا۔ عفت کی گاڑی میں کچھ زیادہ ہی خرابی

تھی۔ ذیشان بڑی دیر تک انجن پر حکم مارا۔ کئی دفعہ اس نے گاڑی اشارت کرنے

کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

” گاڑی کو ورسٹاپ پہنچانا پڑے گا۔“

اس نے عفت کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

عفت کا چہرہ تکرور پشیمانی کی آماجگاہ بن گیا۔

” آپ بیٹھے گاڑی میں ہیں آپ کو ڈراپ کر دوں گا“

عفت نے کہا۔

” اگر کوئی رکشہ یا ٹیکسی مل جاتی تو.....“

” اس وقت یہاں سے رکشہ یا ٹیکسی ملنا بہت مشکل ہے“

” انتظار کر لینے میں کیا ہے؟ شاید مل ہی جلتے“

” آپ سوچ بیٹھے، تاریکی بڑھتی جا رہی ہے آپ کو گھر پہنچنے پہنچنے خاصی

دیر ہو جاتے گی۔“

” کوئی بات نہیں“

” جیسے آپ کی مرضی، لیکن آپ گاڑی میں تو بیٹھ جاتے، کوئی خالی ٹیکسی گزری

تو میں روک لوں گا“

عفت نے کہا۔

” نہیں، آپ جاتے، میں خود ہی روک لوں گی“

” اور گاڑی؟“

” اس کا بھی کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا“

عفت نے گاڑی کو لاک کرتے ہوئے کہا۔

ذیشان نے پوچھا۔

” آپ خوف زدہ ہیں؟“

” کس بات سے؟“

” اس بات سے کہ شہاب صاحب آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر کوئی اعتراض نہ

کر بیٹھیں“

” نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، وہ اتنے تنگ نظر نہیں ہیں۔“

” پھر اس مسلسل انکار کا سبب؟“

” بس! میں مناسب نہیں سمجھتی اپنے طور پر“

” ویسے میں ایک بات بتا دوں آپ کو؟“

” جی، کہتے“

” شہاب احمد صاحب سے میری خاصی دوستی ہے“

عفت کے لئے یہ چونکا دینے والا انکشاف تھا۔ اس نے چونک کر ذیشان کی طرف دیکھا۔

ذیشان نے کہا۔

”آپ اچھی طرح جانتی ہیں مجھے جھوٹ بولنے کی بالکل عادت نہیں، عفت نے بڑی قناعت سے کہا۔

”جی! میں جانتی ہوں مگر اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی جاننا چاہوں گی کہ آپ لوگوں کی یہ دوستی کب سے ہے؟“

”بس، جب سے ہم دونوں کی ملاقات ہوئی،“

”لیکن میں نے سوائے ایک دفعہ کے آپ کو اپنے گھر کبھی نہیں دیکھا،“

”میرے اور شہاب صاحب کے کچھ دوست مشترک ہیں، اکثر انہی کے گھروں پر ملاقاتیں ہو جاتی ہیں یا پھر کلب اور ہوٹل میں،“

”اچھا! عفت کی حیرانی ابھی تک دور نہیں ہوئی۔

ذیشان نے پوچھا۔

”آپ سے ذکر نہیں کیا انہوں نے؟“

”نہیں، دراصل میں خود بھی کبھی ان کے دوستوں کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کرتی،“

ذیشان نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

”اچھا، پھر پوچھتیے اس ذکر کو، آئیے میں آپ کو چھوڑ آؤں،“

عفت بعد بھی کہ وہ ٹیکسی کا انشفا کرے گی۔

ذیشان نے کہا۔

”تو پھر ٹیکسی مل جانے تک مجھے یہاں ٹھہرنے کی اجازت دیجئے،“

عفت نے انکار تو بہت کیا لیکن ذیشان اس وقت اس کی ضد کے آگے نہ ہٹکے کو تیار نہیں تھا۔ کافی دیر انتظار کے بعد بھی کوئی خالی ٹیکسی نہیں ملی۔ جب رات عفت کو ذیشان کی پیشکش قبول کرنی پڑی۔

عفت ذیشان کے ساتھ گھر پہنچی تو خلاف توقع شہاب احمد گھر میں موجود تھے۔ جو نہی ذیشان کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی شہاب احمد اپنے دوست کو رخصت کرنے کے لئے کارپورچ کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ ذیشان کو دیکھ کر وہ قدرے حیران ہوئے پھر مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ عفت گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اتری تو شہاب احمد کچھ اور حیران ہوئے اپنے دوست کو رخصت کر کے وہ ذیشان کے قریب چلے آئے۔ ذیشان بھی گاڑی سے اتر آیا۔

شہاب احمد نے بڑی انکرم جوشی سے ہاتھ ملائے ہوئے کہا۔

”ارے بھئی! آج کیسے راستہ بھول گئے؟“

ذیشان نے قریب کھڑی عفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ان کی گاڑی راستے میں حراب ہو گئی تھی، میں اتفاقاً ادھر سے گزر رہا تھا۔“ شہاب احمد نے کہا۔

”گویا ہماری بیگم صاحبہ کے طفیل میں آج آپ کے قدم عزیز خانے تک

چلے آئے ورنہ میری درخواستوں کو تو آپ رد ہی کرتے آرہے تھے۔“

ذیشان ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ بکھیرے خاموش کھڑا رہا۔

شہاب احمد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
”اب ہم آپ کو اس طرح تو جانے نہیں دیں گے“

ذیشان نے بہت عذر معذرت کی لیکن شہاب احمد نے اس کی ایک نہ سنی پھر وہ عفت سے مخاطب ہو کر بولے۔

”عفو! تمہاری بھی تو کچھ رشتہ داری ہے ان سے، تم انہیں روکنے پر ذرا بھی آمادہ نظر نہیں آتیں؟“
عفت نے کہا۔

”رشتہ داری! میل خیال ہے دوستی کا رشتہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے جب وہ آپ کے دوست ہو کر آپ کی بات نہیں مان رہے تو پھر میری بات کیوں یائیں گے؟“
”تم کہہ کر تو دیکھو۔“

”مگر آپ انہیں روکنے پر اس قدر لبند کیوں ہیں؟ ممکن ہے انہیں اس وقت کوئی ضروری کام ہو۔“

شہاب احمد نے کہا۔

”مگر میں چاہتا ہوں کہ تم انہیں روکو، یہ تمہارے بھی گمان ہیں“
عفت نے کہا۔

”اچھا صاحب! آپ رک جائیے اور اس وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

عفت کی بات سن کر ذیشان اور شہاب احمد بے ساختہ مسکرا دیے پھر ذیشان کو رک ہی جانا پڑا۔

اس کے بعد شہاب احمد ذیشان کو وقتاً فوقتاً اپنے ساتھ گھر لانے لگے۔ معلوم نہیں کہ وہ ذیشان سے بہت مرعوب نظر آتے تھے ان کا کہنا تھا کہ ذیشان امپریسز پرنسٹی کا ماہر ہے عفت نے شہاب احمد کے دوسرے تقریباً تمام دوستوں کے ساتھ آنا چھوڑ دیا تھا۔ صرف ان کے چند دوست جو شریف اور سلجھے ہوئے تھے، ان کے سامنے آئے اور بات کرنے میں عفت کو کوئی عار نہیں تھا لیکن کوشش کے باوجود وہ ذیشان سے اپنے رامن نہ بچا سکی۔ شہاب احمد کا حکم تھا کہ ذیشان جب اور جس وقت بھی اسے عفت کوں کی پذیرائی کرنی چاہئے کیونکہ وہ اس کا رشتہ دار تھا عفت کے کسی بھی رشتے دار کے وپر وہ اپنا اور اپنے گھر کے ماحول کا غلط امپریشن نہیں ڈالنا چاہتے تھے شہاب احمد نے ایک طرف رہے ان کی بہت اونچی اڑان اڑنے والی لاڈلی میٹی — تو یہ بھی ”ذیشان اکل“ سے بہت امپریسز تھی۔

عفت کے گھر میں ذیشان کی آمد و رفت بڑھی تو آہستہ آہستہ اس کے گھر میں مالا مال سے بھی وہ بڑی حتمک واقف ہو گیا لیکن اس نے اپنی زبان سے نہ کبھی کچھ بولا نہ کچھ کہا۔ اس نے تو کبھی یہ بھی نہیں پوچھا — ”عفت! کیسی گزر رہی ہے؟“
”گزری باتیں۔“

”نبیٹے لے۔“

اس نے کچھ بھی تو نہیں دہرایا۔

وہ تو عفت سے یوں ملتا تھا جیسے پہلے کبھی ان دونوں میں کوئی واقفیت، کوئی نا اہلی نہ رہی ہو، جیسے وہ صرف شہاب احمد کا دوست ہو اور عفت، شہاب احمد کا بہنوئی ہو اور کچھ نہ جواب ایسا بھی نہیں تھا کہ ان دونوں کو کبھی تنہائی ملنے اور بات

کرنے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔ اس کی باتوں سے عفت کے لئے نہ کسی دکھ کا اظہار ہوتا تھا نہ اس کی باتوں میں کوئی طنز ہوتا تھا اور نہ ہی اس کی نگاہوں میں کبھی یہ سوال ابھرتا تھا کہ —

”عفت! اسچ کو، اپنی زندگی کے اس فیصلے پر کوئی پچھتاوا تو نہیں تمہیں؟“
ہاں! جب اس نے کا نشان کو دیکھا تو وہ اپنے جذبات کو چھپا نہ سکا۔
اس کی آنکھوں سے بھجائکتا ہوا درد و کرب، حزن و ملال — عفت کی نگاہوں سے چھپ نہ سکا۔

شاید وہ سوچ رہا تھا۔ ایک عورت کی متاعِ حیات اور اس حال میں!
وہ کا نشان کے بارے میں عفت سے سوال کے بغیر نہ رہ سکا۔

اور عفت نے بھی کچھ چھپانا بے سود سمجھا۔

دوسری بہت سی باتیں — جو عفت کسی کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔
دیشان تو ان سے بھی واقف ہو چکا تھا تو پھر کا نشان کی حقیقت کو پروں

میں چھپا کر وہ کیا کرتی؟

دیشان نے مضور کو بھی دیکھا تھا — مضور جو ہو شو شہاب احمد کا

کاپی تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، سنجیدہ، بردبار اور ہر لحاظ سے ایک مکمل نوجوان۔

ایک ہی باپ کے دو بیٹے — ایک زمین اور دوسرا آسمان۔

قدرت کی کیسی ستم ظریفی تھی۔

یہ سب تقدیر کے کھیل تھے۔

ایک عورت ساپنا سب کچھ دائر پر لگا کر بھی قدم قدم پر ہارتی چلی آ رہی تھی۔

اور وقت —

وقت کسی طرح بے پرواہ و بے نیاز بنا کر راجا رہا تھا۔

عفت کی کلاس فیلو رخشندہ کئی برس بعد اپنے شوہر ادیب پچوں کے ساتھ انگلینڈ سے آئی تھی۔ شملانے اسے ٹیلیفون پر اطلاع دی اور کہا — ”میں رخشندہ کو کل یونیورسٹی آیا ہے، تم بھی آجانا، میری کلاسز گیارہ بجے ختم ہو جائیں گی، مل جل کے بیٹھیں گے پڑھ پرانی باتیں کریں گے“

رخشندہ کی آمد کی خبر سن کر عفت بہت خوش تھی، کتنے برس ہو گئے تھے اسے دیکھنے دئے، شملہ تو اسی شہر میں رہتی تھی لیکن اس سے بھی پچھلے پانچ سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

دوسرے روز — معلوم نہیں کتنے برسوں بعد وہ یونیورسٹی کی طرف جا رہی تھی۔

اس نے گاڑی کی رفتار کم کر رکھی تھی۔

بیتی باتوں اور گزرے لمحوں کا ایک سیلاب تھا جو امنڈ ایلانا تھا۔

جلنے لگتے چہرے تھے، کتنی صورتیں تھیں۔

یادوں کی دھند میں پھروں کے نقوش بن بن کے بگڑ رہے تھے۔

ہر صورت ایک کہانی کہتی ہوئی نظر آتی تھی۔

اور ہر چہرے پر ایک افسانہ تحریر تھا۔

اس کی گاڑی یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہوئی تو دل کی دھڑکیں جانے کیوں بے ترتیب سی ہونے لگیں۔

اس نے سوچا —

کچھ جگہوں اور کچھ لوگوں سے کیسے اٹوٹ نلے قائم ہو جاتے ہیں۔

یہ بندھن، یہ نلے کبھی نہیں ٹوٹتے۔

یہ میری سہیلیاں — میری ہمدرد، میری ہمرانہ —

میں انہیں اور وہ مجھے بھول سکتی ہیں؟

نہیں، شاید کبھی نہیں۔

تپتے بھلتے صحرا

سیاہی مائل سبز پانیوں کے وسیع، مگرے سمندر۔

ہواؤں کے بدلتے رخ

اور موسموں کے تغیر و تبدل —

کچھ بھی تو ہمارے دلوں سے ایک دوسرے کی یاد کو کھرچ کر نہ پھینک سکا۔

کچھ بھی تو ہمارے ذہنوں سے ایک دوسرے کے خیال کو جھٹک نہ سکا۔

ماہ و سال کا ایک طویل قافلہ ہے جو گزر چکا مگر یادیں — وہ انمول ہوتی

ہیں جو ہمارے دلوں کے سمندر میں، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کونے میں چھپے ہوئے ہیں

میں، خستہ درہ اور شہلا کو اور شہلا، رخسندہ مجھے کبھی نہیں بھلا سکیں گی۔

ہم میں سے کسی کی سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جائے تب بھی ہم زندہ رہیں گے —

ایک دوسرے کے دلوں میں

یادوں کے جھلملاتے دیتے — جو دل کے پرسکون گوشوں میں جلا کرتے ہیں،

کبھی نہیں بجھتے۔

کوئی طوفان، کوئی آندھی، کوئی باد و باران، یادوں کے جھلملاتے چراغوں کو نہیں
بھاسکتا — کبھی نہیں بجھاسکتا۔

یوں زندگی کتنی ہی مصروف کیوں نہ ہو، چلتے پھرتے، کام کاج کرتے ہوئے۔

سی نہ کسی لمحے ہمیں ان کا خیال آہی جاتا ہے جن سے زندگی کے کسی دور میں ہم قریب

ہے ہوں۔ بالکل اس خوشبو کی طرح جو ساحل سے آنے والی بھگی ہواؤں میں

ہی ہوتی ہے۔

اس نے ایک درخت کی چھاؤں میں اپنی گاڑی پارک کی اور گاڑی سے نیچے

نہ آئی۔ سارے اٹھتے ہوئے پلو کو سنبھالتے ہوئے اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔

ہی عمارتیں، وہی مصروفیتیں، وہی ہنگامے — زندگی جیسے اپنے عروج پر

، پرسٹ آفس، مسجد، ایڈمنسٹریٹو بلاک، بوائز ہاسٹل کی عمارت، جنازہ گاہ، آرٹس

بلیک کا نیا اور پرانا بلاک، اسلامک اسٹڈینز — سب اسی طرح سر اٹھاتے

رہی تھیں۔ بسوں کے انتظار میں، پختہ نیٹ کے نیچے، بچوں پر بیٹھے اور دیواروں کے

مارے کھڑے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کا،جوم، گاڑیوں کے مارن اور اسکوٹرڈوں

شور، کینڈین اور کیفریا کی طرف سے ہواؤں کے سانچے سانچے آتا ہوا بوتلوں، پیالوں

ٹوں اور چمچوں کا شور، درختوں کی چھاؤں میں اور گاڑیوں سے ٹیک لگائے ہوئے

کے لڑکوں کے میٹیز اور چار چار، پانچ پانچ کی ٹولی — زندگی اپنے اسی انداز

سے جلوہ گرہ لیتی۔

ہوا بہت تیز تھی۔

درختوں، پودوں اور خورد و بھلاؤوں کے درمیان سیٹیاں بجاتی ہوئی ہواؤں

”ہاں، یہ میں ہوں“ عفت اپنے چہرے پر چھائے ہوئے سوز کو گہری مسکراہٹ لے چھا گئی۔

”کتنی بدل گئی ہو، رخشندہ نے کہا۔

”وقت بھی تو کتنا گزر چکا ہے“ عفت ہنسی۔ لیکن اسے خود اندازہ تھا کہ اس ہنسی کتنی کھوکھلی تھی۔

رخشندہ چند سیکنڈ عفت کی طرف دیکھتی رہی پھر بے اختیار اس سے بٹ گئی۔ عفت کی آنکھوں میں نئی سی اُمتر آئی۔ جب وہ دونوں الگ ہوئیں عفت نے دیکھا رخشندہ کے رخساروں پر آنسو پھیل آئے تھے۔

عفت نے سوچا۔

لوگ کتنی آسانی سے آنسو بہا لیتے ہیں لیکن میں نے تو اپنے ہونٹوں کو سینے سے ساتھ ساتھ آنسوؤں کا بھی گلا گھونٹ دیا ہے۔

وہ دونوں بیٹھیں تو رخشندہ نے پوچھا۔

”تم خوش تو ہو عفت!“

عفت نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں! خدا کا شکر ہے میں بہت خوش اور مطمئن ہوں“

”مگر تمہاری صحت بہت گر گئی ہے“ رخشندہ کی لگا ہوں میں کچھ شک سا تھا۔

عفت نے کہا۔

”ہاں! شاید بہت زیادہ عیش و آرام نے میری صحت خراب کر دی ہے“

شہلا نے پوچھا۔

کا شہر تھا۔

گرد کا طوفان تھا۔

عفت کو اپنی ساڑھی سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے اس نے سرک پار کی اور تند ہوا کی زد سے اپنے آپ کو بچانے کی خاطر سامنے والے کوریڈور میں داخل ہو گئی۔ طویل کوریڈور سے گزرتے ہوئے وہی پرانا مانوس سا ماحول نظر آیا۔ لائن سے بنے ہوئے کمروں کے باہر لگی ہوئی تختیاں، سیمینار میں لڑکے لڑکیوں کی مدھم مدھم سرگوشیاں، مختلف شعبہ جات کے آفس میں ثابت راستہ پر چکے ہوئے کلرک، ثابت راستروں کی کھٹا کھٹ، لکچر روم کے مشالے میں گونجتی ہوئی کسی ڈاکٹر کسی پروفیسر کی آواز، آفس سے باہر بیٹھے ہوئے کمزور اور بوڑھے چڑا سیوں کے کھانٹے کھنکارنے کی آوازیں، کہیں کہیں کسی ہیرو قسم کے چڑا سی سے لڑکوں کا ہنسی مذاق، پھیپھڑا چاڑ، کوریڈور کے سلمنے بنے ہوئے لان میں بیٹھے ہوئے لڑکوں لڑکیوں کے گرہ پ۔

عفت برسوں پیچھے لوٹ گئی اسے اپنا طالب علمی کا زمانہ یاد آ گیا۔ وہ شہلا کے کمرے میں پہنچی تو رخشندہ پہلے ہی سے موجود تھی وہ سرخ و سفید اور صحت مند نظر آ رہی تھی۔

شہلا نے عفت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”لو بھئی! وہ آگئیں جن کا انتظار تھا“

رخشندہ بے مین ہو کر کمرے سے کھڑی ہو گئی اور بولی۔

”یہ تم ہو عفت!“

”آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟“

”بے خوابی کی شکایت تو ایک عرصے سے ہے“

شملہ مسکرا کر کہہ لولا۔

”خیر بے خوابی کی شکایت تو تمام بڑے لوگوں میں عام ہوتی ہے،

رخشندہ ہنس پڑی، عفت بھی مسکرا دی۔

”اور کیا شکایت ہے تمہیں؟“ رخشندہ نے پوچھا۔

”میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے رختی، بس ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بیٹھے بیٹھے

دل کی حرکت بند ہو جاتے گی“

”اے ہے، خدا نہ کرے“ رخشندہ نے سہم کر کہا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں“ عفت نے کہا۔

”تم اپنا علاج کیوں نہیں کروا تیں باقاعدگی سے؟“

”علاج تو مسلسل جاری ہے“

”پھر بھی افادہ نہیں؟“

”کبھی ہو بھی جاتا ہے“

”آخر کیا وجہ ہے؟ کوئی ذہنی پریشانی؟“

”چرخہ خوشی پر سکھ تو مجھے میسر ہے پھر ذہنی پریشانی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔“

عفت نے اپنے سینے سے اٹھنے والی ہوک کا اندر ہی اندر گلا گھونٹ دیا۔

شملہ نے کہا۔

”اچھا سچ بتاؤ، تم ذیشان کو ٹھکرا کر چھتا تیں تو نہیں“

”کیسی بات کہہ رہی ہو شملہ؟“

شملہ نے ایک ٹھنڈی مسافس بھرتے ہوئے کہا۔

”ذیشانی کو دیکھ کر دل بہت دکھتا ہے، تمہارے بعد اس کے دل وزگاہ میں پھر

لڑی نہیں سما یا۔ اس کے بالوں میں سفیدی آگئی ہے مگر اس کی ماں اور بہنیں اس کے سرے

کے پھول دیکھنے کی حسرت ہی لئے ہوتے ہیں“

رخشندہ نے کہا۔

”ارے ہاں عفت! اس کی بہن تو تمہاری بھابی ہے نا!“

”ہاں، بڑی پیاری عورت ہے“ عفت نے بخت سے کہا۔

”تمہاری امی کے گھر تو ذیشان آتا ہوگا۔ وہاں کبھی تمہاری ملاقات نہیں ہوئی اس

سے؟“

”بس ایک دفعہ کینیڈا سے واپسی پر اس کی دعوت ہوئی تھی جب“

”مگر وہ آتا تو رہتا ہوگا۔“

”ہاں، سنا ہے بہت کم آتا ہے“

”ویسے اگر وہ چاہے تو رشتہ داری کا بہانہ بنا کر تمہارے گھر بھی آ سکتا ہے“ شملہ

نے کہا۔

عفت نے کوئی جواب نہیں دیا، مگر اس نے سوچا۔

ذیشان! آخر تم کن بلندیوں کو چھو لینے کی کوشش کر رہے ہو؟

مجھے معلوم ہے کہ شملہ اور یوسف سے تمہاری کتنی بے تکلفی ہے، تم نے ان سے بھی ذکر

میں کیا کر شہاب احمد کے دوست ہونے کے ناطے تم اکثر ہمارے گھر آتے ہو۔

تم نے تو کبھی اپنی بہن کو بھی اس بات کی خبر نہیں ہونے دی کہ تم نے جس کی خاطر اپنی اتنی زندگی یونی گزاردی وہ کوئی اور نہیں تمہاری بہن کی منہ ہے، تم کہیں کسی عقل میں میرا تذکرہ نہیں کرتے۔

وہ تنہا اور خشنہ کے پاس خاصی دینک بیٹھی رہی۔ واپسی میں وہ خشنہ کو اس کے گھر ڈراپ کرنے کے لئے رکی تو خشنہ اسے اندر لے آئی۔ اس نے اپنے بچوں سے عفت کو بلایا۔ خشنہ کے بچوں سے ملے ہوئے اُسے اپنے بیٹے کا نشان کا خیال آیا۔ اس کے سینے میں ایک ہوک سی اُٹھی اور دل کی حرکت بند ہوتی ہوئی محسوس ہوتی اس نے خشنہ سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی مانگ کر پیا اور مشکل تمام گھر واپس آئی۔

اگلے روز خرم انگلینڈ سے واپس آیا۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے وہیں پریکٹس شروع کر دی تھی وہ کئی برسوں بعد وطن آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ شام کو شہاب احمد سے ساتھ لے کر خرم سے ملے آئے۔ عفت دیکھتی تھی وہ اس کے گھر والوں کے سامنے کس طرح خوش اخلاقی، خوش مزاجی اور عفت کے ساتھ اپنائیت کا مظاہرہ کرتے تھے اندوہ ان کی اس بات پر خوش بھی تھی، کچھ تو بھرم رکھتے تھے وہ۔

خرم کو دیکھ کر سعدیہ باجی کے زخم بھرتا زبے ہو گئے تھے۔

خرم اور اس کی بیوی انہیں تسلیاں دے رہے تھے۔ ہم آپ کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے وہاں جا کر آپ کا دل بہل جائے گا۔

عفت نے سوچا۔

یہ سب لفظی تسلیاں ہیں ورنہ کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جو کبھی کہیں کسی جگہ جا کر نہیں مندمل ہوتے۔

خرم کو آتے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہوا تھا جب بالکل اچانک بھائی میاں چل بسے، وہ مار نہیں تھے، انہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ فجر کی نماز کے لئے آتے تھے، وضو کر کے نماز، لئے کھڑے ہوتے، فرض رکعت پڑھتے ہوتے بعدے میں گئے تو خانہ جنتی کے نور بجھکے ہی رہ گئے۔ اماں بھی فجر کی نماز کے لئے اُٹھی تھیں۔ وہ نماز اور تلاوت سے رخ بھی ہو گئیں مگر بھائی میاں کا جھکا ہوا سر اوپر نہ اُٹھ سکا۔ بہت دیر بعد جب آماں کا کام سے برآمدے میں آئیں تو انہوں نے حیران ہو کر سوچا۔ اسے آخر یہ کون سی نماز اچھڑے ہیں؟

پھر آہ و فغاں، سسکیوں اور پچکلیوں سے گھر کے در و دیوار لرز اُٹھے۔

اماں کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی کراچی کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔

ان کی سونی کلائیوں پر نگاہ پڑتے ہی عفت کا دل بیٹھ سا گیا۔

کتنی خاموشی اور کتنے آرام سے چل دیے تھے بھائی میاں؟

موت اتنی آسان بھی ہوتی ہے؟

عفت نے سوچا۔

بھائی میاں کو شاید سعدیہ باجی کا دکھ مار گیا۔

چلو اچھا ہوا۔ میں ان کی نگاہوں میں شرمسار ہونے سے بچ گئی۔

بھائی میاں۔ جو مقام عمر اپنے کسی کام کے لئے کسی کے محتاج نہ رہے اب

وقت، وقت، رخصت و وسروں کے کندھوں کا سہارا لے چپ چاپ خاموش

پنی منزل کی طرف اپنی آرام گاہ کی طرف چلے جا رہے تھے۔

عفت درپے کی جالی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑے ہوئے، ہونٹ

دانوں تلے پھینچے ہوئے اپنی خشک دیران آنکھوں میں حسرت لئے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ بڑی آہا، چھوٹی آہا، سعدیہ باجی اور فوزی چھوٹ چھوٹ کر رو رہی تھیں، اماں سسک رہی تھیں، دوسری عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر اس کی آنکھوں کو جلنے کیا ہو گیا تھا

اس نے سوچا —

نشاید آنسوؤں کے سوتے خشک ہونا اسے ہی سکتے ہیں۔

اس نے چند عورتوں کی کھسر بھسر بھی سنی جو اس پر تنقید کر رہی تھی۔

”اے اس عفت کو دیکھا۔ باپ کے مرنے کا ذرا غم نہیں اسے“

”ہاں بہن! اس کی آنکھ سے تو ہم نے ایک آنسو بھی ٹپکتے نہیں دیکھا۔“

”بڑے گھر میں کیا بڑا ہی گئی خون ہی سفید ہو گیا اس کا تو۔“

”ارے بڑا! اسے ذرا بھی غمت نہیں رہی اپنے میکے والوں سے“

عفت نے فریاد کی —

خدا یا! ایسا کوئی طریقہ نہیں کہ لوگ دوسرے کے دل میں جھانک کر اس کے درد کی گرائی کا اندازہ کر سکیں؟

پانی کے ان قطرہوں کی بڑی وقعت، بڑی قدر ہے لوگوں کی نگاہوں میں؟

اس نے بڑی بے دردی سے اپنی آنکھوں کو مسل ڈالا۔

اور وقت کا بہار دیا پھر روال دوال تھا۔ اس کے اور شہاب احمد کے درمیان فاصلے جوں کے توں تھے۔ ذیشان اکثر آجاتا تھا۔ ایک روز وہ آیا تو عفت کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ اس نے ملازم سے کہلوادیا کہ بیگم صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اگر وہ صاحب

تظارا کر سکتے ہیں تو کہہ لیں۔ ذیشان واپس جانے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ شہاب احمد آئے۔ پھر خاصی دیر بعد جب وہ ذیشان کو رخصت کر کے عفت کے کمرے میں آئے تو تباہ ہو گئے۔

”آپ اپنے آپ کو بہت بڑی ہستی نہ سمجھیں عفت بیگم! آخر ایسی کیا طبیعت خراب آپ کی جو آپ عفو کی دیر سے ڈرائنگ روم میں جا سکتی تھیں؟“

عفت نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے بے لفظ مناتے رکھے۔ عفت ہونٹ پھینچنے خاموش رہی۔ وہ تنہا ہی انداز سے بولے۔

”بہر حال! آپ اس بات کو میرا حکم سمجھیں کہ ذیشان جب بھی آئے آپ اس کا دل رکھیں، میرے اور دوستوں میں تو آپ کوئی نہ کوئی خامی نکال دیتی ہیں لیکن ذیشان تو آپ کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے، یا اس کی شرافت اور متانت میں بھی کوئی ہے آپ کو؟“

عفت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر ایک روز شہاب احمد کافی دیر ذیشان کا انتظار کرنے کے بعد گھر سے گئے، یہ کہ وہ آگیا۔ اس روز بادل صبح ہی سے گھرے ہوئے تھے اور دن بھر وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی۔ ذیشان آیا تو تقریباً رات ہو چکی تھی۔ ذیشان کے آنے سے پہلے عفت کا شان سے الجھا الجھا کر مڑے سر لیٹے اپنے کمرے میں پڑی تھی۔ کا شان نے سے جیتے جی مار دیا تھا اور اب تو وہ التجا میں کرنے اور فریاد کرنے کے بجائے برہمی کا زحمتا کر رہا تھا۔ ملازم نے ذیشان کے آنے کی اطلاع دی تو اس کا بالکل بھی دل نہ چاہا، ڈرائنگ روم میں جانے لگا۔ شہاب احمد کی اس روز والی برہمی کا خیال آتے ہی وہ اٹھ کھڑی

ہوئی۔ اسے ذیشان کے پاس بیٹھے ہوئے بہت دیر نہیں گزری تھی کہ لائٹ چلی گئی چند منٹ
تو وہ لائٹ آجانے کا انتظار کرتی رہی۔
پھر شمع دان جلانے کے خیال سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
اس نے کہا۔

”معلوم نہیں لائٹ کب آئے گی میں سو م تیاں جلا دوں“
ذیشان نے کہا۔

”آپ بیٹھے، میں جلا دینا ہوں،“

دونوں ہی ایک دوسرے کو منع کرتے ہوئے اندھیرے میں اٹھے تو عفت میز
سے ٹکرا گئی۔ قبل اس کے کہ وہ ٹھوکر کھا کر کہہ جاتی ذیشان نے اندھیرے میں ٹٹول کر اسے
سہارا دیا۔ اور اسی وقت لائٹ آگئی عفت نے حیرت سے دیکھا تو ڈرائنگ روم کے
سامنے والے درجے کے باہر اس کا بیٹا کا شان گھبرا اٹھا۔ وہ عفت کو ذیشان کے بل بوتوں
کے حلقے میں دیکھ چکا تھا۔ موسم خنک ہونے کے باوجود عفت کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں
چمکنے لگیں۔

ذیشان دو قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔

”آپ کو چوٹ تو نہیں آئی،“

مگر عفت کو اپنے پرہیزگار لگ جانے والی چوٹ کا احساس کہاں تھا۔
اس کے رگ و پے میں تو احساس خوف سرایت کر گیا تھا۔

یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا تھا۔

مگر ہونے والی بات ہو چکی تھی۔

اور۔۔۔ وقت گزر چکا تھا۔

پھر ذیشان کے چلے جانے کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکی تھی۔
وہ تو خواہ مخواہ ہی مجرم بن گئی تھی۔
وہ تو گناہ بے لذت کا شکار ہو گئی تھی۔

اس روز اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ذیشان کو یہاں آنے سے منع کر دے گی۔
اور جب اگلی دفعہ ذیشان آیا تو اس نے اس سے سب سے پہلی بات یہی کہی۔
”ذیشان صاحب! آپ یہاں مت آیا کیجئے۔“

”میں یہاں آنا بھی نہیں چاہتا لیکن شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ شہاب صاحب کتنی
تنت سے اصرار کرتے ہیں“

”آپ کوئی بہانہ نہیں بنا سکتے؟“

”میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں تو خود یہاں آکر اپنے آپ کو مجرم محسوس
نے لگتا ہوں۔“

”مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی دل ان کی نگاہوں میں مجرم بن جاؤں گی،“
”آپ اتنی خوف زدہ نہ ہوں عفت! ہمارے دامن بالکل پاک ہیں،“

”مگر بعض اوقات ذرا سی بات ہی دل میں شک پیدا کر لیتی ہے،“

”میں تو خود اسی کو شش میں ہوں کہ کسی طرح میرا یہاں آنے کا سلسلہ بند ہو جائے
اگر آپ نے خود بھی محسوس کیا ہوگا کہ میں پہلے کے مقابلے میں اب بہت کم آتا ہوں۔“
عفت نے سر ہلادیا۔

”آپ اطمینان رکھتے، میں انشاء اللہ آہستہ آہستہ بالکل قطع تعلق کر لوں گا،“

راہداری میں قدموں کی آہٹ ہوئی تو دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔ شہاب احمدؔ
سہے تھے۔

انہوں نے ذیشان کو غائب کر کے کہا۔

”معاف کرنا یاد آج کچھ ایسی میند آئی کہ ہوش ہی نہیں رہا“

”پھر اب کیا ارادہ ہے، چلیں کہیں باہر؟“

”باہر جانے کے لئے ٹپکڑے بدلتے پڑیں گے، تم تھوڑی دیر انتظار کرو، میں ابھی آیا“

پھر انہوں نے عفت سے کہا۔

”تم نے ان کے لئے پائے نہیں بنوائے عفت؟“

”جی امیں نے کہہ تو دیا تھا، بس آتی ہی ہو گی چائے“

شہاب احمدؔ کپڑے بدلنے گئے تو ذیشان نے کہا۔

”میں کو کشش کروں گا کہ آئندہ یہاں کبھی نہ آؤں لیکن.....“

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر عفت کی طرف دیکھا۔

”لیکن؟“

عفت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایک بات پوچھوں؟ آپ سچ سچ بتائیں گی؟“

”پوچھیے“

”آپ کو اپنی زندگی کے اس فیصلے پر کوئی پچھتاوا تو نہیں؟“

”کون سے فیصلے پر؟“

”یہی، شہاب احمدؔ سے شادی کا فیصلہ کرنے پر۔“

”پچھتاوا کیوں ہوگا؟ میں نے اس زندگی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور
مائل کو سرسرا نظر انداز تو نہیں کیا تھا۔“

”ہوں،“ ذیشان نے ایک گہری سانس لی۔

”میں نے تو دوسروں کی خاطر زندہ رہنے کا ایک تجربہ کیا تھا، تجربہ تو پھر تجربہ ہی ہوتا

ہے، کبھی کامیاب ہو جاتا ہے اور کبھی ناکام“ عفت نے کہا۔

”اد میں جو زندگی گزار رہا ہوں، اس پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گی آپ؟“

”آپ کی زندگی پر کیا تبصرہ کروں ذیشان صاحب؟ سوائے اس کے کہ آپ نے اپنے اوپر

راہِ منظر کیا ہے، نا انصافی کی ہے، کوئی کسی کی خاطر اس طرح بھی اپنے آپ کو برباد کرنا ہے؟“

ذیشان نے آنکھیں بند کر کے سرموئے کی لپٹ سے ٹیک دیا اور بولا۔

”مٹھروں مٹھروں، ملکوں ملکوں گھوما ہوں عفت! مگر یہ دل کبھی اور کہیں کسی کو چاہنے پر

ادہ ہی نہ ہو سکا، یہ تو ایک غیر امتیازی جذبہ ہے جو ایک ہستی ہی کے لئے پیدا ہوا

برس! پھر کہانی اسی کے ساتھ ختم ہو گئی۔“

عفت چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

ذیشان نے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں، میں اب یہاں نہیں آؤں گا۔“

پھر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

لحے وقت کی قید سے آزاد ہو رہے تھے۔

اندھ بھی خاموش تھی۔

اور باہر بھی سناٹا

دھواں دھواں شام مدھم تار بجی کی بانہوں میں سمٹی جا رہی تھی۔

شہاب احمد خاصی دیر بعد تیار ہو کر آئے تو ذیشان ان کے ساتھ چلا گیا۔

پھر کئی عینے گزر گئے۔ ذیشان نہیں آیا۔

عفت ویسے تو پرسکون تھی لیکن شہاب احمد کی طمنز یہ لگا ہوا ہے اسے اندر ہی

اندر خوف زدہ کئے رہتی تھیں۔

وہ زہر خنڈ سکتے۔

”اب تو آپ خوش ہیں عفت بیگم! ذیشان یہاں نہیں آتا،“

”آپ کو اس کا یہاں آنا ناگوار گوارا لگتا تھا نا!“

اور پھر ایک دن تو وہ پھٹ ہی پڑے۔

وہ بہت گرجے اور بہت برے۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں میں اندھا اور بہرا ہوں؟“

”برسوں اپنے راز کو دینے میں پھپھلتے رکھا آپ نے، لیکن آخر کب تک؟ ایک نہ

ایک روز تو اس راز پر سے پردہ ہٹنا ہی تھا، سو وہ ہٹ چکا، آپ کی پارسائی کا

بھرم کھل چکا۔“

اور عفت سر تاپا لاکنپ کر بولی۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ شہاب احمد!“

وہ ایک دم بیچ پڑے۔

”غلط فہمی ہوئی نہیں ہے بلکہ غلط فہمی دور ہو چکی۔“

”آپ میری بات تو سن لیجئے۔“ عفت نے بے بسی سے کہا۔

”میرے کردار پر تو بڑی تنقیدی نگاہیں تھیں آپ کی“

شہاب احمد کا لہجہ طنز سے بھر پور تھا۔

”غلط بیانی نہ کیجئے، میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں کہا،“ عفت نے کہا۔

”زبان سے نہیں کہا تو کیا ہوا؟ آپ کی نگاہوں کا مفہوم تو سمجھ لیتا ہوں میں، اتنی

صلاحیت تو ہے مجھ میں“

عفت نے ایک دبی ہوئی سانس لی۔

شہاب احمد نے انتہائی مخمیلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولے۔

”دوسروں کے کردار پر کیچڑ اچھا لسنے سے پہلے اپنے کردار کا بھی جائزہ لے لیا ہوتا،“

”گھر میں نے کیا کیا ہے مجھے میرا تصور تو بتا دیجئے“

”بہت معصوم نہ بنئے عفت بیگم! ایک شخص کی محبت اور اس سے وابستہ یادوں

کو دل میں بسا کر آپ نے عمر کے اتنے بہت سارے برس مجھے دھوکہ دینے ہوئے گزار دیئے

اور پھر بھی پوچھتی ہیں کہ...“

شہاب احمد کا لہجہ ٹیڈٹ دل کو چور چور کر دینے کی حزنک ظالمانہ تھا۔

عفت نے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”کس شخص کی محبت اور اس سے وابستہ یادوں کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟“

”افوہ! آپ اس قدر بھولی نہ بنئے، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں ذیشان کا

ذکر کر رہا ہوں۔“

عفت شہاب احمد کے لہجے کے سفاکانہ وار کی برداشت کرتے ہوئے بولی۔

”آپ سے کس نے کہا کہ میں ذیشان کی محبت کو دل میں بسا رہے ہوئے ہوں؟“

شہاب احمد اس کی بات کو سرا سر نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔
 ”یا مکیجئے عفت بیگم! میں نے ایک دفعہ آپ سے کہا تھا کہ سچ بٹائیے آپ کے
 دل میں میرے لئے محبت اور چاہت کے جذبات ہیں یا نہیں؟“
 عفت خاموش رہی۔

شہاب احمد اس کے بالکل قریب آکر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔
 ”جانتی ہیں آپ نے کیا کہا تھا؟“
 عفت پھر بھی چپ رہی۔
 شہاب احمد نے کہا۔

”آپ نے کہا تھا کہ میں نہ اقرار کروں گی نہ انکار“
 ”کیوں؟ یہی کہا تھا نا آپ نے!“
 عفت نے آہستہ سے سر ہلایا۔

شہاب احمد عفت کو تفریباً جھجھوٹتے ہوئے بولے۔
 ”آپ اقرار کر بھی کیسے سکتی تھیں عفت بیگم! آپ اقرار کر بھی کیسے سکتی تھیں؟
 آپ تو ذیشان سے محبت کرتی تھیں“

”یہ جھوٹ ہے، یہ جھوٹ ہے، عفت نے فرط غم سے اپنے ہونٹ دانتوں
 تلے چسپخ لئے۔

شہاب احمد گرج کر بولے۔

”یہ جھوٹ نہیں ہے سچ ہے۔“

”بلکہ آپ اسے سچ سمجھتے ہیں تو میں آپ ہی سے پوچھتی ہوں کہ میں نے ذیشان

سے شادی کیوں نہ کر لی؟ کون سی رکاوٹ تھی میری راہ میں؟ میں آزاد تھی، آپ کے
 ساتھ شادی کر لینے پر مجبور تو نہیں تھی“

شہاب احمد طنز سے بھرپور مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے بولے۔
 ”جی ہاں! آپ مجھ سے شادی کرنے پر مجبور تو نہیں تھیں لیکن آپ کے خواب؟
 بکھر نہ جانے آپ کے خواب؟“

”کون سے خواب؟ کیسے خواب؟“

”وہی، جو ہر لڑکی دیکھتی ہے سلیٹس، دولت اور۔۔۔۔۔“

اور شہاب احمد کا یہ جملہ عفت کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ وہ اپنے کانوں پر
 دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”چپ ہو جائیے شہاب احمد! چپ ہو جائیے، اتنی پست ذہنیت کا مظاہرہ
 نہ کیجئے کہ دنیا کے ہر پرخلاص جذبے پر سے میرا اعتبار اٹھ جائے“
 شہاب احمد غیب انداز سے منہس کر بولے۔

”ہنہ! ہر پرخلاص جذبے، ہر خواص جذبے آپ نے ذیشان کو چاہا ہوگا“
 عفت مدحاًل سی ہو کر قریب پرانی مری پر بیٹھ گئی اور کچھرتی ہوئی سالنوں کے
 درمیان بولی۔

”میں کون سی قسم کھاتی تھی کہ خدا کے بعد اگر کبھی کسی ہستی کو سب سے کم
 نودل چاہا تو وہ صرف آپ کی ہستی ہے، اگرچہ پھر بھی میرے خلوص کی سچائی کا
 آپ کو اعتبار نہیں دیکھتا۔۔۔۔۔ تو پھر۔۔۔۔۔“

عفت نے آنکھیں بند کر کے سر کے سی کی پشت سے ٹیک دیا۔

” سب کتابی باتیں ہیں اور آپ تو ویسے بھی افسانہ نگار رہ چکی ہیں، آپ افسانہ نگار
شاعر اور ادیب تو الفاظ سے کھیلنے کے فن میں ماہر ہوتے ہیں،“
شہاب احمد نے قریب پڑی نپائی کو ایک زوردار ٹھوکہ ماری اور پیر پٹختے ہوئے
کمرے سے باہر چلے گئے۔
عفت اپنے کچے کچے دل کو دونوں ہاتھوں سے بچھائے گری گری سانسیں
لیتی رہی۔

دن ایک کے بعد ایک بڑی خاموشی سے گزر رہے تھے، ہر طرف سے گھبراہٹ
عفت نے اپنے آپ کو کتابوں میں غرق کر دیا تھا ورنہ ادھر کئی سالوں سے تو یہ حال تھا۔
کہ سوائے اخبار اور دو ایک میگزین پڑھنے کے وہ کسی اور کتاب کو ہاتھ ہی نہیں لگاتی
تھی۔ دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ کچھ پڑھنے کو۔ اور کچھ لکھنے کو۔ تو ایک مدت ہو گئی تھی۔ علم و
ادب سے اس کا ناٹھ ایسا لٹوٹا تھا کہ پھر کوشش کے باوجود جڑ ہی نہ سکا۔ باقی پرانی
فالوں کو نکال کر وہ دیکھتی رہتی۔ کچھ کمال اور ناکمل تحریروں میں تھیں، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ
افسانوں کے مسودے تھے۔

اپنی تحریروں پر نظر دوڑاتے ہوئے وہ سوچتی — شہاب احمد! میرا خدا
گواہ ہے کہ میں نے وہ خواب کبھی نہیں دیکھے تھے جو عموماً لڑکیاں دیکھتی ہیں۔
آپ کی دولت، آپ کا اسٹیٹس — میرے نزدیک ان کی اہمیت کبھی بھی
نہیں رہی۔

دوسری طرف دلیشان کہہ رہا تھا۔

”عفت! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آج شام آ جاؤں۔“

عفت نے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔

”کیوں؟ آپ کیوں آنا چاہتے ہیں؟ منت آئیے۔“

”شہاب احمد نے مجھے ٹیلیفون کیا تھا بڑی سخت تاکید کی ہے مجھے آنے کی۔“

”آپ نے وجہ نہیں پوچھی؟“

”کہتے تھے کوئی بہت الجھا ہوا مسئلہ سلجھانا ہے، معلوم نہیں کیسی الجھی ہوئی باتیں کر

رہے تھے، کچھ صلح صفائی کا ذکر تھا، کچھ بے گناہی کا تذکرہ تھا۔“

عفت کے دل میں امید کی ایک ننھی سی کرن جگمگاتی۔

اس نے سوچا۔

شاید شہاب احمد کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

شاید میری زندگی کے کچھ اچھے دن باقی ہیں۔

عفت نے کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ آجائے گا، لیکن آنے سے پہلے ٹیلیفون کر لیجئے گا، اگر شہاب

صاحب گھر میں موجود ہوں تو آئیے گا۔“

شام کو دلیشان کا ٹیلیفون آیا تو شہاب احمد سو رہے تھے۔

عفت نے کہا۔

”جی ہاں! وہ گھر پر ہی ہیں آپ آجائے۔“

پھر اس نے ملازم کو شہاب احمد کے کمرے میں بھیج کر انہیں اطلاع کر دیا۔

دلیشان آیا تو ملازم نے اگر عفت کو یہی اطلاع دی، عفت کی طبیعت اس وقت

بہت خراب تھی معلوم نہیں کیسے وہ برداشت کئے لیٹی تھی۔ وہ کچھ چڑا کر، کچھ الجھ کر بولی۔

”صاحب کو اطلاع کیوں نہیں کرتے تم؟“

”جی! وہ تو سو رہے ہیں۔“

”سو رہے ہیں تو اٹھا دو انہیں۔“

تھوڑی دیر بعد ملازم لٹے قدموں واپس آ کر کچھ سمے ہوئے لباس میں بولا۔

”صاحب ناراض ہو رہے ہیں۔“

”کیوں؟ کس بات پر ناراض ہو رہے ہیں؟“

”وہ کہتے ہیں کہ بیگم صاحبہ تھوڑی دیر کے لئے ال کے پاس کیوں نہیں بیٹھ جاتیں۔ میں

بستر سے اٹھ کر فوراً ہی تو کسی کے پاس نہیں آ سکتا۔“

عفت سوچ میں پڑ گئی تو ملازم نے کچھ جھجکے ہوئے کہا۔

”جی وہ یہ بھی کہ رہے تھے کہ بیگم صاحبہ سے کوئی بہتر حکم ہے کہ میرے آنے تک وہ

ہاں کے پاس بیٹھیں۔“

عفت نے ایک دلی ہوئی مانس لے کر سوچا۔

”اچھا! تو اب فوریت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ ملازموں کی زبانی تجریر احکامات صادر کرے گا۔“

وہ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی اس نے ملازم سے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم جا کر چلتے جاؤ، میں ابھی آتی ہوں۔“

بستر سے اترتے ہوئے اس نے قد آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔

مگجے کپڑے، کبھرے ہوئے بال، اچھا ہوا زرد چہرہ اور تکلیف کی شدت سے سفید پڑتے

ہوئے ہونٹ۔

اس کی حالت ایسی تو ہرگز نہیں تھی کہ وہ یوں کسی کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی۔ اس نے بڑی ہمت کر کے منہ دھویا، لباس تبدیل کیا اور بالوں میں گنگھا کر کے ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔ مگر اتنی ہی دیر میں وہ بہت مذہال ہو گئی تھی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس کے ہاتھ پیٹھ ٹڑے ہو گئے تھے۔ اس نے ایک سینکڑے لے کر رک کر دروازے کا سہارا لیا۔ سامنے ڈیشیاں صوفے کی پشت سے سرٹکاتے گری سوچوں ہی ڈوبا بیٹھا تھا۔ عفت پھر ہمت کر کے آگے بڑھی۔ مگر۔۔۔۔۔

چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ ایک ٹھٹھائی آئی اور اس سے پہلے کہ وہ کمزوری اور لغاہت کے مارے گر جاتی ڈیشیاں نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

وہ گھر آ کر بولا۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

”ٹھیک ہوں، میں بالکل ٹھیک ہوں،“ عفت بڑی مشکل سے مسکرائی۔

اس نے بہت چاہا کہ وہ ڈیشیاں کا سہارا نہ لے لیکن اسے اچھی طرح اندازہ تھا۔ کہ اب وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے گی، وہاں۔۔۔ درمیان میں کوئی کمری کوئی میز ہوتی تو وہ اس پر ٹک جاتی۔

ڈیشیاں اس کے زرد ہوتے ہوئے چہرے کو پریشان نکا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”آپ آرام کیجئے عفت، میں آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ آؤں؟“

اور۔۔۔ ابھی عفت جواب بھی نہیں دے پائی تھی کہ اس نے سامنے والے دروازے سے شہاب احمد کو داخل ہوتے دیکھا، کاٹان بھی شاید اسی وقت باہر سے آیا

نہ اور ان کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں چلا آیا تھا۔

عفت نے شہاب احمد کے چہرے کو کانوں کی لوؤں تک سرخ ہوتے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

دیرِ قالین پر بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے وہ قریب آگئے۔ ڈیشیاں کی ان کی پشت تھی عفت کی حالت دیکھ کر وہ اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ اسے اپنے ارد گرد دکھ موش نہیں تھا۔ عفت کو ایک بازو کا سہارا دیتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے وہ اس کے پسینے میں تر ہوتے ہوئے بالوں کو چھچھے سمیٹ رہا تھا۔

اور ابھی شہاب احمد گرج پڑے۔

برس پڑے۔

”اس بے غیرتی اور بے حیائی کو کیا کول عفت بیگم؟“

عفت کیا لولتی۔۔۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور حلق میں لٹنے پڑے ہوئے

تھے، اس نے بہت کوشش کی کہ کچھ کہہ سکے، کچھ بول سکے مگر۔۔۔۔۔

شہاب احمد کی آواز سن کر ڈیشیاں چونک کر پھلا۔

اس اچانک حادثے سے لے کر وہ تیار ہی نہیں تھا، وہ ایک سینکڑے تو کم سم

لا شہاب احمد کی صورت نگار با پھر اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر۔۔۔۔۔

شہاب احمد اس وقت کچھ سننے پر آمادہ کب تھے، وہ ایک دم سرخ پڑے۔

”تم۔۔۔ تم۔۔۔ جسے میں بہت بلند کردار سمجھتا تھا، تم ذلات کی انتہائی پستیوں

اگرے ہوتے ہو۔“

”آپ کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے،“ ڈیشیاں نے کہا۔

چھا گیا۔

ہوش آتے پر عفت نے اپنے آپ کو ہسپتال کے ایک کمرے میں پایادو ڈاکٹر اس پر بھکے ہوئے تھے۔ نرس اس کے پیروں کے قریب نکلے مندھڑی تھی۔ گھر کا کوئی فرد اس کے کمرے میں نہیں تھا۔ ایک ڈاکٹر باہر گیا تو چند منٹ بعد فرخ بھائی اماں کو سہارا دینے ہوئے دسبے قدموں سے اس کے پاس آئے۔ دوسرے ڈاکٹر نے فوراً انہیں تنبیہ کی۔

”دیکھئے آپ لوگ ان سے بات بالکل مت کیجئے گا۔ اور نہ ہی ان کے پاس کسی اور کو آنے دیجئے، ان کی عیادت کے لئے آنے والوں کو بھی کم سے کم ہفتہ بھر تک باہر ہی روکئے،“

پھر اس نے اپنے قریب کھڑی سسر سے کہا۔

”سسر! آپ سخت مگرافی کیجئے ان کی۔“

اماں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے مبرو صبط کی کوشش میں ان کا چہرہ سفید ہوا جا رہا تھا۔ اپنی بیٹی کی زندگی انہیں بہت عزیز تھی۔ وہ نہ ٹھک کر آنسو بہا سکتی تھیں نہ اسے اپنے سینے سے لپٹا کر روکتی تھیں۔ فرخ بھائی کا چہرہ سنا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنبھلتی گئی اور ایک روز وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آگئی۔ مگر — کون سا گھر؟

وہ گھر — جہاں اس کی تقدیر، وقت اور حالات نے آئے تھے۔ اس کا گھر تو نہیں تھا۔

وہ گھر تو برسوں پہلے اس کے لئے پرایا ہو گیا تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ برسوں پہلے وہ جس مقام سے چلی تھی آج پھر اسی

مقام پر آگئی تھی۔ بالکل تہی دامن اور خالی ہاتھ۔

اور پھر سب جان گئے کہ وہ اپنی پیشانی پر کون سا داغ لگا آئی ہے۔

اماں مارے دکھ کے بستر سے لگ گئیں، سعید باجی کو چپ سی لگ گئی۔ فرخ بھائی کی بیٹی نوشین اور بیٹی احمد کی ہنسی نہ جلنے لگا کھو گئی اور فرخ بھائی کی آنکھوں میں گہری چوچیں اُتر آئیں۔ سب کے چہروں پر نگاہ پڑتی تو عفت فرط کرب سے آنکھیں بند کر لیتی اور پوچھتی۔ خداوند! اپنی زندگی کے اس انجام کے بارے میں تو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

عمر کی یہ منزل اور ذلت و رسوائی کا انا بد نما داغ۔

یہ سب کچھ اگر بہت برسوں پہلے ہوا ہوتا تو شاید اتنا زیادہ تکلیف دہ نہ ہوتا مگر

میرے سر میں پچھتے ہوئے یہ ڈھیر سارے سفید بال، اس مقدس سفیدی کی ہی لاج رکھ لیتا تو یا پھر اس گھر میں آنے سے پہلے ہی تو مجھے دنیلا سے اٹھا لیتا۔

وہ تو برسوں سے اپنے گھر میں سلگتی ہوئی چمکاریوں میں اندر ہی اندر جل رہی تھی۔ بڑی خاموشی سے۔ بہت چپ چاپ کوئی نہیں جانتا تھا کہ شباب احمد کی بے اعتنائیوں نے اسے جیتے جی مار کھا تھا۔

اس نے تو گھر کی بات گھر ہی میں رکھنے کی خاطر چہرے پر بھٹی مسروں اور مسکراہٹوں کے لئے دیز پر دے ڈال رکھے تھے کہ کوئی غوس ہی نہ کر سکا۔ وہ کس طرح قطرہ قطرہ زہر اپنے حلق میں انڈیل رہی تھی۔

دینا والوں کے لئے تو یہ سب کچھ بالکل اچانک ہوا تھا، سب حیران تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ اور کیوں ہو گیا؟ ہر شخص کی سوالیہ نگاہیں اس کی طرف تھیں اماں اس کے پاس آئیں اور خاموش بیٹھ کر چلی جاتیں مگر ان کی آنکھوں سے بھانکتے وہ سوال — آخر ایک

روز وہ کیسے بغیر نہ رہ سکیں —

”تم نے تو کبھی کچھ بتایا ہی نہیں عفت!“

عفت اپنی آنکھوں میں امنڈ آنے والے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”آمال! آپ نے کتنا غنا بنا کر کل کلاں تم پر کوئی اختیار ٹوٹے تو ہمارے پاس نہ آنا اپنے

دکھڑے رونے کے لئے“

آمال کے جھڑپوں بھرے چہرے پر شرمساری کے آثار تھے۔

عفت نے کہا۔

”میں اپنے دکھڑے رونے آپ کے پاس کبھی نہیں آئی آمال! کبھی نہیں آئی مگر یہ جو کچھ

ہو گیا۔ اس کو چھپانا میرے اختیار میں نہیں تھا آمال آپ یقین کیجئے، میں بہت بے بس ہو گئی تھی،“

آمال دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر روتے لگیں۔

نہ ہمت بھابھی نے ایک روز اس سے کہا۔

”میرے ذیشان بھیا کی چاہت تم تھیں عفت! وہ تم تھیں، تم دونوں کتنے گہرے ہو؟“

ان کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسوؤں پر پھسل پڑے عفت نے سوچا۔

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ نہ ہمت بھابھی بھی شہاب احمد کی طرح کسی غلط فہمی کا شکار

ہوں۔ یہ تو پس ہے کہ ذیشان نے مجھے چاہا لیکن میں تو شہاب احمد.....

اس نے نہ ہمت بھابھی سے کہا۔

”بھابھی! مگر اس چاہت کو آپ کی طرف ہی سمجھئے، خدا را! آپ کس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں“

”میں جانتی ہوں عفت! میں جانتی ہوں، اگر یہ چاہت کی طرف نہ ہوتی تو آج میرے بھیا کی

زندگی اتنی ویران کیوں ہوتی؟ لیکن میں پھر بھی الزام تمہیں نہیں دوں گی، یہ سب تو قسمت کے

کھیل ہیں“ نہ ہمت بھابھی اٹھ کر چلی گئیں۔

مہرین، ہر روز اختر، بڑی آپا، توسلیف بھائی، پھوٹی آپا، یاسر بھائی اور ان سب کے

پچھے تیراں تھے۔ ذیشان کے باسے میں تو کسی کو بھی خبر نہیں تھی اور شاید ان میں سے کسی کو بھی

خبر نہ ہوتی اگر شہاب احمد محنت پر یہ نہ ہمت نہ دھرتے، اس کی پیشانی پر رسوائی کا پردہ داغ نہ لگتے۔

جس دامن کو تمہنتوں، رسوائیوں کے بدنامہ دامنوں سے پچلنے کی خاطر ایک بیٹی، ایک بیوی

اور ایک مال نے تمام عمر اس قدر چھونک چھونک کر قدم رکھے، وہی دامن داغدار ہو گیا۔

اور آج — جب اوس میں بھیگی رات کے خاموش لمحوں میں۔ چاند میرے گھر کے انگوٹ

میں اتر آیا ہے تو اپنی زندگی کے لمحے کی داستان مجھے پھر یاد آگئی ہے۔

ایک کہانی ختم ہو چکی ہے۔

ایک افسانہ تمام ہو چکا۔

وقت پیچھے سر کر کر دھندلوں میں گم ہو چکا ہے لیکن یادیں۔

وہ آج بھی رخ سے نقاب اٹھائے میرا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔

زندگی کے اس تیرہ و تار اندھیرے میں کچھ پنہ نہیں چلتا۔

کب سحر ہوتی؟

کب شب گزر گئی۔

ستارے بھی بھبلاتے ہیں، چراغ بھی ٹٹماتے ہیں اور چاند بھی جھگڑتا ہے۔ پیلا، گول،

بڑا سا چاند کسی چوڑی کی طرح ٹوٹا ہوا ایک، مدہم سا چاند۔ مگر۔ روشنی پھر بھی نظر نہیں آتی۔

ستاروں کی شاہراہ پر بھی مجھے ایک گلیبھرس کی خاموشی اور مدہم سی تاریکی نظر آتی ہے۔

وقت کے ساتھ سارے طوفان گزر گئے۔

مرا تسو ہیں نہ مسکراہٹیں۔

مرا زونوئیں ہیں نہ انگلیں

زندگی — میری زندگی کیا ہے؟

کچھ بھی تو نہیں — بس ایک سلسلہ یادوں کا۔

ایک سلسلہ خوابوں کا

میں نے اپنے آپ کو کھوکھلا کیا یا؟

کچھ بھی تو نہیں —

گھر نہیں، شوہر نہیں، اولاد نہیں

خدا یا! دوسروں کی خاطر زندہ رہنے کی توانی کڑی سزا دیتا ہے؟

دوسروں کے سکھ جان کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دینے کا تو یہ صلہ دیتا ہے؟

اپنی زندگی کا یہ انجام دیکھ کر میری روح آنکھوں میں کھینچی آتی ہے۔

آج جب میرے سارے جذبات و احساسات وقت کی پیشانی پر ٹپکنے ہوئی ایک سرد بوند

کی مانند منجمد ہو چکے ہیں تو میں سوچ رہی ہوں —

میں بھی کتنی نادان تھی؟ کتنی پاگل؟

مٹی کے کمرے رکھو لوں گا کہیں کیا سمجھ بیٹھی تھی؟

ایشیاء خلوص، وفا — یہ سب مٹی کے کمرے رکھو نے ہی تو ہیں۔

ان کی اہمیت ہی کیا ہے؟

کس قدر آسانی سے ٹوٹ جاتے ہیں یہ کھلوئے؟

پھر زندگی کیا رہ جاتی ہے؟

کچھ بھی تو نہیں —

بس! جیسے پتھروں کا ایک ڈھیر ہو

جیسے ایک ویران کھنڈر ہو

اب — جب کہ سب کچھ ختم ہو چکا تو میرا دل چاہتا ہے کہ پیچھے پیچھے کر سدی دنیا

لیڑ لڑکیوں سے کہہ دوں کہ دیکھو — تم کبھی یہ نہ کرنا جو میں نے کیا — تم کبھی اپنے دل کے

دروازوں اور درجوں کو بند کر کے کسی کی چاہت کو، کسی کی سچی محبت کو مت ٹھکرا کر نام صرف یہ

سوچ کر کہ عزت پر ہوا اجنباب کیا کہیں گے؟ فلاں شخص کیا سوچے گا؟ فلاں شخص نام رکھے گا؟

آج میرا دل چاہتا ہے کہ میں پیچھے پیچھے کر ساری دنیا کی عورتوں سے کہہ دوں کہ تم کبھی اپنی

بت کا بھرم رکھنے کی خاطر اپنے ہی لبوں کو اپنی نر یا دونوں کے آگے دیوار نہ بنانا۔

بے زبانی اور خاموشی کا انجام کبھی کبھی بڑا حسرت ناک اور بت اذیت ناک ہوتا ہے۔

ہم عورتیں تو گھر کی بات گھر ہی میں رکھنے کی خاطر اپنی گھر بیرون زندگی کو پردہ در پردہ

چھپاتی چلی جاتی ہیں۔

اور مرد — اپنی زبان سے ایک لفظ — بس صرف ایک لفظ نکال کر ساری

بائیں مشتمل کر دیتا ہے۔

دنیا بھر کی نگاہوں میں عورت کو ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔

ایشیاء خلوص، وفا — سارے جذبات و احساسات مرد کی ایک ٹھوک سے تھنس

س ہوتے جلتے ہیں۔

میرے آنکھوں نے دیکھا ہے ان جذبات و احساسات کا حسرت ناک انجام۔

میں نے دیکھا ہے اس عمارت کو منہدم ہوتے ہوتے۔

یہ زندگی — ازدواجی زندگی — ایک عمارت ہی تو ہے۔

ایسی عمارت — جس کا کوئی ستون نہیں ہوتا۔

وہ تو بس عورت کی قوتِ برداشت کے سہارے کھڑی رہتی ہے۔

عورت کی قوتِ برداشت میں ذرا سی مکروری آئی اور عمارت ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔

اس کے لئے وقت اور عمر کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کوئی قید نہیں ہوتی۔

زندگی کا یہ المناک حادثہ اس وقت بھی ہو سکتا ہے جب بالوں میں ان گنت پلمندی

کے تار چمکنے لگیں۔

پھر باقی تو کچھ نہیں بچتا — سوائے یادوں کے۔

اور یادیں بھی کون سی؟

وہ — جن کا زہر آنکھوں سے رگ و پے میں اتر جاتا ہے۔

مگر میں سوچتی ہوں — میری زندگی کی یہ عمارت کیوں مہدم ہو گئی؟ میری قوتِ

برداشت نے بھی جواب نہیں دیا تھا۔

میری زندگی تو شاید میری بے زبانیوں کی نذر ہو گئی۔

میری بے زبانی —

میرا اپنا خون — میرا اپنا بیٹیا یہ تمہمت لگا گیا — جتنی آوارہ ہو گئی ہیں — خدایا!

یہ کیسا انصاف ہے تیرا؟

یا تو اس گھڑی سے پہلے تو نے میرے نفس کے تار توڑ دیئے ہوتے۔

یا پھر میرے ڈوبتے ہوئے اتنی سی محبت دی ہوتی کہ میں اپنی بے گناہی کے ثبوت

میں تیری ہی قسم کھا کر اسے یقین دلا سکتی، اس سے کہہ سکتی — یہ جھوٹ ہے کا نشان

اپنی ماں پر اتنی بڑی تمہمت نہ لگاؤ۔

خداوند! تو بے نیاز بننا سب کچھ دیکھنا رہا!

تو سب کچھ سنتا رہا!

اور شہاب احمد! آپ سے میں کیا کہوں؟

کہاں گئے آپ کے وہ وعدے —؟

”زندگی میں اب کسی چیز کی کمی نہیں محسوس ہوتی عفت!“

”میرے پیار کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوگا“

”تم نے مجھے اپنا کر ہوتا بڑا احسان کیا ہے میرے اوپر ورنہ — ورنہ جانے کیا

ہو جاتا عفت! جانے کیا ہوتا؟“

یہ سب کچھ آپ ہی نے تو کہا تھا پھر اس خزانے سے مجھے اتنی تعزیتیں کیوں ملیں؟

اگر میں نے سچ سچ آپ پر احسان کیا تھا تو اس احسان کے بدلے میں آپ نے مجھے اتنی

تلخیوں، اتنے دکھ درد کیوں دے دیئے؟

مجھے زندگی سے اتنا سزا کیوں کر دیا کہ —

اب جو یہ بچی کچی سانسیں رہ گئی ہیں یہ بھی مجھ پر گرداں بار ہیں۔

کتنا انتظار ہے۔ مجھے سانس کی ڈوری ٹوٹنے کا۔

سنسنا برآمدے میں بند دروازوں اور دیرپچوں کے قریب افسردہ غبار اڑتا ہے تو

میں سوچتی ہوں کہ وقتِ رخصت قریب ہے شاید!

ہوائیں درخوش کی شاتوں پر سر ٹوٹتی ہیں، درود یوار سے ٹکراتی ہیں تو میں سوچتی ہوں

کہ شاید اب جو میں نے یہ سانس لیا ہے یہ آخری ہے۔

مگر انتظار کی گھڑیاں کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتیں۔

نفس کے تار کسی طرح ٹوٹتے ہی نہیں۔

زندگی کی ان خاردار راہوں پر چلتے چلتے اب تو میں آلبہ پا ہو چکی ہوں۔

اب اس سنگِ گدراں کا بوجھ اٹھانے کا ذرا بھی حوصلہ نہیں بچھیں۔

اوس میں بھیگی ہوئی راتوں میں — جب چاند اس گھر کے آنگن میں اتر آتا ہے

تو یادوں کے ساتبان تلے بیٹھی انتظار ہی کرتی رہتی ہوں۔

مگر کوئی دستک، کوئی آواز نہیں آتی۔

میرے کان منتظر ہی رہتے ہیں۔ صدائے موت کو سننے کے لئے۔

لیکن شب گزر جاتی ہے۔

سحر ہو جاتی ہے۔

اور میں اذیت ناک لمحوں کے بھنور میں ڈولتی ہی رہتی ہوں۔